



You have either reached a page that is unavailable for viewing or reached your viewing limit for this book.



You have either reached a page that is unavailable for viewing or reached your viewing limit for this book.



You have either reached a page that is unavailable for viewing or reached your viewing limit for this book.

نائن الیون کے بعد طاغوتی طاقتوں کا اقوام متحدہ کی شکل میں حکومت و جال کا قیام
جدید سامراجی اصلاحات اور انسانی تاریخ میں جھوٹ اور سچ کی امیزش سے ظلم و
بربریت پر لکھی ہوئی شہرہ آفاق کتاب

دجّال

جلد دوم، سوم

مصنف

اسرار عالم

ادارہ تحقیقات

فسٹ فلور یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

فون: 03334380927

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کتاب	:	دجال
مصنف	:	اسرار عالم
مطبع	:	نواز پریس لاہور
اہتمام	:	ایم ایس حسین
اشاعت اول	:	2005ء
اشاعت دوم	:	2006ء
اشاعت سوئم	:	2007ء
ناشر	:	ادارہ تحقیقات لاہور 0334380927
قیمت	:	350/=

طیب لائبریری

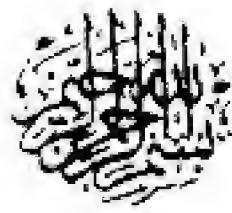
واحد تقسیم کار

5- یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون: 042-7241778 - 0333-4394686

فہرست

۵	پیش لفظ
۶	مقدمہ
۷	مرحلہ ہفتم : مرحلہ ابراہیمی
۷	میشاق ابراہیمی
۷	معمرہ خلافت کا تناظر
۱۱	معمرہ ارضی کی سعیتیں
۱۲	نبوت
۱۲	رسالت
۲۲	ختم نبوت
۲۴	معمرہ خلافت اور مناجح ابلیس
۲۴	منہج اول : منہج شک دم یعنی خوں ریزی
۳۰	منہج دوم : منہج فساد ملکوت
۳۴	سنت اللہ، سحر اور سائنس
۳۴	سنت اللہ
۷۲	سحر اور تحیر
۱۲۹	فساد قبل نوح
۱۵۲	منہج سوم : فساد ملکوت حکمی
۱۵۸	دور اول : حضرت ابراہیم علیہ السلام

۱۶۰	اقامت ایمان
۱۶۵	اقامت اعلاء کلمہ حق
۱۷۸	اقامت ہجرت
۱۸۰	اقامت مقام
۱۸۳	اقامت ذبح
۱۸۴	اقامت جہاد
۱۹۱	منہج چہارم: فساد ملک ارض یا فساد ملک
۱۹۵	اقامت ملک
۱۹۹	اقامت ذبح عظیم
۲۰۸	اقامت ختنہ
۲۱۱	اقامت صلوٰۃ یا اقامت ملک اللہ
۲۱۹	اقامت دین اللہ فی الارض
۲۲۱	اقامت بیت اللہ علی الارض
۲۲۳	اقامت حج، اقامت مناسک یا اقامت تکمیل صلوٰۃ
۲۲۸	ابلیس کا جوابی حملہ اور تدابیر ابراہیم
۲۳۱	دور دوم: حضرت یعقوب و حضرت یوسف علیہما السلام
۲۳۸	کنعان و مصر
۲۵۵	حواشی



پیش لفظ

حامداً و مصلیاً!

نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی امت بنی نوع انسان میں وہ آخری امت ہے جو منصب شہادت پر فائز کی گئی ہے۔ چنانچہ پوری انسانیت کی کامیابی کا انحصار اب اسی گروہ پر ہے۔ بیسویں صدی عیسوی کی آخری دہائی تک آتے آتے واضح طور پر محسوس ہونے لگا ہے کہ یہ امت تاریخ انسانی کے اس مرحلے میں داخل ہو چکی ہے جس کی خبر دیتے ہوئے آنحضور ﷺ نے فرمایا تھا: عنقریب تو میں تم پر ٹوٹ پڑنے کے لئے بلاوا دیں گی جیسے بھوکے (جانور) کھانے پر ٹوٹ پڑنے کے لئے بلاوا دیتے ہیں (ابو داؤد و بیہقی)

اس اندوہناک صورت حال سے زیادہ کرب کی بات یہ ہے کہ امت مسلمہ... جو دنیا کی وہ واحد گروہ ہے جسے ماضی، حال اور مستقبل کا کافی علم (ماکان و ماہوکان) دیا گیا... آج حیران اور ناواقف راہ بھٹک رہی ہے اور دنیا کی تاریکیوں سے روشنی کی بھیک مانگ رہی ہے۔ چودہ صدیوں بعد اب آثار قیامت کے ظاہر ہونے کی رفتار تیز ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے گویا کوئی ہارٹوٹ جائے اور یکے بعد دیگرے دانے گرنے لگیں۔

ان حالات کا تقاضا تھا کہ قرآن و احادیث مبارکہ کی روشنی میں امت کی صورت حال کا گہرائی سے جائزہ لیا جاتا، موجودہ حالات کی تبدیلی کو صحیح زاویہ سے دیکھا جاتا اور آئندہ کے لئے خطوط کار کی نشاندہی کی جاتی تاکہ یہ امت اپنے فرض منصبی کو مکمل حقہ سرانجام دے کر پوری انسانیت کو کامیابی سے ہمکنار کرے۔ چنانچہ انہیں امور کو پیش نظر رکھ کر یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف عناوین کے تحت بحث کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس میں برکت عطا فرمائے۔

اسرار عالم

انہ سمیع قریب مجیب

مقدمہ

دجال جلد اول کے مقدمہ میں تیزی سے رونما ہونے والے حوادث اور ان کے امت پر پڑنے والے اثرات کے پیش نظر اس عاجز نے اس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ شاید اس کی اگلی جلدیں جو ہر چند کہ عجائبات کی صورت میں ہی لکھی جا رہی ہیں پیش نہ کی جاسکیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل، اس کی نصرت اور توفیق کی ارزانی ہے کہ دجال جلد دوم امت کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ الحمد للہ علی ذلک۔

صورت حال ناگفتہ بہ حد تک نازک ہے۔ امت مسلمہ کو دجال کے ظہور کے تناظر میں نوع آدم کی طرف سے اہم ترین کردار ادا کرنا ہے۔ صورت حال کی نزاکت اور امت کی ذمہ داریاں اس بات کی متقاضی ہیں کہ اس کتاب کے محتویات سے امت کا ہر خاص و عام زیادہ سے زیادہ اور جلد از جلد واقف ہو جائے۔ لہذا امید کی جاتی ہے کہ قارئین حسب استطاعت ان سے امت کو باخبر کرنے کی سعی فرمائیں گے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر ہر جلد کے آخر میں پچھلی جلدوں کے محتویات کی فہرست شامل کی جا رہی ہے تاکہ کتاب کے مباحث ماسبق سے مربوط رہیں۔

اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس میں برکت عطا فرمائے۔

واللہ المستعان وعلیہ التکلان

اسرار عالم

مرحلہ ہفتم: مرحلہ ابراہیمی

میشاق ابراہیمی

حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں میں حضرت نوح علیہ السلام کے بعد آسمان آدمیت میں نمودار ہونے والے سب سے زیادہ روشن اور سب سے زیادہ ضوفشاں وہ کوکبہ جلال ہیں جن کی تابناکی نے پوری کائنات کو بقعہ نور بنا دیا۔ جاری معرکہ خیر و شر میں حق کی جانب سے آپ علیہ السلام نے ایک ایسا انقلاب برپا کر دیا جس کی توقع ابلیس نے خواب میں بھی نہیں کی ہوگی۔ یہ وہ انقلاب تھا جس سے ابلیس کی خواہشات کی دنیا ویران ہو گئی، اس کا خواب چکنا چور ہو گیا، اس کا مکر دھرا کا دھرا رہ گیا اور اس کی افواج جن و انس دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی اور اہل حضرت آدم کے اس جلیل القدر بیٹے نے ایک ایسے دور (Pincer Attack) کا آغاز کر دیا جس نے بالآخر ایک جانب حیثیت آدم کو ایسی ترقی دی جسے تاریخ آدمیت کی چوتھی عظیم جست (The Fourth Quantum Jump) قرار دیتی ہے تو دوسری جانب ابلیس کو معرکہ خیر و شر میں ایسی شکست سے ہم کنار کر دیا جو بالآخر اس کے لئے فیصلہ کن ہزیمت کا باعث بن جانے والی تھی۔

معرکہ خلافت کا تناظر

نوع آدم کے تناظر میں اللہ تعالیٰ اور ابلیس کے مابین معرکہ خیر و شر کا آغاز اسی لمحے ہو گیا جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو فانک من المنظرین (پس تم مہلت دیئے جانے والوں میں سے ہو) فرما کر گویا اجازت مرحمت فرمادی۔ ۱۔
مرحلہ اول: اس معرکہ خلافت یا معرکہ خیر و شر کا پہلا مرحلہ وہ تھا جب حضرت آدم تنہا آدم قدیم

کی طرح الجنہ میں مقیم تھے۔ اس مرحلے میں ابلیس انہیں کچھ بھی گزند پہنچانے میں ناکام رہا۔ غالب گمان یہی ہے کہ اس مرحلے میں بھی اس نے بھرپور کوششیں کی ہوں گی لیکن بفضلہ تعالیٰ حضرت آدم کے خلاف اس کے اقدامات بے اثر ثابت ہوئے۔ ۲

مرحلہ دوم: مرحلہ دوم کا آغاز اس گھڑی ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کے مخصوص منصوبے کے تحت حضرت آدم سے ان کا جوڑا حضرت حوا پیدا فرمایا۔ الجنہ کا یہ وہ مرحلہ ہے جب حضرات آدم و حوا پر ابلیس کی چالیں کارگر ہونا شروع ہوئیں۔ چنانچہ وہ آپ دونوں سے حکم الہی کی خلاف ورزی کروانے میں کامیاب ہو گیا اور اس طرح الجنہ میں پہلی بار فساد کا آغاز ہوا۔ اس کا خوفناک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ نوع آدم طبعی طور پر الجنہ میں سکونت پزیر رہنے اور روحانی طور پر حسب سابق مدارج خلافت میں ترقی کر کے مقام محمود تک پہنچنے کی اہلیت سے قاصر ہو گیا۔ بہر حال نوع آدم سے ایک عظیم خطا سرزد ہوئی تھی لیکن حضرات آدم و حوا اپنی اس خطا پر بلاتناخیر متنبہ ہوئے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کی جسے اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا۔ اس توبہ و انابت کے سبب ہر چند کہ آپ دونوں حضرات کی خطا معاف ہو گئی تھی لیکن اس خطا سے نوع آدم میں جسمانی و روحانی قصور و فساد کا آغاز ہو گیا جس نے مزید ایسی صورتیں پیدا کر دیں جو اس نوع کے انحطاط کا باعث ہوئیں۔ ابتداءً یہ قصور و فساد جسم و طبع میں پیدا ہوئے لہذا حضرات آدم و حوا الجنہ سے روئے ارض پر منتقل کر دیا گیا۔ یہ منتقلی روئے ارض پر دو اقسام کے قصور و فساد کی صورت میں متشکل ہو گئی:

(۱) روحانی قصور و فساد (Spiritual Deficiencies & Perversion)

(۲) جسمانی قصور و فساد (Physical Deficiencies & Perversion)

روحانی قصور و فساد کی بنیادی وجہ تھی نوع آدم کا اس روئے ارض پر اللہ تعالیٰ سے ویسا قرب و تعلق کا جاری نہ رہ پانا جیسا کہ الجنہ میں تھا۔ اور عام حالات میں ایسا جاری رہنا ممکن بھی نہیں تھا۔ اس لئے کہ الجنہ روئے ارض کے مقابلے میں مادی اعتبار سے لطیف تھی چنانچہ اس فضا میں حضرات آدم و حوا اللہ تعالیٰ سے روحانی طور پر بھی نسبتاً زیادہ قریب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خطا ہونے کے بعد وہ اتنی جلد متنبہ ہوئے اور تائب بھی ہوئے۔ زمین الجنہ کے مقابلے میں کثیف اور نتیجتاً روحانی طور پر دور ہے مزید ازیں یہاں الجنہ کے مقابلے میں لاکھوں گنا زیادہ ذیسنہ پائی جاتی ہے۔ چنانچہ چھوٹی چھوٹی خلاف ورزیوں اور گناہوں کی بات تو الگ رہی بڑے بڑے گناہوں پر بھی روئے زمین پر

صرف چند ہی انسان بروقت اور کماحقہ متنبہ ہو پاتے ہیں۔ لہذا بعد ازاں اس روئے زمین پر نوع آدم کی کثیر تعداد کا بحیثیت نوع عدم تنبیہ (Desensitization) مزید فساد و انحطاط طبعی و معنوی کا باعث ہوتا گیا۔

جسمانی و طبعی فساد کی بنیادی وجہ آدم و حوا کی خلقت، ساخت اور پھر اس کی جبلت میں ہونے والی وہ تبدیلی تھی جو اس خلاف ورزی کے نتیجے میں واقع ہوئی۔ جسے الجنہ کو اس تبدیلی کی داشت نہیں تھی۔ لہذا حضرات آدم و حوا کو ان کی خطا کے معاف ہو جانے کے باوجود زمین پر منتقل کر دیا گیا۔ یہ منتقلی نوع آدم میں مزید خرابیوں کا باعث ہوئی۔ ان خرابیوں کو تین شعبوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے:

(۱) شعبہ اول: جسمانی و طبعی خرابی۔ جس سے فساد جسم و طبع کا ظہور ہوا

(۲) شعبہ دوم: مسکنی و ماحولی خرابی۔ جس سے فساد مستقر و ماحول کا ظہور ہوا

(۳) شعبہ سوم: اعمالی خرابی۔ جس سے فساد عمل کا ظہور ہوا۔

جسمانی و طبعی خرابی سے مراد یہ ہے کہ حضرات آدم و حوا کے جسم الجنہ میں خطا سے قبل زیادہ لطیف پاکیزہ اور محفوظ تھے۔ خطا کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خرابی اور پھر اس زمین پر منتقل ہونے کے بعد یہاں کی فضا میں رہنے اور یہاں کی اشیاء سے استفادہ کرنے کے جب پیدا ہونے والی خرابی نے اس کے اندر جسمانی اور طبعی خرابیاں پیدا کر دی ہیں جس کی وجہ سے نوع آدم کا جسم اب اس حالت پر باقی نہیں جیسا کہ وہ الجنہ میں خطا سے قبل تھا۔

مسکنی و ماحولی خرابی سے مراد یہ ہے کہ زمین الجنہ کے مقابلے میں کثیف اشیاء سے بنی ہوئی ہے۔ یہاں کی زمین، اس کی پیداوار، اس کا ماحول کثیف اور فساد آلودہ ہے۔ اپنی کثافت کے علاوہ اس پر ان فسادات کے بھی اثرات ہیں جو ماقبل کی اور اب معدوم مخلوقات کی پیدا کردہ ہیں۔ چنانچہ یہ زمین اور اس کا ماحول نوع آدم کے لئے مزید خرابیوں کا باعث ہوئے۔ جیسے کسی صاف و شفاف اور طبعی طور پر محفوظ و مامون مقام سے ایک ایسی جگہ جو گندگی اور تعفن سے بھری ہو منتقلی کے سبب پڑنے والے اثرات ہوا کرتے ہیں۔

اعمالی خرابی سے مراد یہ ہے کہ الجنہ میں حضرات آدم و حوا پر تعبدی ذمہ داریاں بفضلہ تعالیٰ محض برائے نام تھیں جن کا ذکر تین عنوانات کے تحت کیا جاسکتا ہے:

- (۱) ایمان: جس میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اسکی حمد و ثنا اور پاکی بیان کرنا تھا ۵
 (۲) انفاق: جس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق الجنہ میں رہنا اور اس سے استفادہ کرنا تھا ۶
 (۳) منہیات: جس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق الجنہ میں ایک مخصوص چیز سے ہر قسم کے استفادے سے پرہیز کرنا تھا ۷

چنانچہ یہی وہ مختصر تعبدی ایمان و افعال تھے جن کا نوع آدم کو الجنہ میں مکلف بنایا گیا تھا ۸۔ الجنہ کے مقابلے میں زمین روحانی طور پر اللہ تعالیٰ سے جتنی دور اور محبوب اور مادی اور طبعی طور پر کثیف ہے اس طرح یہاں کی تعبدی ذمہ داریاں اس کی دوری، محبیت اور کثافت کے سبب وسیع، کثیر اور سخت ہیں۔ مثلاً اگر کل الجنہ میں آدم و حوا کو تین عنوانات کے تحت صرف تین کام کرنے ہوتے تھے تو اب اس روئے زمین پر نوع آدم کو انہیں تین عنوانات کے تحت تین کی جگہ تین لاکھ کام کرنے پڑتے ہیں۔ کہاں الجنہ کی لطیف، پاکیزہ اور محفوظ و مامون فضا میں تین کام اور کہاں زمین کی کثیف، آلودہ اور غیر محفوظ و غیر مامون فضا میں تین لاکھ کام۔ چنانچہ روئے ارض پر تعبدی ذمہ داریوں کی اس توسیع نے نوع آدم کو گویا لاکھوں گنا زیادہ فساد کے سامنے اور وہ بھی کھلے میدان میں لاکھڑا کیا ہے۔ ۹

حضرات آدم و حوا رب کائنات کا شاہ کار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنا خلیفہ بنایا تھا جس پر ابلیس کو سخت اعتراض تھا اور جس کی پاداش میں وہ راندہ درگاہ ہو چکا تھا۔ آج اسی راندہ درگاہ ابلیس نے انہیں لوگوں سے جو منصب خلافت پر فائز تھے خود ان کے ہی ہاتھوں سے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کروا ڈالی تھی۔ لیکن حضرات آدم و حوا کو فوراً سمجھ ہوا کہ ان جانے میں ان سے کتنی عظیم غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ اور اس غلطی کا منصوبہ ربانی پر اور خود ان کی ذات پر کیا نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرات آدم و حوا بلا تاخیر اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی غلطی پر تائب ہو گئے۔ حضرات آدم و حوا کا اپنی غلطی پر فوراً متنبہ ہونا اور اللہ تعالیٰ سے رجوع کرنا اور توبہ کرنا نوع آدم کی وہ پہلی عظیم جست (The First Quantum Jump) تھی جس نے نوع آدم کی اگلی تاریخ کا فیصلہ کر دیا۔

یہ عظیم جست بحالی حیثیت آدم کی جست تھی۔ توبہ و انابت کے اس عمل نے گناہ کے بعد آدم کی اپنی حیثیت کی بحالی میں انقلاب لا دیا۔ بعد کے سارے کارنامے اور حیثیت آدم کی

بحالی کی ساری کوششیں اسی کے لٹن سے نکلی ہیں۔ اس جست نے اس بات کا فیصلہ کر دیا کہ دھوکا دیکر آدم سے حکم خداوندی کی خلاف ورزی تو کروائی جاسکتی ہے لیکن اسے بحیثیت نوع اللہ کا باغی بنا کر منصب خلافت سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن کا ارشاد ہے: **فَتَلَقَىٰ آدَمَ مِنْ رَبِّهِ** کلمات فتاب علیہ (البقرہ: ۳۷)

ترجمہ: پھر سیکھ لی آدم نے اپنے رب سے چند باتیں پھر متوجہ ہو گیا اللہ اس پر۔

حضرات آدم و حوا کی توبہ و انابت الی اللہ کے اس عمل نے تعمیر و تشکیل نو کا پہلا پتھر رکھا جس نے بعد میں منصوبہ ربانی کی تکمیل میں نئے برگ و بار لائے۔ فرض کیا جائے کہ اگر حضرات آدم و حوا نے توبہ نہ کی ہوتی تو کیا ہوتا؟

میں ممکن تھا کہ اب تک چلی آرہی سنت اللہ کے مطابق اللہ تعالیٰ سابقہ مخلوقات اور بالخصوص سابقہ مختار مخلوقات کی طرح نوع آدم کو بھی ختم کر دینے اور اس کی جگہ کسی نئی مخلوق کے پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیتا۔ اس صورت میں آدم کا مقدر جہنم میں جلا ہوتا جس طرح اس سے قبل بیشتر ابناء نار کا وجود ختم کر دیا گیا اور چونکہ اللہ کی رضا کی تکمیل ہونی ضروری تھی لہذا کوئی دوسری مخلوق پیدا ہوتی جو اس منصوبہ ربانی کو پورا کرتی۔ ایک حدیث سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ عالم امر میں اس امکان کا ظہور ہوا لیکن عالم خلق میں اس کا ظہور صورت موجودہ میں موقوف اور ارادہ الہی پر منحصر ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ممکن ہے یہ مخلوق اسی الجنہ میں جہاں حضرات آدم و حوا پیدا ہو کر رکھے گئے تھے پیدا کی جاتی اور وہ عین ارادہ الہی کے تحت وہ سب کچھ انجام دے سکتی جس کا حکم باری تعالیٰ کرتا اور ان سب سے پرہیز کرتی جس سے منع کیا جاتا اور اس طرح الجنہ سے وہ ترقی کر کے جنت الفردوس میں ارتباب ہو جاتی۔

لیکن چونکہ حضرات آدم و حوا نے فوراً متنبہ ہو کر توبہ کی جسے اللہ رب العزت نے قبول فرمایا۔ الحمد للہ علی ذلک۔ مغفرت و قبولیت کا یہی وہ واقعہ ہے جس کے بعد نوع آدم نہ وجوداً ختم کیا گیا اور نہ الجنہ سے معسوب کر کے سیدھے جہنم رسید کیا گیا۔ بلکہ الجنہ کے مقابلے میں کمتر سہولتوں کے ساتھ ہی سہی برسر کار اور منصب خلافت پر اصولاً اور حکماً برقرار رکھے جاتے ہوئے زمین پر موقع زیست سے فیض یاب ہوئی۔ یہ زمین الجنہ سے بری اور جہنم سے بہتر ہے۔ اس طرح حضرات آدم و حوا کی توبہ نے نوع آدم کو تین عظیم عنایات سے سرفراز فرمایا:

(۱) بقاء وجود

(۲) منصب خلافت پر برقراری

(۳) جہد کے لئے عرصہ اور محل کی فراہمی

ہر چند کہ حضرات آدم و حوا کو ان کے اندر پیدا ہونے والی خرابیوں کے سبب زمین پر منتقل کر دیا گیا لیکن ان کی اثابت کی وجہ سے بلکہ اس اثابت سے خوش ہو کر اللہ کی رضا اور پسند یہ ظاہر ہوئی کہ آدم اپنی موجودہ صورت حال سے نکل آئے اور صرف یہی نہیں کہ گناہ سے قبل کی حالت الجنہ پر بحال ہو جائے بلکہ اس سے آگے ترقی کرتے ہوئے ان مقامات تک پہنچے جو اللہ کی رضا اور علم میں مقدر ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فتلیٰ آدم من ربہ کلمات کی عنایت کے بعد دوسری عظیم الشان عنایت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فاما یا تینکم منی ہدی فمن تبع ہدای فلا خوف علیہم ولا هم یحزنون (البقرہ ۳۸)

ترجمہ: پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تمہارے پاس، تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لئے نہ خوف ہوگا ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اہل علم واقف ہیں کہ جہاں ”فاما یا تینکم منی ہدی“ اس عظیم الشان مدد کا اعلان ہے جسے ”اقامت رسالت“ کہتے ہیں وہیں ”فلا خوف علیہم ولا هم یحزنون“ اس وعدہ فضل کا اعلان ہے جسے ”مقدمہ صدق“ کہتے ہیں اور جس کی انتہا یا نقطہ کمال مقام محمود ہے۔ لیکن اس سے آگے بڑھ جو بات یہاں تقریباً واضح طور پر کہہ دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ آدم اس مقام تک پہنچے چنانچہ آدم بھی ایفاء عہد کرتے ہوئے ارتقاء و ارتقاء کی اس راہ پر آگے بڑھے اور پہلے اپنی حیثیت سابق کی بحالی اور پھر ارتقاء کو پایہ تکمیل تک پہنچائے۔

چنانچہ بعد کی تاریخ نے ثابت کر دیا کہ آدم کی نسل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت سے قبل دو مزید عظیم جست (Quantum Jump) لگانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ بحمد اللہ ان میں ہر جست نے آدم کی روحانی اور جسمانی حیثیت کو اونچا اٹھایا اور ابلیس کو کمزور تر کیا۔ ہر جست کے بعد آدم قوی تر ہوئے اور ابلیس کمزور تر۔ آدم کے قوی تر ہونے سے مراد ہے ان کی حیثیت کا حالت ارضی سے ترقی کرنا اور حالت الجنہ سے قریب تر ہونا جانا اور ابلیس کے کمزور تر

ہونے سے مراد ہے اپنے دعوے کے اعتبار سے اس کی زمینی یا واقعاتی صورتحال (Ground Realities) کا کمزور تر ہوتا جانا۔

معرکہ ارضی کی سعیتیں

روئے ارض پر آدم کو ہدی کے دیئے جانے کا ایک پہلو تو وہی ہے جس کا ابھی ابھی ذکر ہوا یعنی اللہ کا فضل خاص۔ لیکن اس کا ایک اور پہلو بھی ہو سکتا ہے جس کا براہ راست تعلق ابلیس کے منصوبے سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ابلیس کے دل کے حال سے واقف ہے کہ اس نے روئے زمین پر کس طرح آدم کو زیر کرنے اور تباہ و برباد کرنے کا منصوبہ بنایا ہے تاکہ منصوبہ و منشاء ربانی کو ناکام کر دے۔ عین ممکن ہے کہ ہدی کا یہ وعدہ اس تناظر میں بھی ہو چنانچہ روئے ارض پر ہدی کے دیئے جانے کے دو ہی مقاصد ہو سکتے ہیں۔

(۱) بحالی حیثیت آدم

(۲) حصول مقام محمود

ان میں سے اول الذکر کا تعلق مابعد گناہ کی حیثیت سے ترقی کر کے اور پیدا ہونے والے نقص و قصور کا ازالہ کر کے اس حیثیت کو بحال کرنے سے ہے جو الجنہ میں پہلے تھی۔ ثانی الذکر کا تعلق الجنہ کی قبل گناہ کی حیثیت سے آگے ترقی کر کے مقام محمود تک پہنچنے سے ہے۔ اور یہ دونوں مقاصد دراصل منصوبہ ربانی ہیں بلکہ اس سے آگے جا کر اگر کہا جائے تو زیادہ درست ہوگا کہ ہدی کے یہ دونوں مقاصد دراصل رضا ربانی ہیں۔

چنانچہ روئے ارض پر اس ہدی کا ظہور تین صورتوں میں ہوا۔ جن کی کل ملا کر چار سعیتیں ہیں۔ ہدی کے ظہور کی تین مذکورہ صورتیں درج ذیل ہیں:

(۱) نبوت

(۲) رسالت

(۳) ختم نبوت

نبوت : نبوت روئے ارض پر وہ بنیادی اور اصلی سطح ہے جس پر اور جس کے توسط سے ہدی کا ظہور ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اور نوع آدم کے مابین ہدی کے لئے نبوت واحد اور اصلی و بنیادی

واسطہ ہے۔ اس کے حامل کو نبی کہتے ہیں۔ انبیاء کی متعدد حیثیتیں بھی ہو سکتی ہیں مثلاً صاحب کتاب، صاحب الواح، صاحب صحیفہ، صاحب حق، صاحب دین، صاحب شرع یا صرف نبی۔ جو حضرات صرف نبی ہیں ان کی بھی کئی حیثیتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً حضرت نوح کی پیدائش کے وقت حضرت ادریس کی حیثیت، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے عہد بعثت میں حضرت الیاس کی حیثیت اور اسی طرح آج ظہور دجال سے قبل حضرت ادریس، حضرت الیاس اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہم السلام کی حیثیت۔

رسالت : رسالت وہ دوسری سمت ہے جس کا عرض کسی نبی پر ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر رسول لازمًا نبی بھی ہوتا ہے جب کہ ہر نبی ضروری نہیں کہ رسول بھی ہو۔ جو امر رسول کو نبی سے ممتاز کرتا ہے وہ اس کی تین سمتیں ہیں۔

(۱) اظہار

(۲) ہدٰی

(۳) سنت

اظہار : رسالت کی پہلی سمت اظہار ہے۔ اظہار سے مراد ہے نمایاں کرنا چنانچہ اظہار سے مراد رونے ارض پر رضا اہی کے صحن مطابق منصوبہ ربانی کی تکمیل ہے جس کے اندر اظہار اور غلبہ کے سارے مظاہر شامل ہوتے ہیں۔ یہی وہ مفہوم ہے جو قرآن اور احادیث مبارکہ سے سامنے آتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے:

(۱) هُوَ الَّذِي ارْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَ عَلٰى الدِّيْنِ كُلِّهِ (التوبہ ۳۳-۳۴) (الف ۲۸ اور القف ۹)

ترجمہ: اسی نے بھیجا اپنے رسول کو ہدٰی اور دین حق دے کر تاکہ اس کو ظاہر کر دے پورے دین پر

(۲) فَاٰیْدُنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاصْبِرْ اَوْ ظَاهِرِیْنَ (القف ۱۴)

ترجمہ: پھر قوت دی ہم نے ان کو جو ایمان لائے تھے ان کے دشمنوں پر پھر ہو رہے ظاہر۔

(۳) حَتّٰی جَاءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كَارِهُوْنَ (التوبہ ۲۸)

ترجمہ: یہاں تک کہ آپہنچا حق اور ظاہر ہوا اللہ کا امر اور وہ ناخوش ہی رہے۔

یہی مفہوم احادیث میں لیا گیا ہے:

لا تزال طائفة من امتی یقاتلون علی الحق ظاہرین علی من ناواہم یقاتل
آخرہم المسیح الدجال (ابوداؤد)

ترجمہ: میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قتال کرے گا جو ان سے دشمنی کریں گے ان پر غلبہ
پائے گا یہاں تک کہ وہ گروہ جو مسیح دجال سے قتال کرے گا۔

اس طرح اظہار کا مفہوم قرآن کے مطابق کائنات میں اللہ تعالیٰ کے منصوبے کو اس کی
مرضی اور منشاء کے عین مطابق مرحلہ جاتی یا کلی طور پر پورا کرنا ہے۔ چنانچہ اظہار عمل بھی ہے اور عمل
کا نتیجہ بھی۔

اس طرح یوں تو ہر نبی بلکہ جمیع نسل آدم اظہار کے لئے من اللہ مکلف ہے لیکن نبی
اظہار کے لئے مبعوث نہیں کیا جاتا جبکہ کسی رسول کی بعثت کے لوازم میں سے ایک چیز اظہار
ہے۔ اسی اظہار کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ”یشاق“ (سورہ الاحزاب آیت ۷) کہا ہے۔

(ان شاء اللہ یشاق پر تفصیلی بحث عنقریب آئے گی)۔ بلاشبہ انبیاء حتیٰ کہ امتی بھی اپنے رسول
کے تعلق سے سب سے پہلے اظہار میں شامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اظہار کیا ہے اور یہ کہ کس نے کس طرح
اظہار کیا اس کا اندازہ لگانے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ کائنات کی تخلیق، آدم کو خلافت دیئے
جانے، روئے ارض پر نسل آدم کو بسانے اور اس کے اندر رسالت کا سلسلہ جاری کرنے کے پیچھے
در اصل اللہ تعالیٰ کا کون سا منصوبہ کار فرما ہے؟ وہ منصوبہ مرحلہ بہ مرحلہ اور کلی طور پر کیا ہے؟ چنانچہ
جب تک یہ نہ جان لیا جائے کہ وہ منصوبہ ربانی کیا ہے اس کا اندازہ کرنا آسان نہ ہوگا کہ کس
طرح کسی ذات رسالت مآب نے یا کسی امت نے اظہار کیا اور یہ کہ اس اظہار نے بحیثیت مجموعی
پورے منصوبہ ربانی کی تکمیل میں کیا کردار ادا کیا ہے؟ چنانچہ ہجرت سے قبل اساطین قریش کی
جانب سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بادشاہی کی پیش کش اور آپ کا اسے پائے حقارت سے
ٹھکرا دینا اور بظاہر تبلیغ و فحاذہ دین کی راہ کو مسدود کر دینا اظہار تھا تو دوسری جانب حجۃ الوداع میں
اسی قوت نافذہ کا اظہار کرتے ہوئے سارے عرب کے خون اور سود کو پاؤں سے روند ڈالنے کا
اعلان کرنا بھی اظہار تھا۔ اظہار کی کتب کا سمجھ میں آتا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ یہ نہ معلوم
ہو جائے کہ اللہ کا منصوبہ اس مرحلہ خاص میں کیا ہے اور اس کی تکمیل کس طرح ہونی ہے؟

ہدی: رسالت کی دوسری سمت ہدی ہے۔ قرآن میں ہدی متعدد مفہام میں بیان کیا گیا ہے

لیکن وہ ہدی جو رسالت کی مخصوص سعت ہے دیگر مقامات کے علاوہ نہایت واضح طور پر تین جگہ بیان کیا گیا ہے یعنی سورہ توبہ، سورہ فتح اور سورہ صف میں۔

ہدی سے مراد ہے کائنات کے تعلق سے بحیثیت مجموعی یا اس کے کسی مرحلے کے لئے ربانی منصوبہ اور اس منصوبہ کی تعمیل و تکمیل کا ربانی خطہ جسے (Blueprint of Planning or Operational Blueprint) بھی کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ کسی بھی مہم کو سر کرنے کے لئے ایک خاکہ اور خطہ تیار کیا جاتا ہے خواہ فوج کو کسی جگہ قبضہ کرنے کے لئے ہو یا پولس کو کسی گروہ کے قلع قمع کرنے کے لئے۔ بعض اوقات مہم کی سنگینی اور مختلف مرحلوں کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ایسا بھی ہوتا ہے کہ اصل خطہ صیغہ راز میں بلکہ انتہائی صیغہ راز میں رکھا جاتا ہے اور صرف چند ہی لوگ ہوتے ہیں جن کو اصل خطے کا علم ہوتا ہے۔ بعینہ روئے ارض پر منصوبہ ربانی کی تکمیل کا بھی ایک خطہ ہے جس کے Outlines اور Salient Features سے گویا ہر نبی آگاہ ہوتا ہے لیکن اس کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ رسول مبعوث فرماتا ہے جو اس مرحلے کے خطہ سے جس سے اس کا تعلق ہوتا ہے پوری طرح آگاہ ہوتا ہے اور وہ رسول اس خطہ کو پائے تکمیل تک پہنچانے کے لئے ہی مامور ہوتا ہے۔ ظاہر ہے خاتم النبیین وہ ذات گرامی ہے جو کل منصوبہ ربانی اور اس کے خطے سے آگاہ ہوتی ہے اس لئے کہ اسی کے ہاتھوں اس خطہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ چنانچہ درج ذیل دو حدیثیں اس حقیقت کا اظہار کر رہی ہیں:

(۱) عن ابی ہریرہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثلی ومثل الانبیاء کمثل قصر احسن بنیانہ لربک منہ موضع لبنة فطاف به النظر یتعجبون من حسن بنیانہ الاموضع تلک اللبنة فکنت اناسدت موضع اللبنة ختم بی البنیان وختم بی الرسل وفي رواية فانما اللبنة وانا خاتم النبیین (متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ کتاب الفتن)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اور دوسرے انبیاء کی مثال ایک بہترین تعمیر شدہ محل کی ہے جس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔ دیکھنے والے اس کے گرد گھومتے اور اس کے حسن تعمیر پر تعجب کرتے سوائے اس اینٹ کی جگہ کے۔ وہ میں ہوں جس نے اس اینٹ کی جگہ پر کردی ہے۔ مجھ پر عمارت مکمل ہو گئی

ہے اور رسول پورے ہو گئے۔ دوسری روایت میں ہے کہ وہ اینٹ میں ہوں اور میں سب نبیوں میں آخر ہوں۔

(۲) وعن جابر قال جاء ت ملائكة الى النبي صلى الله عليه وسلم وهو نائم فقالوا ان لصاحبكم هذا مثلاً فاضربوا له مثلاً. قال بعضهم انه نائم وقال بعضهم ان العين نائمة والقلب يقظان فقالوا مثله كمثل رجل بنى داراً وجعل منها مادبه وبعث داعياً فمن اجاب الداعي دخل الدار واكل من المادبة ومن لم يجيب الداعي لم يدخل الدار ولم ياكل من المادبة فقالوا اولو حاله يفقهها قال بعضهم انه نائم قال بعضهم ان العين نائمة والقلب يقظان فقالوا الدار الجنة والداعي محمد فمن اطاع محمداً فقد اطاع الله ومن عصى محمداً فقد عصى الله ومحمد فرق بين الناس (رواه البخاری)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما رہے تھے تو کچھ فرشتے آپ کے پاس آئے تو یہ آپس میں کہنے لگے تمہارے لئے اس معزز شخصیت کی ذات ایک مثال ہے اس کو بیان کرو۔ ان میں سے بعض نے کہا آپ سو رہے ہیں۔ تو بعض نے کہا بیشک آنکھ سو رہی ہے لیکن قلب جاگ رہا ہے۔ تب فرشتوں نے کہا کہ آپ کی مثل ایسی ہے کہ ایک آدمی نے مکان بنوایا اور اس میں کھانا چن دیا اور لوگوں کو بلانے کے لئے بھیجا۔ چنانچہ جس نے بلانے والے کی بات مانی وہ گھر میں داخل ہوا اور اس نے کھانا کھایا۔ اور جس نے بلانے والے کی بات نہ مانی وہ نہ آیا نہ اس نے کھانا کھایا۔ فرشتوں نے کہا اس بات کی وضاحت کریں تو یہ آپس میں کہنے لگے آپ تو سوئے ہوئے ہیں تو بعض نے کہا آپ کی آنکھیں سو رہی ہیں لیکن قلب جاگ رہا ہے۔ تب فرشتوں نے آپس میں کہا کہ گھر سے مراد جنت ہے اور بلانے والے سے مراد محمد ہیں۔ چنانچہ جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پورے (بنی نوع انسان کے مابین) حق و باطل کا فرق کرنے والے ہیں۔

قرآن میں غور و فکر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سارے انبیاء و رسل اللہ تعالیٰ کے اس منصوبہ کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوتے رہے اور ان میں منصوبہ کی ترتیب (Sequence)

(of Planning) پائی جاتی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

(۱) ان هذه امتکم امة واحده وانا ربکم فاعبدون (الانبیاء ۹۲)

ترجمہ: یہ ہے تم لوگوں کی امت۔ ایک امت، اور میں ہوں تم سمجھوں کا رب پس تم سب میری بندگی کرو۔

(۲) وان هذه امتکم امة واحده وانا ربکم فاتقون (المومنون ۵۲)

ترجمہ: یہ ہے تم لوگوں کی امت، ایک امت، اور میں ہوں تم سمجھوں کا رب پس تم سب مجھ سے ڈرتے رہا کرو۔

اسی ذیل میں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ کسی مرحلہ خاص میں اس مرحلے کی مہم کے سرانجام دینے کے لئے روئے ارض پر رسول مبعوث فرمائے جاتے رہے ہیں۔ چنانچہ ایسا تو ہو سکتا ہے کہ کسی وقت خاص میں روئے زمین پر:

(۱) کوئی نبی اور کوئی رسول نہ ہو

(۲) یا صرف ایک نبی یا ایک رسول ہو

(۳) یا کئی انبیاء بیک وقت ہوں

(۴) یا ایک رسول اور ایک یا ایک سے زائد انبیاء ہوں

لیکن ایسا ہونا اس عاجز کے علم کی حد تک محال ہے کہ ایک ہی وقت میں روئے ارض پر ایک سے زائد مستقل رسول ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالت اور اس کے تحت بھیجے جانے والے

رسول اس (Integral Planning) کا بھی حصہ ہوتے ہیں جسے کائناتی منصوبہ ربانی کہا جاتا ہے۔ لہذا ایسا ہونا ناممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں روئے ارض پر ایک سے زائد مستقل رسول

پائے جائیں۔ چنانچہ جب روئے ارض پر کوئی رسول مبعوث ہوتا ہے تو وہ گویا پوری روئے ارض کے لئے ہوتا ہے اور اس طرح اس وقت ایک یا ایک سے زائد نبی روئے ارض پر پائے جائیں تو

وہ سب گویا اس رسول کے ماتحت اور اس کی ہدی سے مربوط (Intergrated) ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب لانا چاہا تو عذاب سے

پہلے بلکہ خود حضرت لوط علیہ السلام کی آگاہی سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے ذریعہ اسکی اطلاع حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کروائی۔ اور چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام منصب رسالت پر فائز

تھے لہذا انہوں نے ملائکہ سے جدال کیا تا کہ یہ عذاب موخر ہو جائے۔ اسی طرح اگر بالاتفاق ایسا ہو جائے کہ دو رسول یکجا ہو جائیں تو ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ دونوں علیٰ حالہ مستقل رسول بھی ہوں اور بیک وقت مستقل رسالت پر فائز رہیں۔ چنانچہ ان میں کسی ایک کو لازماً دوسرے کے ماتحت آجانا ہوگا اور یہ ماتحتی بھی اس کائناتی اور مربوط منصوبہ ربانی کی تکمیل کے تناظر میں ہوگی، یعنی وہ رسول جو منصوبہ ربانی کے اس مرحلے سے متعلق ہے جو اس کا اپنا مرحلہ ہے تو وہی آمر قرار پائے گا اور دوسرا رسول مامور۔ اس سے بھی اس منصوبہ ربانی کی Intergrity اور Holistic ہونے کا علم ہوتا ہے چنانچہ یہی مفہوم ہے اس حدیث کا جس میں فرمایا گیا:

عن جابر ان عمر بن الخطاب اتى رسول الله صلى الله عليه وسلم بنسخة من التوراة فقال يا رسول الله هذه نسخة من التوراة فسكت فجعل يقرأ ووجه رسول الله صلى الله عليه وسلم يتغير فقال ابوبكر ثكلتك الثواكل ماترى بوجه رسول الله صلى الله عليه وسلم فنظر عمر الى وجه رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال اعوذ بالله من غضب الله وغضب رسوله رضينا بالله ربا وبالا سلام ديننا وبمحمد نبيا فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم والذي نفس محمد بيده لو بدالكُم موسى فاتبعتموه وتركتُمونى لظللتم عن سواء السبيل ولو كان موسى حيا، وادرك نبوتى لاتبعنى (رواه الدارمي)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں توراة کا ایک نسخہ لیکر حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ یہ توراة کا نسخہ ہے۔ سرکار خاموش رہے اور حضرت عمر نے توراة پڑھنا شروع کی ادھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک متغیر ہونے لگا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر سے فرمایا: گم کرنے والیاں تمہیں گم کر دیں کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کو نہیں دیکھ رہے ہو؟ چنانچہ حضرت عمر نے نگاہیں اٹھائیں اور آنحضور کے چہرے کی طرف دیکھا۔ دیکھتے ہی پکار اٹھے: میں اللہ اور اس کے رسول کے غضب سے پناہ مانگتا ہوں۔ ہم اللہ کی ربوبیت، اسلام کے دین ہونے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر راضی ہیں۔ اس وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد کی جان ہے اگر اس وقت جناب موسیٰ علیہ السلام تشریف

لائیں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کا اتباع کرو تو تم گمراہ ہو جاؤ گے۔ اگر موسیٰ علیہ السلام حیات ظاہری کے ساتھ موجود ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پاتے تو وہ بھی میرا اتباع کرتے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دین کسی مخصوص افعال و اعمال کا حتیٰ کہ رسوم و قیود خواہ وہ عبادت ہی کے رسوم و قیود کیوں نہ ہوں نام نہیں بلکہ دین اللہ دراصل روئے ارض پر منصوبہ ربانی کی تکمیل کی کوشش کا نام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حدیث کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد بعثت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موجودگی کی صورت میں جو حضرت موسیٰ کا اتباع کرتے وہ یقیناً ان اوامر و نواہی کی رعایت کے ساتھ ہی کرتے جس کے مکلف خود حضرت موسیٰ اپنے عہد بعثت میں تھے جن میں عبادات بھی ہونگی اور تقویٰ کے دیگر امور بھی، لیکن ان سب کے باوجود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان اعمال صالحہ کے انجام دینے کے باوجود تم گمراہ قرار پاؤ گے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ ہر رسول جو اپنے عہد میں مبعوث کیا گیا ہو وہ اپنے مخصوص ہدیٰ کو رو بہ عمل لانے اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے لئے ہی آیا ہوتا ہے اور اس عہد کے تمام لوگوں کی نجات اس میں مضمر ہوتی ہے کہ وہ اس کے مخصوص ہدیٰ کا اس وقت لازماً اتباع کریں۔ اس ”ہدیٰ“ سے باہر ہر چیز گمراہی قرار پاتی ہے خواہ وہ کسی نبی یا رسول کا اتباع خالص و مخلص ہی کیوں نہ ہو۔ کسی رسول کو ہدیٰ عام طور پر دو ذرائع سے عطا کیا جاتا ہے۔ پہلا: ایحاء اور دوسرا: ارآت۔ ان میں سے ہر ایک کے متعدد وجوہ اور صورت ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ہدیٰ ان تمام ذرائع سے حاصل شدہ وہ خطہ (Blueprint) ہے جو منصوبہ ربانی کی تکمیل کے لئے رسول کو دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس منصوبہ ربانی کے تناظر میں ذات رسول وہ منبع واحد ہے جہاں سے ہدیٰ مل سکتا ہے۔ چنانچہ اصحاب رسول اور ان میں عشرہ مبشرہ اور ان میں خلفائے راشدین اربعہ اور پھر ان میں علی الترتیب حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت عمر اور حضرت ابو بکر وہ ذات ہای گرامی ہیں جو اس ہدیٰ سے زیادہ سے زیادہ واقف تھے۔ لہذا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو چھوڑ کر پوری امت محمدیہ میں ہدیٰ سے سب سے زیادہ واقف ذات ہیں اور حضرت ابو بکر پورے بنی نوع انسان میں انبیاء کو چھوڑ کر سب سے زیادہ واقف ذات ہیں۔

سنت: رسالت کی تیسری سمت سنت ہے۔ قرآن کے مطابق کائنات میں ارادہ منصوبہ ربانی کے صدور کے مخصوص و متعین طریقے کا نام سنت اللہ ہے۔ چنانچہ قرآن نے ارشاد فرمایا ہے۔

(۱) فلن تجد لسنة الله تبديلا (الفاطر ۴۳)

ترجمہ: پس تم سنت اللہ کو بدلتا ہوا نہ پاؤ گے۔

(۲) ولن تجد لسنة الله تحويلا (الفاطر ۴۳)

ترجمہ: اور تم سنت اللہ کو ٹالے جاتے ہوئے نہ پاؤ گے۔

(۳) سنة من قد ارسلنا قبلك من رسلنا (اسرئیل ۷۷)

ترجمہ: سنت جو چلا آتا ہے ان رسولوں کا جو آپ سے پہلے بھیجے ہم نے اپنے رسول۔

ٹھیک اسی طرح روئے ارض پر منصوبہ ربانی کی تکمیل کے لئے کسی رسول سے ہدی کے قولی، فعلی یا تقریری صدور کو سنت رسول کہا جاتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر کسی رسول کے ذریعہ ہدی کی قولی، فعلی یا تقریری تعمیل کو سنت کہتے ہیں۔ بلاشبہ یہ نکتہ نہایت باریک ہے جس کی حقیقت کا سمجھ پانا راسخون فی العلم کا ہی حصہ ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے سنت کے دو دائرے ہونگے اور دونوں سنت کہلائیں گے۔ پہلا دائرہ بہت وسیع ہے جس میں کسی رسول کی بعثت سے لیکر ان کے وصال تک ان کی ذات کے سارے قولی، فعلی اور تقریری صدورات سنت قرار پائیں گے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے چنانچہ ان کے سنت قرار دیئے جانے میں ذرہ برابر قباحت نہیں۔ دوسرا دائرہ اس بڑے دائرے کے اندر ایک چھوٹا دائرہ ہے جس میں اس رسول کی بعثت سے لیکر وصال تک اس کے وہ سارے قولی، فعلی اور تقریری صدورات ہی آئیں گے جو ہدی کی تعمیل و تکمیل سے متعلق ہونگے۔ راسخون فی العلم کے نزدیک یہ دونوں دائرے ایک ہی سعت کے حاصل ہیں۔ جمہور امت کے نزدیک بھی ایسا ہی ہے لیکن ان دونوں فرقوں میں فرق ہے اور یہ فرق دراصل منظر کا ہے۔ یعنی اس بڑے دائرے کو ہی سنت کا دائرہ قرار دینے کے باوجود دونوں الگ الگ (Vantage point) پر کھڑے ہیں چنانچہ منظر کا فرق منظور کے فرق میں بدل گیا ہے۔ اس نکتے کی مزید تشریح یہاں چنداں ضروری نہیں۔ چنانچہ جب جمہور کہتا ہے کہ بیٹھ کر پانی پینا یا تین سانس میں پانی پینا سنت ہے تو راسخون فی العلم اس کی تردید نہیں کرتے لیکن خود وہ اسے سنت خاتم النبیین قرار نہیں دیتے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے لئے جانور ذبح کرنا اور ختنہ کرنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم الشان سنت ہے اور یہ کہ اس سے بھی عظیم الشان وہ سنت ہے جسے خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری فرمایا یعنی نکاح کرنا۔ لیکن ختنہ کرنا سنت ابراہیمی ہے اور

نکاح کرنا سنت محمدی اور وہ بھی عظیم الشان سنت تو یہ بات وہ ہے جسے عام اذہان سمجھنے سے قاصر ہوں گے۔ ان صدورات کو سنت سمجھنا جیسا کہ فقہ میں انہیں سنت قرار دیا گیا ہے اور اس سے آگے بڑھ کر انہیں روئے ارض پر جاری ہونے والے عظیم الشان بلکہ عظیم النظیر سنت قرار دینا تو صرف راسخون فی العلم کا نصیب ہے جن پر منصوبہ ربانی اور ہدیٰ آشکارہ ہے۔

ختم نبوت: ختم نبوت پوری تاریخ کائنات میں وہ تیسری سعت ہے جس کا عرض کائنات میں صرف ایک بار ہی ہونا مقدر ہے۔ ختم نبوت سے مراد ہے روئے ارض پر ہدیٰ (البقرہ آیت ۳۸) کی تکمیل یعنی بحائی حیثیت آدم اور اس سے آگے بڑھ کر حصول مقام محمود کی آخری ذمہ داری ادا کرنے والے اور ان کے حصول کی جدوجہد کو حقیقت میں بدل دینے اور پایہ تکمیل تک پہنچا دینے والے کی آمد اور تکمیل منصوبہ۔

چنانچہ ختم نبوت سے مراد اس ذات گرامی کی بعثت ہے جو ابتداء آفرینش سے جاری منصوبہ ربانی کو جس میں ابلیس کے ساتھ منصب خلافت کے عنوان سے جاری معرکہ خیر و شر بھی شامل ہے رضاء الہی کے عین مطابق پورا کر دے اور ایک طرف بنی نوع آدم کو منصب خلافت کا اہل ثابت کر دے اور دوسری طرف رضاء و منشاء ربانی کے عین مطابق اس آخری مقام تک ترقی کر جائے جسے باری تعالیٰ نے مقام محمود قرار دیا ہے۔ جو رب العالمین کے نزدیک منشاء ہے اس کی مخلوق میں سے کسی ایک فرد اور اس کے حوالے سے اس نوع کے بلکہ پوری خلق کے پہنچنے کی۔

چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم وہ ذات گرامی ہیں جو کائنات میں اس مقام ختم نبوت پر فائز فرمائے گئے۔ ختم نبوت دراصل وہ منصب اعلیٰ ہے جو زمین پر نبوت و رسالت کی جامع ہے۔ سارے انبیاء اسی لئے مبعوث فرمائے گئے اور سارے رسول ہدیٰ (التوبہ، الفتح، الصف) کے ساتھ بھیجے گئے تاکہ خاتم الرسل اور خاتم النبیین کی بعثت ہو۔ اور خود ختم رسل کا منصب اسی لئے قائم کیا گیا کہ روئے ارض پر وعدہ ربانی یعنی ہدیٰ (البقرہ ۳۸) کی تکمیل حقیقت کی صورت اختیار کر سکے اور بنی نوع آدم اس منصب جلیلہ پر فائز ہو سکے جو رب العالمین کے نزدیک وجہ تکوین کائنات ہے۔

کائنات میں اگر ابلیس کے ساتھ معرکہ خیر و شر مقدر نہ ہوتا تو عین ممکن ہے کہ حقیقت محمدی یعنی حامل لواء الحمد اور حامل مقام محمود کا ظہور کسی اور طریقے سے الجنہ میں ہی ہوتا۔ چونکہ حضرات آدم و حوا کو الجنہ سے منتقل کر کے روئے ارض پر بسا دیا گیا اس لئے توحید کی ترویج جو براہ

راست آخرت کی شکل میں ہوتی تھی ہدیٰ (البقرہ ۳۸) کے حوالے سے رسالت کی شکل میں روئے ارض پر ہوگئی۔ ہر دو صورت میں ظہور حقیقت محمدی مقدر تھا چنانچہ روئے ارض پر یہ ظہور محمدی ختم نبوت اور ختم رسالت کے حوالے سے ہوا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ الہدیٰ (البقرہ ۳۸) کے فضل خاص کا ایک اور تناظر ہو سکتا ہے اور وہ ہے باری تعالیٰ کا علم ابلیس کے ارادہ جنگ اور اس میں استعمال کئے جانے والے مکر و کید کے حوالے سے۔ لہذا اس روئے ارض پر اجراء سلسلہ نبوت و رسالت کا بنیادی نقطہ نوع آدم کے خلاف لڑائی میں ابلیس کا طریقہ جنگ یا منہج جنگ ہے۔ نسل آدم کے لئے ابلیس کے منہج جنگ کا سمجھنا اور اس کا مقابلہ کرنا آسان نہ تھا۔ یہی وہ ضرورت تھی جو نسل آدم کے لئے اس فضل خاص کا باعث ہوئی۔ چنانچہ انبیاء وہ ذات ہای گرامی ہیں جو ارادہ و منشاء ربانی کو عام انسانوں کے مقابلے میں پوری طرح سمجھنے والے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہدیٰ (البقرہ ۳۸) اور ہدیٰ (التوبہ، الفتح اور القصف) دیکر بھیجتا رہا تا کہ یہ ابلیس کے منہج کو سمجھ سکیں اور نہ صرف یہ کہ پوری نوع انسانی کو اس کے مکر و کید سے نکال لے جائیں بلکہ بنی نوع آدم کو ترقی کے اس سفر پر آگے لے جاسکیں جس کی انتہاء مقام محمود کا حصول ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بنی نوع آدم میں بعض لوگوں کو مصطفیٰ و مجتبیٰ قرار دیا اور انہیں ایحاء اور اراءت سے نوازا تا کہ وہ ہدیٰ کے حامل ہو سکیں اور اس طرح ہدیٰ کے ساتھ انہیں مبعوث فرمایا گیا تا کہ وہ بنی آدم کی اس معرکہ خیز دشر میں حق کی جانب سے قیادت کر سکیں۔ انبیاء و رسل علیہم السلام کا بنیادی کام ابلیس کے پیچیدہ اور پر فریب منہج کو سمجھنا اور اس کے ذریعہ روئے ارض پر برپا قیامت خیز معرکوں سے نوع آدم کو محفوظ اور کامیاب نکال لیجا کر اور اسے ترقی و فلاح کی اس راہ میں مقصد اصلی کے حصول تک آگے لیجانا قرار پایا۔ چنانچہ انبیاء کرام ہمیشہ لوگوں کے درمیان تشریف لاتے رہے اور انہیں ایک ایسی صالح قیادت فراہم کرتے رہے جو اس بنیادی چیز کی حامل تھی جو ضمانت تھی معرکہ خیز دشر میں کامیابی کی یعنی ہدیٰ (التوبہ، الفتح اور القصف)۔ ہدیٰ کے بغیر ابلیس کے منہج کا سمجھنا ممکن نہیں رہ جاتا نہ منصوبہ ربانی اور نہ رضاء ربانی کا سمجھنا چاہے جاسکے ابلیس کا مقابلہ کرنا۔ رسولوں کا مبعوث ہونا اور ان کو ہدیٰ کا دیا جانا دراصل ابلیس کے منہج کی تحقیق اور اس کے خلاف طریقہ جنگ کی تعیین کے لئے تھا چنانچہ ہدیٰ کے ساتھ اللہ کے انبیاء و رسل کا آنا اور اس ہدیٰ کو تعمیل و تکمیل کے مرحلے سے قولی، عملی اور تقریری طور پر گزارنا دراصل اس طریقہ کو قائم کرنا ہے جسے عام طور پر سنت کہا جاتا ہے۔

معرکہ خلافت اور مناجح ابلیس

منہج اول: منہج سفک دم یعنی خوں ریزی

روئے ارض پر ابلیس نے بنی آدم کے خلاف معرکہ کا آغاز ایک گہری اور دور رس نتائج کی حامل سازش کے ساتھ کیا۔ اس منہج کو ”منہج سفک دم“ یعنی خون ریزی کرانے کا طریقہ کہا جاسکتا ہے۔ اس گہری سازش کی دو جہتیں تھیں۔ ابلیس کو یقین تھا کہ اس دو جہاتی طریقہ جنگ سے وہ بنی آدم کو ابتداء ہی میں نابود کر دینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس سازش کا بنیادی مقصد تھا روئے ارض پر آدم و حوا کے بسائے جانے کے بعد پہلا خون آدم و حوا یا بنی آدم کے ذریعہ بہا دیا جائے۔ واضح رہے کہ روئے ارض حضرات آدم و حوا کے بسائے جانے سے قبل جنوں کے تصرف میں تھی اور وہ مخلوق خوں ریزی میں سبقت لے گئی یہاں تک کہ خود اسی ابلیس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ان جنوں کی پوری نسل کا خاتمہ کروا دیا۔ ابلیس اس تباہی کی پوری روداد سے نہ صرف یہ کہ واقف تھا بلکہ وہ اس کا عینی شاہد یا اس سے آگے بڑھ کر خود ایک اہم کردار تھا۔ روئے ارض پر نوع آدم کے بسائے جانے کے بعد خود اسی نوع آدم کے ذریعہ بہائے جانے والے پہلے خون سے اصولی، قانونی، طبعی اور روحانی طور پر مرتب ہونے والے اثرات ہی وہ امور تھے جن پر دراصل ابلیس کی نظر تھی۔ اس کو بخوبی علم تھا کہ اس پہلی خوں ریزی کے دو مضمرات و عواقب ہیں۔

(۱) سفک دم یعنی خوں ریزی ہی وہ نکتہ ہے جس کی وجہ سے مختار مخلوقات میں سے جن خلافت کے منصب کے حصول میں ناکام ہو گئے یعنی اس وسعت ارض پر جس کو ان کا مستقر قرار دیا گیا تھا پہلا خون خود ان کے ہی ہاتھوں بہایا گیا یہ پہلی خون ریزی بالآخر منہج ہوئی پوری وسعت ارض کے خوں سے بھر دیے جانے پر یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسی ابلیس کے ذریعہ ہی ان جنوں کا خاتمہ کروا دیا۔

(۲) آدم کے منصب خلافت پر فائز کئے جانے کے اعلان کے موقع پر ابناء نور کی طرف سے جو بات پیش کی گئی اس میں بنیادی طور پر اسی اندیشہ کا اظہار کیا گیا تھا کہ یہ مخلوق یعنی نوع آدم بھی روئے ارض پر ”سفک دم“ (البقرہ ۳۰) کرے گی اور یہ کہ عین ممکن ہے کہ اس کا انجام بھی

ابناء نار سے مختلف نہ ہو۔

جنوں کی روداد اور ملائکہ کا آدم کی خلقت کو دیکھ کر مخصوص اندیشے کا اظہار بنیادی نکات قرار پائے اس سازش کی تشکیل و تعمیل کے۔ ابلیس کو اندازہ تھا کہ قلیل مدتی صورتحال اور طویل مدتی صورتحال ہر دو صورت میں وہ کامیاب ہو جائے گا۔ جس وقت اس نے اس سازش کے تار و پود بنے اس وقت روئے ارض پر کل چار نفوس تھے جو نوع آدم کی نمائندگی کر رہے تھے۔ یعنی حضرات آدم و حوا، حضرت ہانبل اور قانبل۔ قلیل مدتی صورتحال میں اگر ابلیس قانبل اور ہانبل کو ایک دوسرے کی خوں ریزی پر آمادہ کر دے تو اس صورت میں اگر ہانبل نے قانبل کو قتل کر دیا تو روئے ارض پر پہلا خون ہانبل یعنی نوع آدم کے ذریعہ بہہ جائے گا اس طرح آگے چل کر لازماً اس کا انجام جنوں کے انجام جیسا ہو جائے گا۔ بصورت دیگر اگر قانبل نے ہانبل کو قتل کر دیا تو ایک جانب یہ ہوگا کہ آدم و حوا کی واحد اولاد کا خاتمہ ہو جائے گا اور اس طرح روئے ارض نسل آدم سے خالی ہو جائے گی (واضح ہو کہ اس وقت تولد سنت عادیہ قرار نہیں پائی تھی) ۱۲۔ تو دوسری جانب خود اس کا جارحہ اور آلہ کار یعنی قانبل بالآخر منصب خلافت پر فائز ہو جائے گا۔ طویل مدتی صورتحال میں پہلی بار نوع آدم کے ذریعہ روئے ارض پر خون بہایا جانا جنوں کی طرح نوع آدم کے ذریعہ روئے ارض کو خوں سے بھر دے گا تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق اس کے خاتمے کا خود فیصلہ فرما دے گا اور ممکن ہے کہ اس صورت میں ایک بار پھر اللہ مجھے یعنی ابلیس کو ایسا یہ کام سونپ دے۔

واضح رہے کہ حضرت ہانبل روئے ارض پر حضرات آدم و حوا کی پہلی جائز آدمی اولاد تھے۔ اس کے مقابلے میں قانبل ایک ایسا شخص تھا جو ظن حوا سے پیدا ہوتے ہوئے بھی جنت میں حمل میں آنے والا کفر زمین پر پیدا ہونے والا غیر آدمی یا نیم آدمی یا تہائی آدمی تھا۔ اور اسے اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا کا صلیبی اور روحانی وارث ماننے سے انکار کر دیا۔ جس طرح امور دنیا میں مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا (لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم: الحدیث متفق علیہ) اسی طرح منصب خلافت میں قانبل حضرت آدم و حوا کا وارث نہیں قرار دیا گیا۔

قرآن میں مذکور واقعہ (واتل علیہم نبا ابنی آدم... المائدہ ۲۷) نہ کسی نذر کے

پیش کئے جانے سے متعلق ہے نہ کسی لڑکی سے شادی سے متعلق۔ ان باتوں کی حقیقت افسانوں سے زیادہ نہیں۔ قائل دراصل ابلیس کا ایک جارحہ اور آکے کا رتھا جس کے ذریعہ اس نے بالواسطہ اور پر فریب طریقہ سے منصب خلافت حاصل کرنے اور آدم کو اس سے محروم کر دینے کی کوشش کی تھی (قائل کی تفصیل ان شاء اللہ عنقریب دجال کے ذیل میں بیان کی جائے گی)۔ چونکہ قائل ایک عمل غیر صالح تھا اور کلی طور پر غیر آدمی نہ سہی مگر تہائی آدمی یا زیادہ سے زیادہ نیم آدمی مخلوق تھا اس لئے اسے آدمی مخلوق قرار دینے سے انکار کر دیا گیا اور جائز اولاد بھی۔ شادی والے قصے کو اگر بفرض محال مان بھی لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ جب قائل کو جائز اولاد قرار دینے کے ساتھ ساتھ آدمی مخلوق قرار دینے سے بھی انکار کر دیا گیا تو پھر اس پر اس کی بھی پابندی عاید کر دی گئی کہ وہ کبھی بھی کسی آدمی لڑکی سے رشتہ ازدواج قائم کرے۔ گویا اس طرح اسے کلی طور پر دائرہ آدمیت سے خارج قرار دے دیا گیا۔ یہی وہ بات ہے جس پر ابلیس کا غصہ بھڑک اٹھا اور اس نے محسوس کیا کہ اس کا خفیہ منصوبہ جس کے تار و پود اس نے الجھنے میں بنے تھے نہ صرف یہ کہ طشت از بام ہو گیا ہے بلکہ ناکام بھی چنانچہ اس نے قائل کو اکسایا کہ وہ حضرت ہابیل کو دعوت مبارزت دے۔ یہی وہ بات ہے جس کا ذکر قرآن نے یوں فرمایا ہے:

اِز قَرَبًا قَرَبَانَا فَتَقْبِلُ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يَتَقْبَلْ مِنَ الْاٰخَرِ قَالَ لَاقْتُلْكَ قَالَ اِنَّمَا يَتَقْبَلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (المائدہ ۲۷)

ترجمہ: جب نیاز کی دونوں نے کچھ نیاز اور مقبول ہوئی ایک کی اور نہ مقبول ہوئی دوسرے کی کہا میں تجھ کو ضرور قتل کر ڈالوں گا وہ بولا بے شک اللہ قبول کرتا ہے تو پر ہیز گاروں سے۔

حضرات آدم و حوا اور بالخصوص حضرت ہابیل نے معرکہ خیر و شر کی اس نزاکت کو سمجھا کہ اس غصے کے پیچھے بھی ابلیس کی کتنی خطرناک چال چھپی ہوئی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ہابیل پر ”فیضان“ فرمایا اور انہوں نے اس غیر معمولی ابلیسی سازش کی کنہ پالی۔ اس طرح حضرت ہابیل نے قائل کی مبارز طلبی اور ارادہ قتل پر واشگاف طور پر اعلان فرمادیا۔

لَنْ يَبْسُطَ اِلٰى يَدِكَ لِتَقْتُلَنِي مَا اَنَا بِبَاسِطِ يَدِي اِلَيْكَ لَاقْتُلْكَ اِنِّيْ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ (المائدہ ۲۸)

ترجمہ: اور تو ہاتھ چلا دے گا مجھ پر میرے قتل کرنے کو میں نہ ہاتھ چلاؤں گا تجھ پر تیرے قتل کرنے

کو میں ڈرتا ہوں اللہ رب العلمین سے۔

حضرت ہانبل نے اس ابلیسی مکر کبار کو ناکام کرنے اور عالم امر و عالم تکوین میں معروف و معلوم رضاء الہی اور سنت اللہ کو سمجھتے ہوئے قافلہ حق کو کامیاب بنانے کے لئے یہی بہتر بلکہ واحد حل پایا کہ ”عدم بسط ید“ (ہاتھ نہ اٹھانا) کر کے روئے ارض پر حقیقی واصلی نوع آدم کے لئے ان تین عنایات کے تعلق سے جن کا فیضان قبولیت توبہ کے بعد الجنہ میں ہوا تھا اس مقدر مدت حیات ارض میں بھی از سر نو ضمانت حاصل کر لیں۔ یعنی اولاً اس بات کی ضمانت کہ اللہ تعالیٰ روئے ارض پر بنی آدم کو اس کے نزدیک مقرر مدت حیات سے قبل فنا نہیں کرے گا۔ دوم یہ کہ بنی آدم کا خاتمہ خون ریزی، (سفک دم) کی پاداش میں نہیں کیا جائے گا لہذا لازماً اسے وہ عرصہ اور موقع میسر آئے گا تا کہ حیثیت آدم کی بحالی اور منصب خلافت کے اعلیٰ مدارج یعنی مقام محمود تک پہنچنے کی جدوجہد جاری رہ سکے۔

آدم کی بحالی حیثیت کے اعتبار سے دوسری لیکن روئے ارض پر پہلی عظیم جست (The First Quantum Jump) تھی حضرت ہانبل کا قاتیل کے اعلان ارادہ قتل ہانبل کے جواب میں قاتیل کے قتل کے لئے ”بسط ید“ کرنے سے انکار کرنا اور اس عزم پر خود شہید ہو جانے تک ثابت قدم رہنا۔

واضح رہے کہ حضرت ہانبل اور قاتیل کے مابین جو معاملہ ہوا وہ فرد بہ فرد کا معاملہ نہیں تھا بلکہ نوع بہ نوع کا معاملہ تھا یہ ایسا ہی تھا جیسا ایک فرد کا اپنے کو دوسرے فرد کے حوالے کر دینا اور ایک بادشاہ کا اپنے کو دوسرے بادشاہ کے حوالے کر دینا۔ ان دونوں میں جو فرق ہے وہی فرق یہاں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ایک بادشاہ کا اپنے کو دوسرے بادشاہ کے حوالے کرنا محض ایک فرد کا معاملہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے اثرات اس پوری مملکت پر اور نہ صرف اس لمحے بلکہ نسل بعد نسل لاکھوں اور کروڑوں خاندانوں پر پڑتے ہیں۔ صرف ایک فرد کے ایک فیصلہ سے کروڑوں خاندانوں کی زندگیاں بر سہا برس کے لئے بدل جاتی ہیں۔ چنانچہ حضرت ہانبل نے اسی سنت اللہ کی حقیقت کو پا کر عدم بسط ید کر کے ایک جانب نوع آدم کو روئے ارض پر پہلی خوں ریزی سے بچا لیا تو دوسری جانب روئے ارض پر اس خوں ریزی کا سارا وبال قاتیل یعنی بالواسطہ ابلیس کے کاندھوں پر ڈال دیا۔ قرآن کا ارشاد ہے:

انسی اریدان تبو ابائمی واثمک فتکون من اصحاب النار وذلک

جزاء الظالمین (المائدہ ۲۹)

ترجمہ: میں چاہتا ہوں کہ تو حاصل کر لے میرا گناہ اور اپنا گناہ پھر ہو جاوے تو دوزخ والوں میں اور یہی ہے سزا ظالموں کی۔

چنانچہ حضرت ہانبل آخری رقی باقی رہنے تک ”سفک دم“ یعنی خوں ریزی سے بچتے رہے یہاں تک کہ وہ شہید کر دیئے گئے۔ اس طرح انہوں نے ایک جانب ابلیس کو شکست فاش دی اور دوسری جانب حیثیت آدم کو بحالی کی طرف ایک اور جست دلا دی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم عمل پر اپنا فضل خاص فرمایا اور روئے ارض پر نوع آدم کے لئے ولادت کی سنت کا اجراء فرمادیا اور حضرت شیث علیہ السلام اور پھر حضرت انس علیہ السلام کے ساتھ باضابطہ موجودہ انسانی سنت کا اجراء ہوا۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تقتل نفس ظلما الا کان ابن آدم الاول کفل من دمها لانه اول من سن القتل (رواہ البخاری کتاب احادیث الانبیاء: کتاب بدء الخلق)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (روئے زمین پر) جب بھی کوئی ظلماً قتل کیا جاتا ہے تو اس کے خون کے وہال کا دو ہزار حصہ آدم کے پہلے بیٹے (قائیل) پر پڑتا ہے کیونکہ اس نے قتل کی بنیاد ڈالی ہے۔

اس ناکامی کے بعد ابلیس روئے ارض پر سلسلہ قتل بنی آدم کو وسیع تر کرتا چلا گیا چنانچہ حضرت ہانبل کی شہادت کے بعد ابلیس نے بنی آدم سے خلافت چھین لینے اور اسے اس کے متوقع انعامات سے محروم کر دینے کی صورت اس کے قتل عام میں دیکھی۔ لہذا اس نے نسل آدم کا خود قتل کرنا شروع کیا یا قائیلی نسل کے ذریعہ قتل کروانا شروع کیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے روئے ارض پر نسل آدم کو برکت سے نوازا اور ابلیس کی بالواسطہ اور بلاواسطہ ہر طرح کی کوششوں کے باوجود بنی آدم کی صالح ذریت کی افزائش کا سلسلہ ہمہ دم جاری رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ”سفک دم“ وہ ابلیسی طریقہ اور منہج ہے جو حضرت شیث علیہ السلام سے لیکر حضرت انس بن یر علیہ السلام تک جاری رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس طریقے سے اور اس کے ذریعہ حصول مقصد سے ابلیس مایوس ہوتا چلا گیا۔ یہ

مایوسی بالآخر ابلیس کو نسل آدم کی تباہی کے دوسرے راستوں کی تحقیق کی جانب لے گئی۔ چنانچہ ایسا لگتا ہے کہ اس کے بعد اس نے بنی آدم کی افزائش میں پنہاں سنت ربانی کو جاننے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے اس کا مقصد اسے جان کر افزائش کے اس سلسلے کو روکنا یا تباہ کر دینا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس سلسلے میں اسے کچھ کامیابی حضرت انس بن یرد علیہما السلام کے عہد تک آتے آتے مل ہی گئی۔ لہذا بنی آدم کی صالح ذریت کے سلسلہ الذہب کی کنہہ پاتے ہی اس نے حضرت انس بن یرد پر حملہ بول دیا تاکہ ان کا خاتمہ کر کے اس سلسلہ الذہب کو منقطع کر دے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ابلیس کے لئے اس نکتے تک پہنچنا ممکن ہی نہیں تھا جب تک کہ اسے ملائکہ میں سے چند تک رسوخ حاصل ہو گیا ہو جو تدبیر عالم پر متعین تھے۔ آثار و احوال بتاتے ہیں کہ یہی وہ زمانہ ہو سکتا ہے جب ابلیس از سر نو ابناؤں میں سے بعض سے تعلقات استوار کرنے حتیٰ کہ انہیں ورغلا کر اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کرنے یا اپنے تفویض کردہ اختیارات میں از خود تصرف کرنے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ اس لئے کہ کائنات میں مختلف امور پر متعین یہ ملائکہ ہی ہیں جنہیں ان کے تفویض کردہ کاموں سے متعلق راز اور کنہ معلوم ہوتے ہیں جو دوسروں کو معلوم نہیں اور ان رازوں میں بنی آدم کی افزائش اور موت کی کنہ بھی ہے۔ ۱۳

چنانچہ ابلیس بعض ملائکہ کے تحالف سے اس مقام پر پہنچ گیا کہ وہ نسل آدم کی افزائش کے سلسلہ الذہب کا ہی خاتمہ کر دے۔ یہی وہ گھڑی ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ الذہب کی حفاظت کا حکم جاری فرمایا اور حضرت انس بن یرد علیہما السلام پر اللہ کی مدد کا فیضان ہوا اور وہ ”نصرت کفل“ سے نوازے گئے۔ چنانچہ اس طرح وہ ذوالکفل بنادئے گئے اور روئے ارض سے انہیں منتقل کر کے ایک محفوظ و اعلیٰ مقام پر اس طرح رکھ دیا گیا کہ اہل سماء کے ساتھ ساتھ اہل دنیا سے بھی ان کا تعلق برقرار رہا۔ یہ وہ صورت حال تھی جس نے ابلیس کو تھوڑی دیر کے لئے ہکا بکا کر دیا لیکن جلد ہی اس نے طریقہ کار میں تبدیلی کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اس نتیجے تک پہنچ گیا تھا کہ ”سفک دم“ (خون ریزی) سے وہ یہ جنگ نہیں جیت سکتا۔

منہج دوم: منہج فساد ملکوت

ابلیس نے روئے ارض پر منہج خوں ریزی کی ناکامی کے بعد جو دوسرا طریقہ اختیار کیا وہ منہج فساد فی ملکوت السموات والارض یعنی فساد ملکوت تھا۔ یہ ایک ہمہ جہت، ہمہ گیر، کائناتی اور متعدد السطوح (Multilinear) منہج تھا چنانچہ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ محض ابلیس کے ذریعہ ممکن العمل نہیں ہو سکتا تھا تا وقتیکہ اس میں ابلیس کو ان لوگوں کا تعاون نہ مل جائے جو ملائکہ میں سے ہوں اور تدبیر عالم کے کاموں پر متعین ہوں۔ اور یہی وہ عظیم کامیابی ہے جو ابلیس نے حاصل کی۔ اس تحالف کے بعد ابلیس نے تدبیر عالم پر متعین بعض ملائکہ کے ذریعہ کائنات خلق میں بالعموم اور ارض و ماوراء ارض میں بالخصوص ایک ہمہ گیر فساد برپا کر دینا چاہا جس کی بنیاد عالم تخلیق میں سنت ربانی کے منہج کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دینا تھی تاکہ اس فساد عالم میں نسل آدم کا خاتمہ ہو جائے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر فساد ملکوت سے کیا مراد ہے؟

فساد ملکوت کی حقیقت جاننے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ملکوت اللہ اور ملکوت السموات والارض کیا ہیں؟ قرآن کا ارشاد ہے:

الاله الخلق والامور (الاعراف ۵۴)

ترجمہ: خبردار! خلق اسی کی ہے اور امرا اسی کا ہے۔

اللہ تعالیٰ خالق ارض و سموات ہے اور وہی حقیقی مدبر عالم ہے۔ اسی نے کائنات اور عالم خلق اور اس میں بے شمار مخلوقات پیدا کیں۔ عالم خلق میں ہمہ دم تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ تبدیلیاں خواہ پیدائش کی ہوں یا موت کی، افزائش کی ہوں یا گھٹنے کی، تزکیہ کی ہوں یا تہ سیہ کی، بسط کی ہوں یا قبض کی، ترقی کی ہوں یا تنزلی کی، ارتباء کی ہوں یا احتیاط کی ہمہ دم جاری ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے اور منشاء کی تکمیل کے لئے اور خلق میں ان تبدیلیوں کے لئے مخصوص سنتوں کا اجراء فرمایا ہے۔ یوں تو کائنات میں جاری تمام سنتوں کا علم صرف اللہ رب العالمین کو ہے لیکن اس نے نہ صرف یہ کہ بعض سنتوں کو مخلوقات پر ظاہر فرما دیا ہے بلکہ ان کو اس کے جاری رہنے میں جارحہ اور آلہ بھی بنا دیا ہے۔ عالم خلق میں موجود مخلوقات اپنا مستقل وجود رکھنے کے باوجود باہم مربوط اور اس طرح ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بنائی گئی ہیں۔ اس کی کنہ اسی میں مضمر ہے یعنی بحیثیت مجموعی یہ مخلوقات اللہ تعالیٰ کی بعض سنتوں کے اجراء میں جارحہ

ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ ہر مخلوق اپنے اوپر جاری تمام سنتوں سے واقف ہو۔ مثلاً انسان کو اپنے لئے مفید بعض سنتوں کا جزوی علم دیا گیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کیسے سانس لی جائے اور کیسے کھایا اور پیا جائے وغیرہ لیکن جہاں اسے بعض متعلق سنتوں کا علم ہے وہیں خود اپنے متعلق بے شمار ایسی سنتیں ہیں جن کا نہ صرف یہ کہ اسے علم نہیں دیا گیا بلکہ ان کے اجراء میں اس کا کوئی ہاتھ بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً انسان سانس لینے، کھانے پینے یا مباشرت کرنے کی حد تک تو ذمہ دار اور واقف ہوتا ہے لیکن اس کے بعد نہ وہ جانتا ہے نہ اس میں اس کا کوئی عمل دخل ہے کہ کس طرح نظام تنفس کام کرتا ہے، کس طرح نظام دوران خون اور نظام ہضم کام کرتا ہے اور کس طرح نظام تولید جاری ہے۔ بعض اوقات انسانوں سے متعلق بہت سی ایسی سنتیں ہیں جن پر بعض دوسری مخلوقات مثلاً ملائکہ حتیٰ کہ حشرات الارض، جانور اور کیڑے مکوڑے اور جرثومے جارحہ کی حیثیت سے متعین ہیں اور وہ انسان کے لئے ان کا اجراء کرتے ہیں۔ مثلاً مادہ منویہ یعنی جرثومہ کیسے پیدا ہوتا ہے؟ رحم مادر میں کیسے نطفہ علقہ میل اور علقہ مضغہ مخلقہ اور غیر مخلقہ میں تبدیل ہوتا ہے کیسے ہڈی بنتی ہے اور کیسے انسانی ہڈیوں پر گوشت چڑھتا ہے طبیات اور جراحات کے اعتبار سے یہ محیر العقول کارنامے کون انجام دیتا ہے؟ ظاہر ہے ان سنتوں کے اجراء کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرشتے مقرر فرمادیئے ہیں۔ ایک ایک فرد بشر کے لئے اللہ تعالیٰ نے کتنے عظیم الشان انتظامات فرمائے ہیں کہ اگر ان کا موجودہ ترقی یافتہ دنیا میں طبی سہولتوں اور ان پر مالی صرفے کے تناظر میں مقابلہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ صرف ایک مفلوک حال غریب انسان کے ایک دن زندہ رہنے پر اللہ تعالیٰ اتنا صرف کرتا ہے کہ اگر اسی میکانزم کو مصنوعی طور پر انجام دیا جائے تو اس کا تحمل دنیا کی امیر ترین مملکت بھی اپنی ساری دولت کے ساتھ بھی نہیں کر سکتی۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ محض ایک عضو کی پلاسٹک سرجری یا ایک دل کی تبدیلی (Heart Transplantation) میں جو محض (Assemble) کرنے کا کام ہے کس قدر صرفہ آتا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کے ملائکہ روزانہ ان سے کروڑوں گنا زیادہ کام صرف ایک روز میں روئے ارض پر کرتے ہیں جن کے لئے انسان کو کچھ بھی صرف کرنا نہیں پڑتا۔ روزانہ کروڑوں لوگ روئے ارض پر پیدا ہو رہے ہیں ان میں سے بھی بیشتر غریب ملکوں میں۔ اسی طرح روئے ارض پر انسانوں، جانداروں، نباتات حتیٰ کہ جمادات کے فضلوں تک کی صفائی اور انہیں استعمال کے لئے از سر نو قابل بنانے پر اللہ تعالیٰ نے کتنے ملائکہ اور کتنی ہی مخلوقات کو لگا رکھا ہے۔ آخر پتھروں کا ٹوٹنا اور ریت اور مٹی کا بننا، جمادات

کے فضلے ہی تو ہیں جن کو ہوا اور ندیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا کر ان کا (Sedimentation) کرتی ہیں پھر ان کی Metamorphosis ہوتی ہے۔ روزانہ کروڑوں مربع میل میں پھیلے پیڑوں اور پودوں سے لکڑیاں اور پتے گرتے ہیں جو ان کے فضلے ہی ہیں انہیں ہوا، بارش اور زمین صاف کر کے پھر قابل استعمال بناتی ہیں۔ انسانوں اور جانداروں کے فضلوں کو کتنے ہی جاندار، ہوا، زمین اور آگ دوبار قابل استعمال بناتی ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے علاوہ کتنے ہی دیگر مخلوقات کو ان سنتوں کے لئے جارحہ بنا رکھا ہے جو باہم ایک دوسرے کے لئے مفید ہیں۔ چنانچہ انسانوں سے متعلق بہت سی ایسی سنتیں ہیں جن کا علم انسان کو ہے نہ ہی اس میں کچھ عمل دخل لیکن ان کی تدبیر پر کیڑے مکوڑے متعین ہیں جنہیں ان کی کندہ کا علم ہے۔ اپنے اوپر جاری بعض سنتوں سے انسان خود واقف ہے بعض سے نباتات، حیوانات اور حشرات الارض واقف اور ان پر متعین ہیں اور بیشتر سنتوں سے صرف ملائکہ ہی واقف ہیں اور ان پر وہی متعین ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان سب سے واقف ہے اور اسی کا دیا ہوا علم ان تمام مخلوقات کو ملا ہے۔ ان سب پر اللہ کی قدرت کاملہ حاوی ہے جس کا ذکر قرآن میں اس طرح فرمایا گیا ہے:

(۱) قُلْ مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ (المومنون ۸۸)

ترجمہ: تو کہہ کس کے ہاتھ میں ہے ملکوت ہر چیز کی اور وہ بچا لیتا ہے اور کوئی اس سے نہیں بچا سکتا بتاؤ اگر تم جانتے ہو۔

(۲) فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (یس ۸۳)

ترجمہ: سو پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہے ملکوت ہر شے کی اور اسی کی طرف پھر کر چلے جاؤ گے۔

(۳) وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ (البقرہ ۲۵۵)

ترجمہ: گنجائش ہے اس کی کرسی میں تمام آسمانوں اور زمین کو

چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس سابقہ تعلقات اور معلومات کی بنیاد پر بعض ایسے ملائکہ میں جو تدبیر عالم کے امور میں ارض و سماء کے نظام سے بالعموم اور نظام حیات انسانی سے بالخصوص علاقہ رکھتے تھے رسوخ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی اور ان کے توسط سے رفتہ

رفتہ نظام حیات انسانی سے متعلق بیشتر شعبوں میں مثلاً نظام حیات نباتات، نظام حیات حشرات الارض، نظام حیات حیوانات، نظام حیات جمادات اور سب سے بڑھ کر نظام حیات انسان سے متعلق سنتوں میں تبدیلی، بگاڑ اور الٹ پلٹ کرنے میں کامیاب ہو گیا جس سے روئے ارض اور ماوراء ارض میں فساد ملکوت پیدا ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے یہ فساد ملکوت زمین و ماوراء زمین کے بیشتر حصوں پر محیط ہو گیا۔ روئے زمین و ماوراء زمین میں قائم نظاموں سے متعلق سنتوں کی یہی برہمی و تباہی دراصل فساد ملکوت کہلاتی ہے۔

اسی مقام پر اس بات کا واضح طور پر ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا (ہر چند کہ اس کی تفصیلات ان شاء اللہ بعد میں بیان کی جائیں گی) کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے بعد اور بالخصوص 1687 عیسوی سے ظاہر و باہر دجالی تہذیب جسے موجودہ مغربی تہذیب کہا جاتا ہے اور اس میں اشاعت پزیر سائنسی و تکنیکی صورتحال اسی فساد ملکوت کا تیسرا مرحلہ ہے۔ فساد ملکوت کا پہلا مرحلہ زیر بحث ہے یہ فساد دراصل جاری سنتوں سے متعلق ملائکہ کے تحالف سے روئے ارض پر برپا کیا گیا۔

فساد ملکوت کا دوسرا مرحلہ جنوں کے تحالف سے 1600 قبل مسیح میں روئے ارض پر برپا کیا گیا تھا۔

اور یہ موجودہ فساد ملکوت جسے ہم مغربی سائنسی تہذیب (The Western Scientific Civilization) کہتے ہیں انسانوں کے تحالف سے ابلیس نے برپا کیا ہے جو تیزی سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ جسے عام اور سطحی آنکھیں اور دماغ سائنس کے محیر العقول کارنامے قرار دے رہے ہیں وہ فساد ملکوت کا ایک ایسا کارنامہ ہے جسے ابلیس اب انسانوں کے تحالف سے انجام دے رہا ہے۔

چونکہ اول الذکر فساد ملائکہ کی مدد اور تحالف سے اور ملائکہ ہی کے ہاتھوں سے لایا گیا تھا اور اس کا دائرہ ارض و سماء کے تمام نظامات کا جن کا تعلق حیات انسانی سے ہے احاطہ کر رہا تھا اس لئے دیکھتے دیکھتے اس فساد نے پوری روئے زمین اور اس پر بسنے والوں کو فساد آلودہ کر دیا۔

سنت اللہ، سحر اور سائنس

سنت اللہ

کائنات میں اور بالخصوص روئے ارض پر 'فساد ملکوت' کی حقیقت جاننے اور اس کے دقیق خطوط تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان درج ذیل امور پر غور و فکر کرے:

(۱) اللہ رب العالمین

(۲) صفت ربوبیت اور اظہار ربوبیت

(۳) امر اللہ

(۴) کائنات امر

(۵) خلق اللہ

(۶) کائنات خلق

(۷) کائنات امر و خلق

(۸) سنت اللہ

(۹) تزیین

(۱۰) فطرت اللہ

(۱۱) منصوبہ ربانی

(۱۲) حیات الجنہ

(۱۳) توسیع حیات آدم بر زمین

(۱۴) حیات الآخرة بمعنی رجعت

(۱۵) حیات الجنہ

(واضح رہے کہ ان امور کی کافی تشریح الحمد للہ عالم اسلام کی منجی و مقصدی صورت

حال۔ محور اول: کتاب اول: ما کان وما یکون میں آگئی ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمایا جائے) آئندہ

سطور میں ان شاء اللہ بطور خاص جس امر پر بحث مقصود ہے وہ 'سنت اللہ' ہے۔ اس لئے کہ 'فساد

ملکوت کا براہ راست تعلق اسی سنت اللہ سے ہے۔

(۱) عادیۃ اللہ: سنت اللہ عادیۃ اللہ ہے جو اللہ رب العلمین کے ارادہ کا اظہار ہے۔

کائنات یعنی کائنات امر و خلق میں (اور چونکہ یہاں بحث بنیادی طور پر خلق اللہ کے تناظر میں ہو رہی ہے اس لئے مخلوقات کے تناظر میں) اللہ رب العلمین کی سنت کی دو قسمیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) سنت اللہ اول: کائنات خلق و امر میں اللہ رب العلمین کی آزاد سنت

(۲) سنت اللہ دوم: کائنات خلق و امر میں اللہ رب العلمین کی متعین سنت

جہاں تک سنت اللہ اول کا تعلق ہے تو اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔ اس کے برخلاف

سنت اللہ دوم دراصل وہ سنت ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے متعین فرما دیا ہے۔ یہی وہ سنت ہے جسے

ہم مختلف شکلوں میں آفاق و انفس میں پاتے ہیں مثلاً:

(۱) پانی رقیق ہے اور برف ٹھوس

(۲) پانی ٹھنڈا ہوتا ہے اور آگ گرم اور جلانے والی

(۳) دوران خون اور تنفس کا جاری رہنا انسانوں میں زندگی کی علامت ہے۔

(۴) نامی ہونا یعنی جسم میں نمو ہونا حیاۃ کی علامت ہے۔

یہ اور اس طرح کے دیگر اربوں کھربوں امور جن کا انسان آفاق و انفس میں مشاہدہ اور

تجربہ کرتا ہے دراصل اللہ رب العلمین کی وہ سنت ہے جسے اس نے متعین کر دیا ہے۔ اور اس میں

تبدیلی صرف اس صورت میں ہی ممکن ہے جب کسی چیز کی حقیقت بدل جائے۔

’متعین سنت اللہ کی آفاق و انفس میں دو قسمیں پائی جاتی ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) غیر اختیاری

(۲) اختیاری اور مشارکتی

غیر اختیاری اس ’متعین سنت اللہ‘ کو کہتے ہیں جس پر معمول کا یعنی جس مخلوق پر وہ سنت جاری ہوتی

ہے کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ مثلاً انسانی جسم میں اس غیر اختیاری سنت کی درج ذیل مثالیں لی جاسکتی

ہیں:

(۱) اس کے خون کا کون سا گروپ ہو یا اس کے DNA کی کون سی ترتیب ہو۔

(۲) وہ مرد پیدا ہو اور اس کی ساری حیات پر مراد نہ سنت جاری ہو یا عورت اور اس پر ساری

حیات زمانہ سنت جاری ہو۔

(۳) نظام دوران خون، نظام تنفس، نظام ہضم، اور دیگر نظامات وغیرہ

(۴) اس کی پیدائش کب ہو اور اس کی موت کب ہو؟

اختیاری اور مشارکتی اس 'متعین سنت اللہ' کو کہتے ہیں جس پر معمول کا یعنی جس مخلوق پر وہ سنت جاری ہوتی ہے نہ صرف اختیار ہوتا ہے بلکہ خود سنت اس کے بعض یا کل حصوں پر اس معمول سے شرکت اور معاونت کا حکم کرتی ہے۔ چنانچہ اگر معمول اور اس مقام پر انسان اگر اپنی حد تک اس میں شراکت نہ کرے تو یا تو اس سنت کا پورا اجراء نہیں ہوتا یا سرے سے اس سنت کا اجراء ہی موقوف ہو جاتا ہے۔ مثلاً:

(۱) زندہ رہنے کے لئے کھانا پینا اور کھانے اور پینے میں مخصوص اعمال مثلاً چبانا یا گھونٹ گھونٹ پینا۔

(۲) زوجیت قائم کرنا تاکہ تو والد و تناسل کا اجراء ہو۔

(۳) دیکھنے کے لئے آنکھیں کھولنا کسی شے پر نظر ڈالنا اور اتنی دیر تک خواہ وہ ایک ثانیہ کا ایک حصہ ہی کیوں نہ ہو کسی مخصوص مقام پر نظر کو نکالے رکھنا تاکہ دیکھنے کی سنت کا اجراء ہو سکے۔ وغیرہ چنانچہ جب مذکورہ تمام امور و وجوہ پر مشتمل سنت اللہ کو کائنات خلق و امر کے 'مثال' یا پیراڈائم (Paradigm) میں مشخص کیا جاتا ہے تو اسے قرآن 'قطرت اللہ' کا نام دیتا ہے۔ اس پورے تناظر کو اللہ رب العزت اس طرح بیان فرماتا ہے:

(۱) فسبحن الله حين تمسون وحين تصبحون (الروم ۱۷)

ترجمہ: پس تسبیح کرو اللہ کی جب کہ تم شام کرتے ہو اور جب صبح کرتے ہو

(۲) وله الحمد في السموات والارض و عشيا حين تظهرون (الروم ۱۸)

ترجمہ: آسمانوں اور زمین میں اسی کے لئے حمد ہے اور (تسبیح کرو اس کی) تیسرے پہر اور جبکہ تم پر ظہر کا وقت آتا ہے۔

(۳) يخرج الحي من الميت، ويخرج الميت من الحي ويحي الارض بعد

موتها وكذلك تخرجون (الروم ۱۹)

ترجمہ: وہ زندہ میں سے مردے کو نکالتا ہے اور مردہ میں سے زندہ کو نکال لاتا ہے اور زمین کو اسکی

موت کے بعد زندگی بخشا ہے اس طرح تم لوگ بھی (حالت موت سے) نکال لئے جاؤ گے۔

(۴) وَمِنْ آيَاتِهِ اَنْ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَا اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ (الروم ۲۰)

ترجمہ: اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر یکا یک تم بشر ہو کہ (زمین میں) پھلتے چلے جا رہے ہو۔

(۵) وَمِنْ آيَاتِهِ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لَتَسْكُنُوا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ

مَوَدَّةً وَرَحْمَةً اِنْ فِي ذَلِكَ لَايْتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُوْنَ (الروم ۲۱)

ترجمہ: اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

(۶) وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالاٰخِلَافِ السَّنٰتِ وَالْوَاكِنِ اِنْ فِي

ذَلِكَ لَايْتٍ لِّلْعٰمِلِيْنَ (الروم ۲۲)

ترجمہ: اور اس کی نشانیوں میں آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانشمند لوگوں کے لئے۔

(۷) وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَّاكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُمْ مِنْ فَضْلِهِ اِنْ فِي ذَلِكَ

لَايْتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُوْنَ (الروم ۲۳)

ترجمہ: اور اس کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن کو سونا اور تمہارے اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو (غور سے) سنتے ہیں۔

(۸) وَمِنْ آيَاتِهِ يُرِيكُمْ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُخْرِجُ بِهِ

الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنْ فِي ذَلِكَ لَايْتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ (الروم ۲۴)

ترجمہ: اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی اور آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

(۹) وَمِنْ آيَاتِهِ اَنْ تَقُومَ السَّمَاءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهِ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنْ

الارض اذا انتم تخرجون (الروم ۲۵)

ترجمہ: اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں پھر جو نبی کہ اس نے تمہیں زمین سے پکارا بس ایک ہی پکار میں اچانک تم نکل آؤ گے۔

(۱۰) وله من فی السموات والارض کل له قنون (الروم ۲۶)

ترجمہ: آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے اس کے بندے ہیں۔ سب کے سب اس کے تابع فرمان ہیں۔

(۱۱) وهو الذی ید فی الخلق ثم یعیدہ وهو اہون علیہ وله المثل الاعلیٰ فی

السموات والارض وهو العزیز الحکیم (الروم ۲۷)

ترجمہ: وہی ہے جو تخلیق کی ابتداء کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اس کے لئے آسان تر ہے۔ آسمانوں اور زمین میں اسی کی مثل الاعلیٰ ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔

(۱۲) ضرب لکم مثلا من انفسکم هل لکم من مملکت ایمانکم من شرکاء

فی مازقنکم فانتم فیہ سواء تخافونہم کخیفتم انفسکم کذلک نفصل

الایت لقوم یعقلون (الروم ۲۸)

ترجمہ: وہ تمہیں خود تمہاری اپنی ہی ذات سے ایک مثال دیتا ہے۔ کیا تمہارے ان غلاموں میں سے جو تمہاری ملکیت میں ہیں کچھ غلام ایسے بھی ہیں جو ہمارے دیے ہوئے مال و دولت میں تمہارے ساتھ برابر کے شریک ہوں اور تم ان سے اسی طرح ڈرتے ہو جس طرح آپس میں اپنے بڑوں سے ڈرتے ہو؟ اس طرح ہم آیات کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

(۱۳) بل اتبع الذین ظلموا اہواءہم بغیر علم فمن یہدی من اضل اللہ

ومالہم من نصرین (الروم ۲۹)

ترجمہ: مگر یہ ظالم بے سمجھ بوجھ اپنے تخیلات کے پیچھے چل پڑے ہیں اب کون اسے راستہ دکھا سکتا ہے جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو۔ ایسے لوگوں کا تو کوئی مددگار نہیں ہو سکتا۔

(۱۴) فاقم وجہک للذین حنیفا فطرت اللہ الی فطر الناس علیہا لا تبدیل

لخلق اللہ ذلک الذین القیم ولكن اکثر الناس لا یعلمون (الروم ۳۰)

ترجمہ: (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور نبی کے پیرو) یک سو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جمادو، قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جاسکتی یہی بالکل راست اور درست دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

چنانچہ قرآن اللہ رب العلمین کی اس عظیم الشان شان ربوبیت کا اظہار اسے:

’فطرت اللہ التي فطر الناس عليها‘ کا نام دے کر کرتا ہے اور اسے ہی ’دین

القیم‘ کہہ کر پکارتا ہے۔

یہی وہ ’فطرت‘ ہے جس پر حضرت آدم قدیم و اقدم کو پیدا فرمایا گیا تھا اور اسی پر انہیں

’الجنہ‘ میں رکھا گیا تھا۔

(۲) رواد حیات الجنہ:

الجنہ میں اللہ رب العزت نے حضرت آدم اور پھر بعد میں حضرت حوا کے لئے حیات کا

جو ماڈل رکھا تھا وہ کل ملا کر تین اور بنیادی طور پر دو امور پر مشتمل تھا۔

الجنہ کی حیات کا پورا ماڈل:

(۱) الست بربکم ایمان باللہ

(۲) اسکن انت وزوجک الجنہ سکونت یعنی الجنہ میں رہنا

(۳) کلامنها رغدا حیث یشتما وتقربا

ہذہ الشجرة فتکوننا من الظالمین کرنا اور نہ کرنا

یعنی (۱) ایمان باللہ (۲) سکونت (۳) کرنا (یعنی زندہ رہنے کے لئے الجنہ کی

چیزوں سے استفادہ کرنا) اور نہ کرنا (یعنی الشجرة سے استفادہ نہ کرنا)

غور کیا جائے تو یہ تین امور دراصل دو امور پر مشتمل ہیں:

(۱) علم اور دوسرا (۲) عمل

چنانچہ جیسا کہ دجال حصہ اول میں واضح کیا جا چکا ہے کہ ابلیس نے بہت غور سے الجنہ

میں جاری ’سنت اللہ‘ یعنی فطرت اللہ کا مطالعہ کیا اور اس میں فساد انگیزی کے لئے جو طریقہ وضع

کیا وہ نہایت عجیب تھا۔ ابلیس حضرات آدم و حوا کو بالآخر یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ ’علم‘

کے تعلق سے انفاقی کے بجائے اکتشافی علم کی طرف راغب ہو جائیں۔ چنانچہ حضرات آدم و حوا

سے جو بنیادی گناہ سرزد ہوا وہ یہی تھا کہ وہ دونوں انفاقی علم کو چھوڑ کر اور اس پر اکتفاء نہ کرتے ہوئے اکتشافی علم کی طرف راغب ہی نہیں ہوئے بلکہ اس علم میں سرگرم ہو گئے۔ یہی سبب ہے کہ میں نے لکھا تھا کہ انفاقی علم ربانی اور نبوی علم ہے اور اکتشافی علم ابلیسی (ملاحظہ فرمائیں) ماکان و مایکون: ادراک کائنات صفحات ۱۷ تا ۳۳)

واضح رہے کہ ابلیس اس روئے ارض پر اسی طریقہ انحراف، کو دوبارہ رو بہ عمل لا رہا ہے جس کے ذریعہ اس نے الجنہ میں حضرات آدم و حوا کو گمراہ کیا تھا اور جس طریقے کو اس نے الجنہ میں موثر اور کامیاب پایا۔ چنانچہ الجنہ میں اس نے جو انفجار (Dynamite) کیا وہ 'علم' کا انفجار تھا چنانچہ جنتی ربانی علم کو انفجار کر کے اڑا دینے سے اس کا براہ راست اثر ماڈل کے دوسرے اور آخری حصے 'عمل' پر پڑا اور نتیجتاً وہ گناہ سرزد ہو گیا جس نے حضرات آدم و حوا کو بالآخر اس روئے ارض پر آجانے پر مجبور کر دیا۔

ابلیس نے الجنہ میں حضرات آدم و حوا علیہما السلام کو باور کرایا:

- (۱) انفاقی علم اصل نہیں بلکہ اکتشافی علم اصل ہے
- (۲) اکتشافی علم انفاقی علم کے مقابلے میں نہایت مفید ہے
- (۳) انفاقی علم قوای آدم کو پوری طرح ارتقاء پر نہیں کرتا جب کہ اکتشافی علم اسے پوری طرح ارتقاء پر لے جاتا ہے اور اس سے بھرپور استفادہ کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔
- (۴) انفاقی علم آدم کو معمولی اور سب سے چلی سطح پر باقی رکھتا ہے جب کہ اکتشافی علم اسے حیات دوام سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

لہذا ابلیس نے باور کرایا کہ آدم و حوا کے لئے یہی نافع ترین بات ہے کہ وہ انفاقی علم اور انفاقی علم پر مبنی اور اس سے مضبوط (regulated) عمل کو ترک کر دیں اور اکتشافی علم اور اکتشافی علم پر مبنی اور اس سے مضبوط (regulated) عمل کو اختیار کر لیں۔ اس طرح ابلیس نے حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام کو باور کرایا کہ وہ دو چیزوں کو ایجاد کریں اور ان سے استفادہ کریں۔ چنانچہ حضرات آدم و حوا نے یہی کیا۔ یہ دو چیزیں تھیں:

- (۱) علم طبیعیات (Physical Science) اور
- (۲) علم ہنر (Technology)

الجنہ میں گناہ آدم اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ حضرات آدم و حوا نے ابلیس کے گمراہ کرنے کے بعد علم طبیعیات (Physical Science) اور علم ہنر (Technology) کا آغاز اور اس سے استفادہ کیا۔ اور یہی دونوں اسباب بنے اس ناکامی کے جس کا نتیجہ الجنہ سے محرومی اور روئے ارضی پر بسا دیئے جانے کی صورت میں سامنے آیا۔

(انشاء اللہ ان امور کی تشریح عن قریب آرہی ہے)

(۳) روداد حیات ارضی:

جیسا کہ ابھی ابھی عرض کیا گیا کہ ابلیس اس روئے ارض پر اسی طریقہ انحراف کو دوباراً رو بہ عمل لارہا ہے جس کے ذریعہ اس نے الجنہ میں حضرات آدم و حوا علیہما السلام کو گمراہ کیا تھا اور جس طریقے کو اس نے الجنہ میں موثر اور کامیاب پایا۔ چنانچہ روئے ارضی پر ابلیس کے ذریعہ معرکہ خیر و شر میں بنیادی طور پر اسی طریقہ کار سے منصوبہ رہائی کو ناکام بنانے کی روداد ملتی ہے۔

(۴) سحر اور ساحر: 'سحر' کیا ہے؟ قرآن اور احادیث مبارکہ میں 'سحر' کا جو ذکر ہے اس

کی حقیقت کیا ہے؟ علوم اسلامی _____ تفسیر قرآن، تشریحات احادیث، تاریخ اسلام، تدوین

علوم اسلامی اور تاریخ علوم اسلامی _____ میں جن امور اور موضوعات کے ساتھ لاعلمی، جہالت

اور بدمعاملگی کی کوئی انتہاء نہیں ان میں سے ایک موضوع 'سحر' بھی ہے۔ قرآن مجید کتاب اور

سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے اسوہ کی موجودگی میں بھی کوئی قوم فہم و ادراک کے معاملہ میں

لاعلمی، جہالت اور بدمعاملت کی ان سرحدوں تک جاسکتی ہے تصور میں نہیں آتا۔ لیکن یہ ایک

تاریخی حقیقت ہے جس کا انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صورت حال عہد تابعین سے لیکر آج تک اور

مفسرین، محدثین، فقہاء، مورخین، منطقین سے لیکر روحانیین تک یکساں ہے۔ بعض نے چند الفاظ

میں اور بعض نے صفحات کے صفحات میں اس عنوان پر کلام و بحث فرمائی ہے لیکن ان تمام ذخیرے

کے مطالعے سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی تین باتوں کا علم نہ تھا یعنی:

(۱) لفظ 'سحر' کا معنی کیا ہے؟ یعنی تاریخ امت کے پہلے حصے کو چھوڑ کر امت میں 'سحر' کے معنی

سے لاعلمی عام رہی ہے۔

(۲) 'سحر' کی حقیقت کیا ہے؟ یعنی تاریخ امت کے پہلے حصے کو چھوڑ کر امت میں 'سحر' کی

حقیقت سے لاعلمی عام رہی ہے۔

(۳) 'سحر' کی تفہیم اور اس کا ادراک کیا ہے؟ یعنی تاریخ امت کے پہلے حصے کو چھوڑ کر امت میں سحر کے مفہوم اور مدرک سے لاعلمی عام رہی ہے۔

چنانچہ 'سحر' کے لفظی اور لغوی معنی جاننے تک سے عاری ہونے کی کیفیت نے علوم اسلامی کے بڑے بڑے اساطین کو گول مول بات کرنے کا فن سکھایا۔ چنانچہ امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

اعلم ان لفظ السحر فی عرف الشرع مختص بکل امر (تفسیر کبیر تفسیر سورہ البقرہ جلد ۱ صفحہ ۴۲۰)

ترجمہ: جانا چاہئے کہ بے شک لفظ 'سحر' شرع میں عرفاً (یعنی شہرت یافتہ) اس بات کے لئے خاص ہے جو..... چنانچہ 'فی عرف الشرع' دراصل وہ چلمن ہے جس کے پیچھے سے بات کرنے کی ضرورت صرف اس لئے آن پڑی کہ لفظ 'سحر' کا جو معنی معلوم تھا وہ منطبق نہیں ہوتا تھا اور جسے بیان کرنا تھا اس کا معنی معلوم نہیں تھا۔

یہی صورتحال امام ابو بکر حصاص کو پیش آئی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

'ومتی اطلق فهو اسم لكل امر (احکام القرآن جلد ۱ صفحہ ۴۸)

ترجمہ: اور جب اسے مطلق استعمال کیا جائے تو یہ ہر اس بات کے لئے..... اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہی کام جو امام رازی نے 'فی عرف الشرع' سے چلایا ہے امام حصاص ان سے پہلے 'ومتی اطلق' سے چلا چکے ہیں۔

امت مسلمہ تھوڑے ہی عرصے بعد ایسی بنادی گئی جس کو لفظ 'سحر' کا معنی نہیں معلوم۔ اور واضح رہے کہ یہ کوئی معمولی لفظ نہیں بلکہ وہ لفظ ہے جس کا استعمال قرآن عظیم الشان اور احادیث مبارکہ کے ساتھ ساتھ حیات طیبہ کے ذیل میں بھی ہوا ہے۔ اس لئے ایسی قوم کے علماء کے ذریعہ اس لفظ 'سحر' کی بیان کردہ حقیقت اور اس کا مفہوم و مدرک کس 'پایہ' کے ہونگے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ بڑے سوال کا جواب یعنی یہ کہ اس قوم کے علماء کا قرآن، احادیث مبارکہ اور حیات طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنا تعلق اور اس میں کتنا رسوخ رہا ہے؟ خود بخود مل جاتا ہے۔

چنانچہ لفظ 'سحر' کے تعلق سے اساطین علماء اسلام نے جو کچھ فرمایا ہے اسے آسانی کے

لئے سات بڑے طبقات میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) بے حقیقت اور باطل: یہ وہ طبقہ ہے جو 'سحر' کو بے حقیقت سمجھتا، جانتا اور بیان کرتا ہے لہذا اسے باطل قرار دیتا ہے۔ اس میں اگرچہ کئی طبقات ہیں لیکن مجموعی طور پر ان سمجھوں میں یہی تاثر مشترک ہے۔ چنانچہ اس طبقے میں ابو بکر بھصا، ابوالحق اسفرائینی، ابن حزم اور معتزلہ آتے ہیں۔

(۲) بے حقیقت اور باطل: یہ وہ طبقہ ہے جو 'سحر' کو بے حقیقت بیان کرتا ہے لہذا اسے باطل قرار دیتا ہے۔ اس طبقہ میں صرف ایک ہستی کا شمار ہو سکتا ہے اور وہ ہیں ابو حنیفہ نعمان جو امام اعظم کے نام سے مشہور ہیں۔

(۳) حقیقت اور حق: یہ وہ طبقہ ہے جو 'سحر' کو حق سمجھتا ہے اس لئے کہ اس کی حقیقت ہے اس طبقے میں مشہور نام ابو عبد اللہ القرطبی کا ہے۔

(۴) حقیقت اور صحیح: یہ وہ طبقہ ہے جو 'سحر' کو صحیح سمجھتا ہے اس لئے کہ اس کی حقیقت ہے۔ عام طور پر اس طبقے میں محدثین شامل ہیں اور ان میں امام نووی سب سے مشہور ہیں۔ اس طبقے کے نزدیک حقیقت اور صحیح کا صرف یہ مفہوم ہے کہ اس کا ذکر احادیث میں آیا ہے جس کا تعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں پیش آنے والے واقعہ سے ہے لہذا چونکہ وہاں یہ ایک حقیقت اور موثر نظر آتا ہے اس لئے وہ اسے حقیقت اور صحیح کہتے ہیں۔

(۵) حقیقت اور صحیح: یہ وہ طبقہ ہے جو 'سحر' کو صحیح سمجھتا ہے اس لئے کہ اس کی حقیقت ہے۔ لیکن اس طبقے کی رائے میں محدثین کی طرح صرف احادیث اور حیات طیبہ میں سحر کے وجود اور اسکے تاثر کی موجودگی کے علاوہ اسباب بھی شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس میں وہ طبقہ مراد لیا جاتا ہے جو امت میں 'جمہور یا عام علماء' کے نام سے مشہور ہیں۔

(۶) حقیقت، صحیح اور کلی: یہ وہ طبقہ ہے جو 'سحر' کو ایک کلی حقیقت کے بطور سمجھتا ہے یعنی اس میں قوت ہے اور یہ قوت اس درجے کی ہے کہ کلی تبدیلی واقع ہونا ممکن ہے مثلاً پتھر گھوڑا ہو جائے یا گھوڑا پتھر، آدمی بکری ہو جائے یا بکری آدمی۔

(۷) حقیقت، صحیح اور جزوی: یہ وہ طبقہ ہے جو 'سحر' کو ایک جزوی حقیقت کے بطور تسلیم کرتا ہے یعنی اس سے تبدیلی مزاج اور تغیر حالات جزوی طور پر واقع ہو سکتے ہیں۔ مثلاً آدمی بیمار ہو سکتا

ہے یا بیمار سے اچھا ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ طبقہ اسے تسلیم نہیں کرتا کہ آدمی پتھر ہو جائے یا پتھر گھوڑا۔
عام طور پر ’جمہور‘ اس خیال کے حامل ہیں۔

یہ ساتوں طبقات تاریخ اسلام میں بعض اوقات باہم ممیز اور بعض اوقات جزواً آمیختہ بھی پائے جاتے ہیں تاہم ان میں دو طبقات ایسے ہیں جو بقیہ دوسروں سے ممتاز ہیں۔ ان میں پہلا وہ ہے جو شمار نمبر ۲ کے تحت ہے اور دوسرا طبقہ وہ ہے جو شمار نمبر ۴ کے تحت ہے۔ ان میں شمار نمبر ۴ کے تحت محدثین آتے ہیں۔ اس طبقے کا امتیاز یہ ہے کہ ان کے نزدیک کسی امر کے صحیح اور درست ہونے کی صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر کسی امر کے تعلق سے کوئی حدیث ملتی ہے اور وہ اس ’روایت‘ کے اعتبار سے اور اس ’درایت‘ کے اعتبار سے جو محدثین میں رائج ہے ہیں اگر ’سمین‘ ہے تو پھر وہ امر صحیح اور درست ہے۔ شمار نمبر ۲ کے تحت جو طبقہ آتا ہے وہ بنیادی طور پر امام اعظم ابو حنیفہ پر مشتمل ہے۔ امام اعظم سے منسوب جو بات ہے اس میں وہ ’سحر‘ کو صرف بے حقیقت بیان کرتے ہیں اور اس وجہ سے اسے باطل قرار دیتے ہیں۔ اس میں اسکی چنداں صراحت نہیں کہ وہ ’سحر‘ کو بے حقیقت سمجھتے اور جانتے بھی ہیں۔

لیکن ان تمام یعنی ساتوں طبقات میں مشترک یہ بات ہے کہ ان میں سے کسی طبقے کو ’سحر‘ کا معنی، اس کی حقیقت اور اس کے مفہوم کا علم نہیں۔ اور جو کچھ انہیں معلوم ہے اور جس کو یہ بیان کرتے ہیں (نمبر شمار ۴ کو چھوڑ کر) اس کا تعلق قرآن اور احادیث سے قطعاً نہیں بلکہ ان کی ساری آراء کی بنیاد وہ تفصیلات اور خرافات ہیں جو یہودیوں، یونانیوں، مجوسیوں اور ہندوؤں کے ذریعہ ان تک پہنچے تھے جن میں مبطیوں، بابلیوں اور مصریوں کی معلومات بھی شامل تھیں۔ چنانچہ ’سحر‘ کے تعلق سے جو ’علمی‘ ذخیرہ امت میں جمع ہو گیا اور جس کی مختصر مگر بہترین ترتیب اور تدوین ابن خلدون کے ذریعہ مقدمہ میں کی گئی ہے اور جن کی تفصیلات ’الفسلاحۃ السبیطیۃ‘ اور ’مصحف الکواکب السبعة‘ میں یا جابر بن حیان، مسلم بن احمد البحر یطلی یا فخر بن الخطیب کے حوالے سے ملتی ہیں۔ وہ انہیں ’خرافات‘ پر مشتمل ہے جو امت میں رائج ہو گئے تھے جن کا قرآن اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دور دور کا کوئی تعلق نہ تھا۔ چنانچہ ان ’خرافات‘ نے اس ’سحر‘ کا حکم معلوم کرنے کے ذیل میں کلامی مباحث کا ایک نیا دروازہ داکر دیا جس میں نہ صرف یہ کہ ’سحر‘ اور ’ساحر‘ کے تعلق سے شریعت کا حکم جاننے کی کوشش کی گئی بلکہ اس کا مقابلہ ’معجزہ‘ سے بھی

کیا گیا چنانچہ ابن تیمیہ ہوں یا محمد سفارینی وہ بھی ان بحثوں میں پڑ گئے جو قرآن اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بیان کردہ حقیقت سے دور لے جانے والے تھے۔

امت میں یہ صورتحال کیسے پیدا ہوگئی کہ امت قرآن و سنت کے سمجھنے اور اس کی باریکیوں سے نااہل ہوتی چلی گئی۔ کیا یہ سب اتفاقاً، حادثاتی طور پر اور اچانک ہو گیا؟ حقیقت یہ ہے کہ نہ یہ حادثاتی طور پر ہوا نہ ہی اتفاقاً اور نہ اچانک۔ یہ سب ایک سوچے سمجھے منصوبے اور سازش کے تحت ہوا۔ چنانچہ مذکورہ صورتحال کے پیچھے درج ذیل اسباب تھے:

(۱) عربی مبین سے ناواقفیت: امت ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اور تدبیر کے ذریعہ عربی مبین سے ناواقف بنا ڈالی گئی۔ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور اجل تابعین کی شہادت، انتقال یا انہیں حاشیہ پر پہنچا دینے کو اس میں سب سے بڑا دخل ہے۔ اس عربی مبین کے بعد عربی مبین کے نام سے ایک ایسی زبان رائج کی گئی جو نہ صرف یہ کہ عربی مبین نہیں تھی بلکہ اس کا ظرف اتنا تنہا ہی نہیں کہ وہ قرآن و سنت کو اخذ کر سکے اور ان کے لئے ذریعہ اظہار بن سکے لہذا چند ہی دقائق میں اس زبان کا پیالہ لب ریز ہو گیا اور بقیہ گنج ہای گراں مایہ بہہ کر زمین میں معدوم ہو گئے اور یہ سب کچھ صرف چند ہوں میں ہو گیا۔

(۲) حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور اجل تابعین کی شہادت، انتقال اور انہیں حاشیہ پر لادے جانے نے ان مفاہیم کو بھی جو قرآن و سنت میں مذکور امور سے متعلق تھے ان کے ساتھ ہی مدفون کر دیا۔ اور امت نہ صرف یہ کہ ان سے ناواقف ہوگئی بلکہ ان جیسے ہی عنوانات پر ایسی چیزوں سے بالارادہ واقف کرا دی گئی جن سے حضرات صحابہ کرام تک واقف نہ تھے۔

(۳) یہی صورتحال بالآخر قرآن کے ساتھ ساتھ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باریک خطوط اور درو بست کے بھی معدوم ہو جانے کا سبب بنی۔ اور اس طرح سنت الانبیاء اور بالخصوص سنت نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حالت باقی نہیں رہی جن سے حضرات صحابہ کرام واقف تھے۔

(۴) جب یہ سب کچھ امت مسلمہ میں ہو رہا تھا اسی وقت اس امت میں ایسے علوم بالجبر داخل کرا دیئے گئے جن کا قرآن و سنت سے نہ صرف یہ کہ تعلق نہیں تھا بلکہ وہ ان کی ضد تھے۔ ان علوم

نے جلد رواج پالیا اور اب اسلام، قرآن اور سنت کے دقائق کی تحقیق ان علوم کے سہارے ہونے لگی۔ چنانچہ علوم کی یہ مداخلت بے جا بھی سبب بنی اسلامی علوم کا قرآن و سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلی سرچشمے سے دور ہو جانے کا۔

(۵) سحر اور تسخیر:

(الف) 'سحر' کیا ہے؟ 'تسخیر' کیا ہے؟ کوئی چیز مسخر کیسے ہوتی ہے؟ اسے کون مسخر کرتا

ہے؟ یہ چند سوالات ہیں جو نہایت اہم ہیں۔

عربی بین میں 'سحر' کے معانی درج ذیل ہیں:

(۱) بڑا لینا

(۲) سحرانی کرنا

(۳) باندھنا، مضبوط کرنا

(۴) منضبط کرنا

(۵) کسی فرد یا شے کو ضبط یا قرق کرنا

(۶) کسی کو کسی مخصوص کام میں لگانا

(۷) کسی کو کسی مخصوص کام کے لائق بنانا

(۸) کسی کو کسی مخصوص کام کا حکم کرنا

(۹) کسی سے کوئی مخصوص کام لینا

(ب) قرآنی استعمالات: قرآن کے مطابق 'سحر' کا براہ راست تعلق 'سنت اللہ' سے ہے۔

اس کا واضح مفہوم ہے کہ 'سحر' دراصل 'سنت اللہ' کا اجراء اور اجازت استعمال (Order of

Application) ہے۔ لہذا کائنات کی کوئی شے اس وقت تک قابل استفادہ اور قابل استعمال

نہیں ہو سکتی جب تک اسے 'سحر' نہ کر دیا جائے۔ لہذا 'سحر' کرنا علی الاطلاق صرف اور صرف اللہ

رب العالمین کا حق اور اختیار ہے۔ کائنات کی کوئی شے اس وقت تک 'سحر' نہیں ہو سکتی جب تک

اللہ تعالیٰ اس شے سے متعلق اپنی سنت کو جعل نہ کرے اس طرح 'سحر' دراصل کسی شے کے تعلق

سے خود رب العالمین کے ذریعہ اسکی جعل کردہ 'سنت' کا اجراء ہے۔ اس طرح 'سحر' اللہ تعالیٰ کا

اختیار خاص ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ کسی شے کا صرف ایک ہی استعمال

ہو سکتا ہے اور وہ استعمال ہے اس شے سے متعلق سحر کے عین مطابق استعمال۔ یعنی کائنات میں کسی مخلوق کا صرف ایک استعمال ہو سکتا ہے اور وہ استعمال اس سے متعلق سحر اور سنت اللہ سے عین مطابقت رکھتا ہو۔ کسی مخلوق کا اسکے سحر اور سنت کے خلاف استعمال واستفادہ ہی فساد ہے۔

یہی سبب ہے کہ قرآن نے سحر کو صرف دو طریقوں سے استعمال کیا ہے اور دونوں کی نسبت اللہ رب العالمین کی طرف ہے۔

(ج) پہلا استعمال: سحر کا پہلا استعمال مطلق ہے۔ چنانچہ اس صورت میں اس کا تعلق علی الاطلاق صرف رب العالمین سے ہوتا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

(۱) اللہ الذی رفع السموات بغیر عمد ترونها ثم اسوی علی العرش
وسخر الشمس والقمر (الرعد ۲)

ترجمہ: اللہ وہ ہے جس نے اونچے بنائے آسمان بغیر ستون دیکھتے ہو پھر قائم ہوا عرش پر اور سحر کیا سورج اور چاند کو۔

(۲) ولئن مآلتهم من خلق السموات والارض وسخر الشمس والقمر
لیقولن اللہ فانی یوفکون (الحکبوت ۶۱)

ترجمہ: اور اگر تو لوگوں سے پوچھے کہ کس نے بنایا ہے آسمانوں اور زمین کو اور سحر کیا ہے سورج چاند کو تو کہیں اللہ نے پھر کہاں سے الٹ جاتے ہیں۔

(۳) الم تر ان اللہ یولج الیل فی النهار ویولج النهار فی الیل وسخر
الشمس والقمر (قصص: ۲۹)

ترجمہ: تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور سحر کیا سورج اور چاند کو۔

(۴) یولج الیل فی النهار ویولج النهار فی الیل وسخر الشمس والقمر
(فاطر ۱۳)

ترجمہ: رات داخل کرتا ہے دن میں اور دن داخل کرتا ہے رات میں اور سحر کیا سورج اور چاند کو۔

(۵) خلق السموات والارض بالحق یکور الیل علی النهار ویکور النهار

علی الیل ومسخر الشمس والقمر (الزمر ۵)

ترجمہ: بنائے آسمانوں اور زمین کو ٹھیک پیٹتا ہے رات کو دن پر اور پیٹتا ہے دن کو رات پر اور سحر کیا سورج اور چاند کو۔

سحر، وہ عمل اور اختیار حق ہے جو صرف اللہ رب العالمین کے لئے خاص ہے۔

دوسرا استعمال: 'سحر' کا دوسرا استعمال 'ل' صلا کے ساتھ ہے۔ اس کا مفہوم اللہ کا فضل، اس کا انعام، اس کی ودیعت، اس کی رزاقیت اور اس کی ربوبیت کا اظہار ہے۔ چنانچہ 'سحر' 'ل' کے ساتھ اللہ کا فضل، انعام، ودیعت، رزق یا مظہر ربوبیت ہوتا ہے۔

(۱) اللہ الذی خلق السموات والارض وانزل من السماء ماء فاخرج به من الثمرات رزقا لکم ومسخر لکم الفلك لتجری فی البحر بامره ومسخر لکم الانهار ومسخر لکم الشمس والقمر دانبین ومسخر لکم الیل والنهار واتکم من کل ما سالتموہ وان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوها ان الانسان لظلوم کفار (ایراہیم ۳۲-۳۳)

ترجمہ: اللہ وہ ہے جس نے بنایا آسمانوں اور زمین کو اور اتارا آسمان سے پانی پھر اس سے نکالی روزی تمہاری میوے اور سحر کیا تمہارے لئے کشتی کو کہ چلے پانی میں اس کے حکم سے اور سحر کیا تمہارے لئے ندیاں کو اور سحر کیا تمہارے لئے سورج اور چاند کو ایک دستور پر برابر اور سحر کیا تمہارے لئے رات اور دن کو اور دیا تم کو ہر چیز میں سے جو تم نے مانگی اور گنوا احسان اللہ کے نہ پونے کر سکو۔ بے شک آدمی بڑا بے انصاف ہے ناشکر۔

یہی مغایم اتحل، الحج، لقمان، الخرف، الجاشیہ، الانبیاء، ص، وغیرہ میں بیان ہوئے ہیں۔ قرآن کے اس استعمال سے اندازہ ہوتا ہے کہ کائنات اور اس کے اندر مگوین و تخلیق کردہ کسی فرد اور شے کو کسی دوسرے کے لئے 'مسخر' کرنا یعنی اس کو 'سحر' کرنا بھی اللہ رب العالمین کا حق اور اختیار خاص ہے۔ اس طرح کائنات کی کوئی شے نہ تو کسی دوسرے کے ذریعہ 'مسخر' کی جاسکتی ہے اور نہ دوسرے کے ذریعہ دوسروں کے لئے 'سحر' کی جاسکتی ہے۔ اور اگر ان دو صورتوں کے علاوہ کوئی اور صورت پائی جاتی ہے تو وہ ممنوع، حرام، اور فساد ہوگی۔ اس لئے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اللہ رب العالمین کے اختیار خاص اور حق خاص میں تجاوز ہے بلکہ سنت اللہ کے خلاف بھی ہے۔

(د) انفاقی نقطہ نظر : اللہ تعالیٰ رب العالمین کی تکوین اور تخلیق مقصدی ہے۔ کائنات ایک مقصد کے تحت بنائی گئی ہے۔ یہ مقصد رب العالمین کا اپنا مقصد ہے۔ اس لئے اس کی 'سنت' اور 'سحر' میں بھی وہی مقصدیت کارفرما ہے۔ وہی ربانی مقصد ساری کائنات کا مقصد ہے اور ہونا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ انفاقی نقطہ نظر بھی مقصدی ہے۔ اور اس میں وہی مقصدیت پائی جاتی ہے جو ربانی مقصد ہے۔

(۱) الجنہ میں انفاقی صورتحال : اس بات کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ الجنہ میں جو ربانی منہج یا ماڈل دیا گیا تھا اس کے دو بنیادی جز تھے جو مقصد سے مل کر کل تین ہوتے تھے:



الجنہ میں اللہ تعالیٰ نے علم اور عمل دونوں کے درجوں کی تعیین فرمادی تھی۔ یہ تعیین ہی الجنہ کی 'سنت' تھی۔ اس سنت کی تفہیم کے لئے چند باتوں کا سمجھنا ضروری ہے جو درج ذیل ہیں:

(۱) علم صالح اور علم غیر صالح : الجنہ کی مذکورہ 'سنت' کے تحت اللہ تعالیٰ نے حضرات آدم و حوا کو 'علم' دیا۔ یہ علم کی تعلیم و تعلم کی انفاقی سطح تھی۔ چنانچہ تعلم کی انفاقی سطح یہ مقرر کی گئی کہ آدم و حوا اسی تعلیم کی انفاقی سطح پر رہتے ہوئے 'تعلیم' کو توسیع دیں۔ اس طرح یہ تعلیم و تعلم کی وہ انفاقی سطح ہوتی جو الجنہ میں مطلوب تھی۔ یہی علم صالح ہے۔ یہ وہی سطح تھی جس پر رہتے ہوئے آدم و حوا مقصد ربانی کی احسن طریقے سے تکمیل کر سکتے تھے۔ اس سطح کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اور کسی اور سطح پر جا کر تعلیم و تعلم کرنا دراصل اکتشافی نقطہ نظر قرار پاتا ہے۔ ایسا کرنا آدم و حوا کے لئے مہلک اور نقصان دہ تھا اور انہیں اس سے روکا گیا تھا۔ تعلیم و تعلم کی یہ اکتشافی سطح فساد پیدا کرنے والی اور مقصد سے بھٹکا دینے والی تھی۔ اس طرح یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ علم صالح تعلیم و تعلم کی وہ مخصوص سطح ہے جو کسی مخلوق اور یہاں اس سے مراد انسان ہے کے لئے خاص ہے۔ اس سطح پر افقی توسیع (Horizontal Extension) کی پوری گنجائش موجود ہے۔ جبکہ علم غیر صالح تعلیم و تعلم کی انسانی سطح کے علاوہ دوسری مخلوقات و حالات کے لئے مخصوص سطح پر جا کر تعلیم و تعلم کو توسیع دینا ہے اور ایسا عمودی حرکت (Vertical Movement) کے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ انسان کے ذریعہ کوئی ایسی عمودی حرکت کر کے تعلیم و تعلم کو عمودی اور افقی توسیع دینا دراصل علم غیر صالح

ہے۔ یہی علم غیر صالح اکتشافی سطح کا علم ہے۔

(۲) عمل صالح اور عمل غیر صالح: الجنہ کی مذکورہ 'سنت' کے تحت اللہ تعالیٰ نے حضرات آدم وحواء کو 'عمل' کی تلقین کی۔ الجنہ میں 'عمل' کی تلقین کی یہ انفاقی سطح تھی جو تخلیق آدم کے مقصد کی تکمیل کرنے والی اور مطلوب تھی۔ چنانچہ جو عمل انسان کے مقصد تخلیق کو پورا کرنے میں معاون ہو اور اس کے لئے خاص ہو وہی عمل صالح ہے۔ اس کے برخلاف وہ عمل جو اس مقصد تخلیق سے ہٹا ہوا یا اس سے ہٹا دینے والا ہو یا جس عمل کے کرنے سے انسان بے جا مشکلات اور دشواریوں سے اپنے مقصد تک پہنچتا ہو وہ 'عمل غیر صالح' ہے۔ چنانچہ انفاقی علم کی سطح پر رہتے ہوئے انفاقی عمل کا صدور مقصد کو پورا کرنے میں سب سے احسن صورت پیدا کرتا ہے۔ انفاقی سطح پر رہتے ہوئے 'عمل' کی توسیع کی ساری گنجائش موجود ہے لیکن اس انفاقی سطح کو چھوڑ کر اور عمودی حرکت کرتے ہوئے دوسروں کے لئے مخصوص سطحوں پر چلا جانا اور 'عمل' کو جاری رکھنا 'اکتشافی عمل' ہے جو انسان کے لئے ہلاکت اور مقصد سے دور رکھنے والا ہے۔ 'اکتشافی عمل' کے لئے عمودی حرکت (Vertical Movement) ضروری ہے۔ اور ایسی حرکت کرنا فساد انگیزی ہے۔ چنانچہ انسان کا اپنی انسانی انفاقی سطح سے عمودی حرکت کر کے دوسروں کے لئے خاص انفاقی سطح پر جا کر عمل کرنا عمل غیر صالح ہے۔

(۳) نتیجہ صالح اور نتیجہ غیر صالح: انفاقی علم یعنی انفاقی تعلیم و تعلم اور انفاقی عمل کے ذریعہ نتیجہ صالح کا حصول ہوتا ہے خواہ فرد کی صورت میں ہو یا شے کی صورت میں یا اجر و ثواب کی صورت میں۔ مثلاً فرد کی صورت میں نتیجہ صالح یہ ہوتا ہے کہ صالح اولاد نصیب ہوتی ہے۔ شے کی صورت میں یہ ہوتا ہے کہ صالح رزق ملتا ہے اور اجر و ثواب کی صورت میں یہ ہوتا ہے کہ عند اللہ جزا ملتی ہے۔ جنہیں دعوات صالحہ اور اعمال صالحہ کہتے ہیں۔ اس کے برخلاف اکتشافی علم یعنی اکتشافی تعلیم و تعلم اور اکتشافی عمل کے ذریعہ نتیجہ غیر صالح کا حصول ہوتا ہے خواہ ایسا اولاد کی صورت میں ہو جو 'عمل غیر صالح' قرار پائے یا اس شے کی صورت میں ہو جو رزق غیر صالح قرار پائے یا ایسے اجر و ثواب کی صورت میں ہو جو اعمال غیر صالح قرار پائے۔

چنانچہ الجنہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرات آدم وحواء کو انفاقی تعلیم و تعلم اور انفاقی عمل کا حکم فرمایا اور اکتشافی تعلیم و تعلم اور عمل سے روکا تا کہ نتیجہ صالح کا حصول ہو۔ اس کو منہدم کرنے کے

لئے ابلیس نے جو فساد برپا کیا اور حضرات آدم و حوا جس کے شکار ہو گئے وہ دراصل علم اور عمل کی ہر دو سطح پر انفجار (Explosion) کر دینا تھا۔ چنانچہ ابلیس نے حضرات آدم و حوا کو انفاقی تعلیم و تعلم سے اکتشافی تعلیم و تعلم کی طرف مائل کر دیا۔ اور ان دونوں نے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انفاقی تعلیم و تعلم کو انفاقی توسیع (Infraqi Extension) دینے کے بجائے اکتشافی تعلیم و تعلم کو پورا کرنے کے لئے عمودی حرکت یا چھلانگ (Vertical Movement or Jump) لگادی جو دراصل ایک اکتشافی عمل تھا۔ اس طرح اکتشافی تعلیم و تعلم اور اکتشافی عمل کے ذریعہ الجنہ میں پہلے مرحلے میں دو عظیم فسادات کا ظہور ہوا یہ دو فسادات تھے:

(۱) اکتشافی علم یعنی علم طبیعیات (Physical Science) اور

(۲) اکتشافی ہنر یعنی ٹکنالوجی (Technology)

الجنہ کی 'سنت اللہ اور اس میں اللہ کی جانب سے حضرات آدم و حوا کے لئے 'سحر' انفاقی تھے۔ اس مخصوص 'سحر' کے تحت الجنہ نہ کسی 'علم طبیعیات' کو قبول کر سکتی تھی نہ کسی 'علم ہنر یعنی ٹکنالوجی' کو۔ لہذا ایسا کرتے ہی الجنہ میں فساد کا آغاز ہو گیا۔ ظاہر ہے یہ اکتشافی تعلیم و تعلم اور اکتشافی عمل یعنی علم طبیعیات (Physical Science) اور علم ہنر (Technology) نتیجہ غیر صالحہ پیدا کرتا۔ چنانچہ وہ نتائج کئی صورتوں میں ظاہر ہونے لگا۔

(۱) احساس عورات اور شرمگاہ شروع ہو گیا۔

(۲) احساس و خواہش مقاربت بصورت جدید اور بذریعہ آلہ جات ہونے لگا۔

(۳) ضرورت بول و براز ہونے لگی

(۴) حادثہ حمل اولاد ہو گیا یعنی حمل قرار پا گیا۔

چنانچہ بہت جلد الجنہ حضرات آدم و حوا کے لئے ناقابل برداشت اور اس کے لئے یہ حضرات ناقابل برداشت ہو گئے۔ اس ناقابل برداشتگی (Unsustainability) کی بنیادی وجہ تھی الجنہ میں علم طبیعیات یعنی سائنس (Physical Science or Natural Science) اور علم ہنر یعنی ٹکنالوجی (Technology) کا ایجاد اور اس سے استفادہ کی مجبوری۔ چنانچہ بالآخر حضرات آدم و حوا کو اپنی اس غلطی کا احساس ہوا۔ وہ تائب ہوئے اور ان

کی خطا معاف کر دی گئی مگر اس طبعی بگاڑ نے جو بہر حال اس فساد انگیزی سے پیدا ہو گیا تھا لازم کر دیا کہ آدم و حوا اس روئے ارض پر منتقل ہو جائیں جو اس طبیعیات (Physics) کے قریب تر تھی۔

(۲) ابلیسی طریقہ فساد: ابلیس کا الجھ اور الارض دونوں پر فساد انگیزی کا طریقہ اور عمل یکساں معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس منہج کو سمجھنے سے قبل چند امور کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(الف) موقعی منہج (Positional Approach): ابلیس کا پہلا منہج موقعی ہے اور وہ یہ

ہے کہ ابلیس آدم کو تین طرح کی حرکات کرنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ یہ حرکات درج ذیل ہیں:

(۱) پہلی حرکت: عمودی حرکت: ابلیس آدم و حوا کو باور کراتا ہے کہ انہیں

عمودی حرکت کرنی چاہئے۔ یہ حرکت ان کے لئے نافع ہے اور اس میں فلاں فلاں فوائد ہیں۔ یہ

عمودی حرکت دراصل آدم و حوا کو انفاقی تعلیم و تعلم اور انفاقی عمل سے ہٹا کر اکتشانی تعلیم و تعلم اور

اکتشانی عمل کی طرف منتقل کر دینے کے لئے ہوتی ہے۔

(۲) دوسری حرکت: افقی توسیع: جب آدم و حوا ابلیس کی بات مان کر اور انفاقی

تعلیم و تعلم اور انفاقی عمل کی سطح کو چھوڑ کر اکتشانی تعلیم و تعلم اور اکتشانی عمل کی سطح پر آنے کے لئے

عمودی چھلانگ لگا دیتے ہیں تو وہ پھر انہیں باور کراتا ہے کہ اب انہیں وہیں ٹھہرنا نہیں چاہئے بلکہ

افقی توسیعات کی طرف جانا چاہئے۔ ابلیس کے نزدیک افقی توسیعات کے چار مدارج ہیں چنانچہ

وہ چاہتا ہے کہ آدم و حوا ان چاروں افقی مدارج کو طے کر لیں۔

(۳) تیسری حرکت: عمودی متواتر حرکت: ابلیس کی کوشش ہوتی ہے کہ ایک

عمودی حرکت کے بعد اور اس میں افقی چاروں مدارج طے کر لینے کے بعد آدم و حوا اگلی عمودی

حرکت کریں اور اسی طرح اس کا تواتر برقرار رہے۔

(ب) علمی منہج (Intellectual Approach): ابلیس کا دوسرا منہج علمی منہج ہے اور وہ

یہ ہے کہ ابلیس آدم و حوا کو علمی استفادہ کے پہلے درجے یعنی انفاقی درجے پر برقرار رہنے نہیں دیتا۔

یوں تو انسان کی اپنی انفاقی سطح ہے اور اس سطح پر پہلا درجہ انفاقی استفادہ کا درجہ ہے۔ اسی طرح

انسانوں کے علاوہ دوسروں کے انفاقی سطحوں پر بھی ان کے لئے پہلا درجہ انفاقی استفادہ کا درجہ

ہوتا ہے۔

ابلیس اولا تو انسان کو اس کی انفاقی سطح پر رہنے نہیں دیتا اور اکتشافی باب کھول کر عمودی حرکت پر مجبور کرتا ہے پھر اس سطح کی انفاقی استفادہ کے درجے پر بھی رہنے نہیں دیتا بلکہ ایک افقی توسیع شروع کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اس کے چار درجات ہوتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) درجہ اول: درجہ انفاقی استفادہ: اس درجے میں اس سطح پر جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ترزیق کی ایک صورت ہے ٹھیک اللہ کی رضا کے مطابق اس سے استفادہ کرنا یہی اس کا انفاقی درجہ ہے۔

(۲) درجہ دوم: درجہ معلومات خواص: انفاقی استفادہ پر بس نہ رہتے ہوئے اور درجہ انفاقی استفادہ سے آگے جا کر یہ جاننا کہ اس استفادہ کے پیچھے یعنی اس شے میں جس سے استفادہ کیا گیا ہے کیا خواص ہیں۔

(۳) درجہ سوم: درجہ معلومات و تجربہ: خلق جدید یا درجہ 'سحر': درجہ خواص سے آگے جا کر اس بات کی کوشش کرنا کہ استفادہ کی جانے والی چیزوں کو مصنوعی طور پر خود بنائے جانے کا علم حاصل کیا جائے یعنی انہیں از سر نو خلق کیا جائے۔ یہی درجہ 'سحر' ہے یعنی اس درجہ پر آکر انسان انہیں 'مسخر' کرنے کا علم حاصل کرتا ہے۔

(۴) درجہ چہارم: درجہ تبدیلی سنت: درجہ معلومات و تجربہ: خلق جدید یعنی درجہ 'سحر' کے بعد کا درجہ ہے۔ یہ درجہ ہے انسان کے ذریعہ کسی چیز میں ربانی سنت یعنی سنت اللہ کے بالمقابل اور متوازی اس سے الگ اپنی مصنوعی اور من چاہی ہوئی سنت کا اجراء کرنا۔ چنانچہ کسی سطح پر یہ آخری درجہ ہے۔ جب کسی سطح پر کوئی اس آخری درجے پر پہنچ جاتا ہے تو اس کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ تمام کام جو اللہ رب العالمین کرتا ہے وہ بھی کر سکتا ہے۔ یہی وہ سطح ہے جہاں مخلوق اپنے خدا، رب اور رب العالمین ہونے کا دعویٰ کرنے لگتی ہے۔ ابلیس یہی چاہتا ہے کہ انسان رب العالمین ہونے کا دعویٰ کرے۔ چنانچہ اپنے اپنے زمانے میں جن جن لوگوں نے اللہ کے مقابلے میں رب العالمین ہونے کا دعویٰ کیا وہ سب لوگ ایسے ہی تھے جن کو ابلیس نے اس درجے تک پہنچانے کی کوشش تھی یا کم از کم انہیں باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس قوت کے مالک ہیں کہ جو کچھ رب العالمین کرتا ہے وہ بھی کر سکتے ہیں۔

(ج) ہنری منیج (Technological Approach): ابلیس کا تیسرا منیج ہنری منیج ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ابلیس آدم و حوا کو علم ہنر (Technology) سے آگاہ کرتا ہے اور اس تعلق سے انہیں افقی درجات طے کرنے پر اکساتا یا مجبور کرتا ہے۔ علم ہنر بھی علم طبیعیات کی طرح الجنہ میں صفر کے برابر تھا یا بالکل ناقابل بیان حد تک ابتدائی مرحلے میں یا اندرونی یعنی Inbuilt تھا۔ گویا علم ہنر بھی علم طبیعیات کے مانند ایک فساد کی طرح الجنہ میں پیدا ہوا۔ چنانچہ اس زمین پر انسانی حیات کا آنا اور آدم و حوا کا بسایا جانا اپنے لوازم کے اعتبار سے الجنہ سے قدرے متوسع ہو گئے۔ اس کے درج ذیل دو اسباب خاص ہیں:

(۱) فساد کے مابقیہ کے سبب: اس روئے ارض پر علم ہنر (Technology) کے پیدا ہونے اور کسی درجے میں اس سے استفادہ کی اجازت دئے جانے کی بنیادی وجہ یہ ہوئی کہ الجنہ میں ابلیس کے اکسانے اور آدم و حوا کے گناہ کرنے کے سبب جو فساد پیدا ہوا تھا اس نے آدم و حوا پر بعض مستقل اثرات عارض کر دیئے جو الجنہ سے منتقلی کی صورت میں یہاں زمین پر ان کے ساتھ آ گئے اس لئے کہ اب تک وہ آدم و حوا کے جزو لازم بن چکے تھے۔ الجنہ میں کوئی ہنر (Technology) نہیں تھا۔ اس لئے کہ اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ چونکہ الجنہ میں ہنر یا ٹکنالوجی کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی اس لئے وہاں ابتداء میں جوارح نہیں پائے جاتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ الجنہ میں آدم و حوا کے اس زمین میں واقع صورتحال سے مختلف نہ ہاتھ تھے نہ پاؤں، نہ ناک تھی نہ کان، نہ آنکھیں تھیں نہ منہ، نہ مردانہ شرمگاہیں تھیں نہ زنانہ۔ ان متصل جوارح کے نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہاں ان کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کھانے کی ضرورت ہو تو جا کر لانے کے لئے پاؤں، دیکھ کر کھانا اٹھانے کے لئے آنکھیں اور ہاتھ، چبانے کے لئے دانت اور زبان چاہئیں۔ اگر کسی چیز کی خواہش کرنا ہی اس کے استفادہ کے صورت میں تبدیل ہو جائے تو ان سب کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ لیکن ابلیس نے آدم و حوا کو خطا کار بنایا اور انہوں نے پہلے موٹھی اقدامات کئے پھر عملی اقدامات جس کے نتیجے میں الجنہ میں علم طبیعیات کا ظہور ہوا اور پھر جب انہوں نے عملی اقدامات کر لئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے جسم میں بیک وقت کئی جوارح پیدا ہو گئے جو الجنہ میں ہنر کا پہلا ظہور تھا۔ بالکل ابتداء میں پیدا ہونے والے جوارح آنکھ، ناک، منہ، اعضاء تناسل، مقام براز و اعضاء تنفس، اعضاء دوران خون، اعضاء ہضم، اعضاء حیض

واحتلام، اور اعضاء تولید تھے۔ چنانچہ اس گناہ کے بعد الجنہ کی دنیا ہی بدل گئی۔ اب دیکھنے کی ضرورت پڑنے لگی اور نظر آنے والی چیز پر شرم آنے لگی، اب پیشاب کرنے، رفع حاجت کرنے، سانس لینے، کھانے پینے کی ضرورت پیش آنے لگی۔ اور یہ ظاہر ہو جانے والے جوارح مستقلاً بروئے کار آنے لگے۔ چنانچہ جب اس صورت میں الجنہ کا سارا نظام درہم برہم ہونے لگا تو آدم و حوا کو الجنہ سے منتقل ہو جانے کو کہا گیا۔ لہذا حب آدم و حوا اس روئے ارض پر منتقل ہوئے تو یہ جوارح جواب ان دونوں کے جزو بدن اور جزو لازم بن چکے تھے ان کے ساتھ یہاں آگئے۔ یہ زمین چونکہ الجنہ کی طرح لطیف نہیں تھی اس لئے رفتہ رفتہ دونوں یعنی روئے ارض اور آدم و حوا کے جوارح باہم ہم آہنگ (Accultured & Acclimatized) ہونے لگے۔ اس طرح اس روئے ارض پر انسانی زندگی الجنہ سے مختلف ہو گئی جس میں کسی حد تک جوارح کے استعمال کو 'جائز' ٹھہرا دیا گیا اور اس طرح ایک حد تک بالکل ابتدائی درجے میں علم طبیعیات (Physical Science) اور علم ہنر (Technology) 'جائز' قرار پائے۔

(۲) زمین اور روئے ارض کی کثافت : یہ زمین اور روئے ارض ابتداً آدم و حوا کے لئے نہیں بنائی گئی تھیں اس لئے جب اس کی ضرورت آن پڑی تو اللہ تعالیٰ نے اس ارض کو آدم و حوا کے لئے 'سخر' فرمادیا۔ اور اب یہ زمین آدم و حوا کے لئے مسخر کر دی گئی تھی۔ زمین الجنہ کے مقابلے میں طبعی لوازم سے زیادہ پریشی اس لئے یہاں اس 'سنت' کے مطابق آدم و حوا کی زندگی نہیں گزر سکتی تھی جیسی الجنہ میں تھی۔ چنانچہ یہاں طبیعیات اور ہنر سے استفادہ کی ایک حد کو جائز ٹھہرا دیا گیا۔

اس روئے زمین پر ابلیس کے ہنری منہج (Technological Approach) میں سابق منہج کی طرح ہی چار درجات ہیں۔ اور ابلیس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ بنی آدم کو اس افقی سطح پر انفاقی درجے یعنی اول درجے پر برقرار نہ رہے دے اور اسے مہمیز کرے تاکہ وہ دوسرے، تیسرے، یہاں تک کہ چوتھے درجے پر پہنچ جائے۔ یہ چوتھا درجہ ہی وہ درجہ ہے جہاں ہنری طور پر پہنچ کر انسان سمجھنے لگتا ہے کہ وہ رب العالمین ہو گیا ہے چنانچہ وہ عملاً اس کا اظہار کرنا شروع کر دیتا ہے اور یہی ابلیس کا مقصد اور منشاء ہے۔ علم ہنر (Technology) کے یہ چاروں مدارج درج ذیل ہیں:

(۱) درجہ اول: درجہ انفاقی استفادہ: درجہ جارحہ: درجہ جارحہ روئے ارض پر ہنر کا انفاقی درجہ ہے۔ یہی پہلا درجہ ہے۔ اس سے آگے تجاوز کرنا انسان کے لئے مضرت رساں بلکہ مہلک اور اس کے مقصد سے دور لے جانے والا ہے۔ لیکن ابلیس کی پوری پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ انسان کو اس درجہ جارحہ پر بس نہ کرنے پر مجبور کرے اور اسے اکسائے اور مہمیز کرے کہ وہ اگلے درجات کو بھی طے کرے۔ درجہ جارحہ وہ درجہ ہے جسے علم ہنر (Technology) میں پہلا درجہ کہا جاتا ہے اس درجہ میں انسان زیست اور مقاصد حیات کی تکمیل کے لئے صرف جارحہ یعنی Tool سے کام لیتا ہے اس لئے اس مرحلہ کو مرحلہ یا درجہ جارحہ (The Stage of Tool) کہا جاسکتا ہے۔

(۲) درجہ دوم: درجہ آلہ: روئے زمین چونکہ کثیف ہے اور طبیعیات یہاں کے لوازم لہذا اللہ تعالیٰ نے درجہ جارحہ — جو اگرچہ بنی آدم کے لئے روئے ارض پر ہنر کا انفاقی درجہ ہے اور وہی نفع اور احسن ہے — سے آگے جا کر بھی استفادہ کرنے کو جائز قرار دیا۔ دوسرا درجہ یعنی درجہ آلہ اگرچہ جائز قرار پایا اور اس درجے پر رہنا اور اس سے استفادہ کرنا اگرچہ معصیت قرار نہیں پایا لیکن ان سب کے باوجود یہ درجہ بنی نوع آدم کے لئے مناسب درجہ نہیں تھا۔ چنانچہ احسن اور مقصد برآری میں زیادہ نافع وہی درجہ باقی رہا جو درجہ اول یعنی درجہ جارحہ تھا۔ علم ہنر (Technology) میں اس دوسرے درجہ یعنی درجہ آلہ کو (The Stage of Instrument) کہتے ہیں۔ اس درجہ میں انسان جارحہ سے آگے جا کر آلہ ایجاد کرتا ہے۔ اور شیطان مزید سے مزید آلات ایجاد کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ چونکہ اس تعلق سے ابلیس کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ انسان کو درجہ جارحہ پر باقی نہ رہنے دے اور اسے مہمیز کر کے درجہ آلہ پر لے آئے بلکہ اس میں بھی آخری حد تک لے جائے۔

(۳) درجہ سوم: درجہ کل: علم ہنر (Technology) کا یہ تیسرا درجہ ہے۔ اگرچہ عند اللہ معیار مطلوب اور انفاقی درجہ ہنر پہلا ہی درجہ ہے اور دوسرا درجہ صرف 'جائز' قرار دیا گیا ہے لیکن ابلیس کی کوشش یہی رہتی ہے کہ وہ انسان کو اس 'جائز' کے درجہ پر بھی بس کرنے کی اجازت نہ دے۔ چنانچہ وہ انسان کو گمراہ کرتا ہے اور آگے بڑھا کر تیسرے درجہ میں داخل کرتا ہے۔ یہ درجہ درجہ کل یعنی (The Stage of Machine) ہے۔ اس درجہ میں انسان

جارحہ اور آلہ جات سے آگے جا کر باضابطہ کل یعنی مشین ایجاد کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ اس سے استفادہ کرتا ہے۔ ابلیس اسے مزید سے مزید کل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مشین ایجاد کرنے اور اس سے استفادہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

(۴) درجہ چہارم: درجہ مکلفہ: علم ہنر (Technology) کا یہ چوتھا درجہ ہے۔ یہ ابلیس کے نزدیک معیار مطلوب کا درجہ ہے اس درجہ پر آکر انسان علم ہنر (Technology) کے ذریعہ 'سنت اللہ' کو بدلنے اور اس کی جگہ دوسری سنت رائج کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس کوشش میں اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ رب العالمین ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ اس کا دعویٰ بھی کر دیتا ہے کہ وہ رب العالمین ہے۔ اس درجہ کو درجہ مکلفہ (The Stage of Automaton) کہتے ہیں۔ چنانچہ اس درجہ میں انسان پیچیدہ مشین سے آگے جا کر ایسی مشین ایجاد کرتا ہے جس کے اندر ایک مکمل 'پروگرام' (Program) ہو یعنی اسے خود کاری (Automation) والا بناتا ہے اور زیادہ سے زیادہ اس سے استفادہ کی کوشش کرتا ہے۔ کسی 'مخلوق' میں یہ درجہ درجہ تکلیف ہے یعنی وہ مخلوق مکلف بنائی گئی ہے۔ لہذا پروگرامنگ (Programming) تکلیف یعنی مکلف بنانا ہے۔ یہی انسان کا درجہ ہے۔ انسان کو اللہ نے مکلف بنایا ہے۔ انسان ایک مکلفہ یعنی (Automaton) ہے۔ جب انسان خود مکلفہ بنانے لگے تو وہ خود کو رب العالمین سمجھنے لگتا ہے۔ ابلیس انسان کو اسی درجہ تک لانا چاہتا ہے تاکہ وہ یہاں آکر خدا سے کلیتہاً بغاوت اور اس کی ہم ساری کرے۔ یہی نمرود اور فرعون نے کیا تھا۔ آج کا مغربی عہد ابلیس کے ذریعہ اسی جگہ لا دیا گیا ہے۔

۳۔ روئے ارض میں انفاقی صورتحال:

(الف) سحر علم: اللہ تعالیٰ 'العلیم' ہے۔ سارا علم اور اس کی ساری وسعت کا وہ سرچشمہ ہے۔ علم اس کی صفت ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تکوین اور مخلوقات کی تخلیق فرمائی تو اسے ایسی 'ہدایت' سے نوازا جو اس کے لئے کافی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

سبح اسم ربک الاعلیٰ الذی خلق فسوی والذی قدر فہدی (الاعلیٰ ۳-۱)

ترجمہ: پاکی بیان کراپنے رب کے نام سے جو الاعلیٰ ہے جس نے بنایا پھر درست کیا اور جس نے ٹھیرا دیا اور پھر ہدایت کی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم قدیم کی تخلیق فرمائی تو آپ کو 'علم' عطا فرمایا۔ اللہ کا ارشاد

ہے:

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (البقرہ ۳۱)

ترجمہ: اور سکھایا آدم کو نام سارے

پھر جب روئے ارض پر انسان بسایا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے یہاں کے مطابق 'علم' عطا فرمایا۔ یہ علم روئے ارض پر منصوبہ ربانی کی تکمیل میں انسان کو کفایت کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَم (العلق ۵)

ترجمہ: سکھایا انسان کو جو وہ نہیں جانتا تھا۔

یہ 'علم' ہی روئے ارض پر سطر 'علم' ہے جو اللہ رب العزت کی طرف سے انعام فرمایا گیا۔ اس 'علم' میں تین علوم شامل ہیں جو کئی طرح سے انسانوں کے مابین منتقل ہوتے رہے ہیں۔ انتقال علم کے یہ ذرائع درج ذیل ہیں:

Genetically

(۱) جینیاتی طور پر

Socially

(۲) معاشرتی طور پر

Individually

(۳) انفرادی طور پر

انفرادی طور پر انتقال علم کا واحد ذریعہ سیکھنا (Learning) ہے۔ یہ سیکھنا کئی ذرائع سے ہو سکتا ہے۔

مذکورہ تین طرح کے علوم جو رب العالمین کی طرف سے دو بیعت کئے گئے درج ذیل ہیں:

(۱) علم محسوسات (Knowledge Through Senses)۔ ان میں وہ سارے علوم شامل ہیں جن کے حصول کا ذریعہ جوارح محسوسات ہیں۔

یعنی (۱) بصرہ (۲) ذائقہ (۳) لامہ (۴) شامہ (۵) سامعہ

(۲) علم مدركہ (Knowledge Through Mind): اس میں وہ سارے علوم شامل ہیں جن کے حصول کا ذریعہ قوت مدركہ یعنی عقل ہے۔ علم مدركہ وہ علم ہے جسے جوارح محسوسات گرفت نہیں کر سکتے۔

(۳) علم غیب (Knowledge Through Revelation): وہ سارے علوم

غیب ہیں جن کا محسوسات اور مدرکہ احاطہ نہیں کر سکتے۔ یہ علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے (۱) براہ راست (۲) ملائکہ کے ذریعہ (۳) اور انبیاء کے ذریعہ انسان تک پہنچتے ہیں۔

یہ تینوں قسم کے علوم 'علم' کہلاتے ہیں اور ان سب کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے لیکن ان میں باہم فرق ہے۔ علم محسوسات اور علم مدرکہ ظنی علوم ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ودیعت اور اخذ کے مابین طبائع اور صلاحیتوں کے فرق سے ان کا یقینی ہونا مشکوک ہو جاتا ہے اس لئے یہ ظنی قرار پاتے ہیں۔ جبکہ علم غیب جسے علم الوہی بھی کہتے ہیں یقینی علم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان تینوں علوم کے تعلق سے درجہ اول کو انفاقی درجہ قرار دیا ہے جو انسان کے لئے کافی ہے۔ بلاشبہ اس سطح پر رسوخ فی العلم کے لئے افقی توسیع کی پوری غیبت موجود رہتی ہے۔ ہر چند کہ جس کی ضرورت عام حالات میں قطعاً پیش نہیں آتی۔

(ب) سحر ہنر: جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس روئے ارض کی مخصوص صورتحال کے پیش نظر انسان کے لئے سحر ہنر کی بھی اجازت دی ہے۔ ہنر سے استفادہ کے لئے معیار مطلوب یعنی انفاقی درجہ بہر حال درجہ اول یعنی درجہ جارحہ ہی ہے لیکن مخصوص صورتحال میں درجہ آلہ کو بھی 'جائز' قرار دیا گیا ہے۔ جہاں تک درجہ سوم اور درجہ چہارم یعنی درجہ کل اور درجہ مکلفہ کی بات ہے تو وہ موبقات و ہلکات بلکہ کھلی کھلی ہلاکت ہیں۔

(ج) سحر عمل: اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے 'سحر عمل' فرمایا ہے یعنی عمل کرنا ممکن بنا دیا ہے۔ تاہم روئے ارض پر 'عمل' الجہنہ کے مقابلے میں بہت وسیع ہو گیا ہے جو یقیناً سخت آزمائش ہے۔ سحر عمل کے انفاقی درجہ میں چار امور داخل ہیں۔

(۱) عبادت: عبادت فی الواقع 'اقامت ملک اللہ' ہے۔ یعنی اقامت صلوٰۃ سے لیکر اقامت جہاد تک۔

(۲) تناسل: ملک اللہ کے لئے صالح اولاد دینا اور روئے ارض پر آدم کے بسائے جانے کی مدت پوری کرنے کے لئے نسل آدم کو جاری رکھنا تناسل ہے۔

(۳) استرزاق: استرزاق سے مراد روئے ارض پر رزق حاصل کرنا ہے۔ روئے ارض پر استرزاق کا معیار مطلوب تو کلی توکل علی اللہ ہے۔ تاہم جائز درجات میں علی الترتیب (۱) تجارت

(۲) زراعت (۳) اور صناعت ہیں۔

(۴) تعمیر: تعمیر سے اصلاً مراد تو بسنا اور بسانا ہے لیکن روئے ارض پر تعمیر سے مراد وہ سارے کام ہیں جو اجتماعیت کے لئے ضروری ہیں۔ ان کاموں میں (۱) ذاتی ضروریات کے کام مثلاً اپنے کپڑے دھولینا (۲) تاحلی ضروریات کے کام مثلاً بیوی بچوں کی ضروریات پوری کر دینا (۳) قراہتی ضروریات کے کام مثلاً رشتہ داروں، پڑوسیوں، ضعیفوں کے کام کر دینا (۴) ملی ضروریات کے کام مثلاً حاجتمند مسلمین و مسلمات کی مدد کرنا (۵) اور انسانی ضروریات کے کام یعنی انسانی رشتوں کے حوالے سے لوگوں کی مدد کرنا۔

(د) سحر عمل کی اصولیات: روئے ارض پر حیات انسانی کے پانچ اصولیات ہیں اور ہر اصل کے تحت، نعمت، حقوق اور فرائض ہیں۔ یہ پانچ اصولیات درج ذیل ہیں:

(۱) مستقر: اللہ تعالیٰ نے اس روئے ارض کو بنی نوع آدم کے لئے مستقر قرار دیا لہذا اس نے اس روئے ارض کو انسانوں کے رہنے کے قابل (Sustainable) بنایا۔ اگر انسان انفاقی طور پر اس سے استفادہ کرے تو یہ مدت موعودہ تک قابل برداشت رہے گی۔

(۲) متاع: اللہ تعالیٰ نے انسانی حیات کے لئے زمین میں متاع رکھی ہے جو اس کے لئے اس مدت کے لئے کافی ہے جس دوران بنی نوع انسان کو اس پر رہنا ہے۔ اگر انسان انفاقی طور پر متاع حاصل کرے اور اس سے استفادہ کرے تو یہ متاع اس پوری مدت کے لئے کافی ہوگی۔

(۳) حیات: اللہ تعالیٰ نے ایک خاص مدت تک یہاں بنی آدم کے لئے زندہ رہنا مقدر فرما رکھا ہے لہذا اس میں سنت بناسل کا اجراء فرمادیا گیا۔ یہ تناسل انفاقی سطح اور انفاقی درجہ میں ہر اعتبار سے روئے ارض کے لئے نعمت ہے۔ اور نہ یہ کبھی مسئلہ بن سکتا ہے نہ بوجھ۔ اس تناسل کے تحت انسانوں کا پیدا ہونا اور مرنا جاری رہتا ہے۔

(۴) رزق: مستقر، متاع اور حیات کی طرح رزق بھی اللہ کا ایک فضل ہے۔ ابتداء آفرینش سے آج تک کس فرد بشر نے روئے ارض پر اپنے مستقر، متاع اور حیات کے لئے جدوجہد، محنت اور کسب کیا ہے؟ لہذا رزق بھی اسی طرح بغیر جدوجہد، محنت اور کسب کے دی جانے والی چیز ہے۔ چونکہ انسان اس معیار مطلوب پر عموماً قائم نہیں اس لئے اسے کسب کی ضرورت آن پڑی ہے۔ یا اس نے کسب کو اپنی ضرورت بنالیا ہے۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون ما اريد منهم من رزق وما اريد

ان يطعمون ان الله هو الرزاق ذو القوة المتين (الذاریات ۵۸-۵۶)
ترجمہ: اور میں نے جو بنائے جن اور آدمی سوا اپنی بندگی کو میں نہیں چاہتا ان سے روزینہ اور نہیں
چاہتا کہ مجھ کو کھلائیں۔ اللہ جو ہے وہی ہے روزی دینے والا زور آور مضبوط۔

کون اس کی گواہی نہیں دے سکتا کہ روزانہ اربوں بلکہ کھربوں نباتات، چرند، پرند،
درند اور حشرات الارض، اور سمندر کی لاتعداد مچھلیوں کو اللہ رب العزت بغیر جدوجہد، بغیر محنت اور
بغیر کسب کے کھلاتا اور پلاتا ہے اور سب سیر ہو کر کھاتے ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ چند ارب انسانوں کو بغیر
جدوجہد، بغیر محنت اور بغیر کسب کے کھلانے پر قادر نہیں؟ ایسا قطعاً نہیں بلکہ اصلی حقیقت یہ ہے کہ
نباتات، چرند و پرند، درند و حشرات الارض اور مچھلیاں اپنی اپنی سطحوں پر جس معیار مطلوب پر ہیں
انسان اس پر نہیں ہے۔ اس لئے روئے ارض پر بنی آدم کا اصل انفاقی درجہ تو یہی ہے کہ اسے اللہ
تعالیٰ بغیر محنت جدوجہد اور کسب کے کھلائے۔

روئے ارض پر رزق کے حصول میں توسیع کے دو عنوانات ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) 'جائز توسیع': 'جائز توسیع' ایسی توسیع ہے جو مذکورہ وجوہات سے خود رب العلمین کی
طرف سے جائز قرار دی گئی ہو۔

(۲) 'ناجائز توسیع': 'ناجائز توسیع' ایسی توسیع ہے جو دراصل ابلیس کے اتباع میں توسیع
پزیر ہوئی چنانچہ ان میں سے بعض کو شرعی طور پر گوارا کر لیا گیا اور بعض کو علیٰ حالہ ناجائز باقی رکھا
گیا۔ یہ بات واضح رہے کہ 'توسیع' اصول دین اللہ میں اصلاً غیر محمود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض غیر
محمود توسیع کی بھی جواز تملیٰ ہے وہ اس صورت میں ہے کہ انہیں محض 'محازاً' قابل استفادہ قرار
دیا گیا ہے۔ حصول رزق کے لئے حقیقی طور پر غیر محمود مگر جائز توسیعات درج ذیل ہیں:

(۱) تعلم: انفاقی سطح پر یہ ایک توسیع ہے چنانچہ 'جائز' ہے اور اسکی حد صرف مالا بدمنہ یعنی
ناگزیر (Inevitable) ہے۔

(۲) تجربہ (ہنر سیکھنا)۔ انفاقی سطح پر یہ ایک توسیع ہے چنانچہ جائز ہے اور اسکی بھی حد مالا
بدمنہ (Inevitable) ہے۔

(۳) علم ہنر (مددگار چیز بنانا اور اس سے استفادہ کرنا): یہ بھی ایک توسیع ہے جو انفاقی سطح
سے پرے ہے۔ چنانچہ 'جائز' ہے اور اسکی انفاقی سطح درجہ اول یعنی درجہ جارحہ ہے۔ اس تعلق

سے چار توسیعات بنیادی ہیں:

- (۱) آگ بنانا (Making fire) اور اس کے استعمال کو توسیع دینا۔ برائے جسمانی استعمال و طباحت ابتدائی یعنی بدرجہ اول
- (۲) زمین کھودنا (Digging Earth) اور اس کے استعمال کو توسیع دینا۔ برائے کاشت ابتدائی یعنی بدرجہ اول

- (۳) پہیہ بنانا (Making Wheel) اور اس کے استعمال کو توسیع دینا۔ برائے حمل و نقل ابتدائی بدرجہ اول

- (۴) آگہ حرب بنانا (Making Weapon) اور اس کے استعمال کو توسیع دینا۔ برائے حفاظت و دفاع ابتدائی یعنی بدرجہ اول

(۵) عبادت: عبادت تخلیق آدم کا بنیادی سبب ہے۔ مستقر، متاع، حیات اور رزق کی فراہمی رب العالمین نے صرف اسی مقصد کی تکمیل کے لئے کی ہے۔ یہی بنی آدم کا بنیادی وظیفہ اور فرض منصبی ہے۔ الجنہ میں جن دو بنیادی اجزاء پر مشتمل آدم و حوا کا ماڈل تھا اس کا دوسرا جز عمل اسی عبادت سے عبارت تھا۔ یہ بات ظاہر ہے کہ الجنہ میں 'عمل' کی وسعت صفر کے برابر تھی اس لئے مثلاً عمل کا مقام اگر الجنہ میں ایک تھا تو روئے ارض پر اس کا مقام ایک لاکھ ہے۔ اس کا یہ مفہوم قطعاً نہیں کہ عبادت میں توسیع عند اللہ محمود اور مطلوب ہے۔ بلکہ صرف اتنا ہے کہ چونکہ الجنہ کی الطف فضا کے مقابلے میں روئے زمین کی فضا کثیف ہے لہذا جس طرح دیگر امور میں مثلاً مستقر، متاع، حیات اور رزق اور ان کے حصول و استفادہ میں کثافت کے سبب وسعت آگئی اور اس وسعت کو ایک حد تک 'جائز' قرار دیا گیا یہاں بھی ہر چند کہ اسی سبب سے لیکن ایک دوسری بات ہوئی اور وہ یہ ہے کہ الجنہ میں ابتلاء یا تو برائے نام تھی یا سرے سے تھی ہی نہیں لیکن روئے ارض پر اس کے مقابلے میں ابتلاء کو شامل کر دیا گیا۔ اس لئے روئے ارض پر 'عبادت' الجنہ میں مامور عبادت کے مقابلے میں ابتلاء سے پر ہو گئی ہے۔ اس طرح مستقر، متاع، حیات اور رزق میں دی گئی وسعت محض مجازاً وسعت ہے جبکہ عبادت میں توسیع مجازاً وسعت نہیں بلکہ ابتلاء توسیع ہے۔

اس کے بالمقابل مستقر، متاع، حیات اور رزق میں عمودی اور افقی حرکت اور توسیع کی

طرح 'عبادت' میں بھی عمودی اور افقی حرکت اور توسیع ایک ابلیسی عمل ہے۔ بلکہ واقعہ کی حقیقت یہ ہے کہ روئے ارض پر ابلیس کی سب سے بڑی توسیع اور اس کے لئے عمودی اور افقی حرکت عبادت کے ذیل ہی میں ہوئی ہے۔ اور اس کا سبب ظاہر ہے اور وہ یہ کہ عبادت ہی دراصل وظیفہ آدم ہے۔ یہی عبادت وجہ تخلیق ہے۔ اس کی خرابی اور اس میں مفسدہ پیدا کرنا پورے منصوبہ ربانی میں بنیادی اور فیصلہ کن مفسدہ پیدا کرنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ابلیس نے مستقر، متاع، حیات اور رزق اور ان کے حصول و استفادہ میں جو فساد پیدا کیا ہے وہ سب مل کر بھی اس فساد کے برابر نہیں جو عبادت میں پیدا کیا گیا ہے۔

روئے ارض پر 'عبادت' میں توسیع کے تین بنیادی اجزاء ہیں۔ یہی توسیع 'جائز' ہے۔ یہ تین اجزاء درج ذیل ہیں:

(۱) علم: (الف) تعلیم: اس کے تین شعبے ہیں: (۱) تلاوت آیات

(۲) تزکیہ

(۳) تعلیم الکتاب والحکمت

(ب) تعلم: (۱) تلاوت آیات

(۲) تزکیہ

(۳) تعلیم الکتاب والحکمت

اس تعلم کے 'جائز' توسیعات ہیں:

(۱) تعقل (۲) محظر (۳) تدبر (۴) تذکر (۵) تراء

ان توسیعات کی تشریح بے حد تفصیل طلب ہوگی اس لئے ان سے سر دست صرف نظر

کیا جاتا ہے۔ ان شاء اللہ موقدہ بموقدہ حسب ضرورت تشریح آتی جائے گی۔

(۲) عمل: (الف) تعمیل: (۱) اقامت ملک اللہ

(۲) اقامت صلوٰۃ

(۳) اقامت جہاد

(ب) تعمیل: (۱) اقامت ملک اللہ

(۲) اقامت صلوٰۃ

(۳) اقامت جہاد

اصول دین میں 'عبادت' کے تحت تعلیم و تعلم اور تعمیل و عمل کو تین چیزیں منضبط اور مضبوط کرتی ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تعلیم و تعلم اور تعمیل و عمل کا یہ عمل نہ لامتناہی جاری رہے گا نہ اس میں غیر ضروری چیزیں شامل سمجھی جائیں گی نہ اس کی سطح میں تبدیلی ہوگی نہ اس کی غیر ضروری توسیع ہوگی۔ ایسی تمام باتیں، کوششیں، عمل اور رواج جو عبادت کو لامتناہی جاری رکھیں، یا اس میں غیر ضروری چیزیں شامل کر دیں، یا اس کی سطح میں تبدیلی کر دیں یا اس میں غیر ضروری توسیع کر دیں دراصل 'عبادت' میں ایک 'ابلیسی عمل' اور ابلیسی تحریف (Satanic Manipulation) قرار دی جائیں گی۔ چنانچہ اصول دین تین امور پر مشتمل ہیں:

(۱) آیہ محکمہ

(۲) سنۃ قائمہ

(۳) فریضۃ عادلہ

یہی تین امور روئے ارض پر تمام انسانی 'علم و عمل' کو منضبط (regulate) کرنے والے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عن عبد اللہ بن عمر وقال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلثة آية محكمة او سنۃ قائمة او فریضۃ عادلۃ وما کان سوى ذلک فهو فضل (رواہ ابوداؤد وابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اصل تین ہیں: آیہ محکمہ، سنۃ قائمہ اور فریضۃ عادلہ، اور جو کچھ ان کے علاوہ ہے وہ لایعنی ہے۔

اس طرح تعلیم و تعلم اور تعمیل و عمل ہر دو امور میں انفاقی سطح اور انفاقی درجہ یعنی ابتدائی درجہ کے علاوہ جتنی توسیعات ہیں وہ اصلاً نامحمود، ممنوع بلکہ اکثر حرام ہیں۔

اس صورت حال میں تعلیم و تعلم اور تعمیل و عمل کی سطح پر درج ذیل چیزیں عند اللہ اور عند الرسول اصلاً نامحمود، ممنوع بلکہ اکثر حرام ہیں:

(۱) عصری سائنسی اور ٹکنالوجیکل تعلیم (Contemporary Scientific & Technological Knowledge) کا نوے فیصد حصہ جو پڑھایا اور سیکھا جاتا

ہے: عصری تعلیم گاہوں میں بالخصوص مغرب میں اور ان کے تتبع میں بلاد مشرق اور مسلم معاشرے میں سائنسی اور تکنیکی علم کے نام پر جو کچھ پڑھایا اور سیکھا جاتا ہے اس کا نوے سے پچانوے فیصد حصہ اسی نامحود، ممنوع بلکہ اکثر حرام توسیعات کا حصہ ہے۔ روئے ارض پر یہ ایک بہت بڑا فساد اور مقصد خلق آدم کو برباد کرنے والا علم و عمل ہے۔

(۲) عصری مذہبی تعلیم (Contemporary Religious Knowledge) کا نوے فیصد حصہ جو پڑھایا اور سیکھا جاتا ہے۔

روایتی تعلیم گاہوں یعنی اسلامی مدارس، دارالعلوم اور جامعات میں بالخصوص عالم اسلام میں دینی اور مذہبی علم کے نام پر جو کچھ پڑھایا اور سیکھا جاتا ہے اس کا نوے سے پچانوے فیصد حصہ اسی اصلاً نامحود، ممنوع بلکہ اکثر حرام توسیعات کا حصہ ہے۔ یہ سب کچھ دینی علم کے نام پر پڑھایا اور پڑھا جاتا ہے جب کہ اس کا نوے فیصد سے زائد حصہ اس علم پر مبنی ہے جو دینی ہے ہی نہیں بلکہ دین مخالف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حصہ دین کے نام پر دراصل اس مذہبی علم کا حصہ ہے جو دین اللہ میں تحریف اور توسیع کی فساد انگیزی کے ذریعہ رائج کیا گیا ہے۔ چنانچہ امت مسلمہ کی موجودہ صورتحال یہ ہے کہ ان کے یہاں دینی علم یعنی آیت محکمہ، سنت قائمہ اور فریضہ عادلہ کا پچانوے فیصد حصہ پڑھایا ہی نہیں جاتا۔ اور جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کا پچانوے فیصد حصہ آیت محکمہ، سنت قائمہ اور فریضہ عادلہ کی نفی کرنے والا بلکہ عملاً ان کو منہدم کرنے والا ہے۔ ظاہر ہے جس معاشرے میں دین اللہ کے نام پر یہی پڑھایا اور پڑھا جائے گا جو اس وقت پڑھایا اور پڑھا جاتا ہے تو اس معاشرے میں دین اللہ اس کا متقاضی رہے گا کہ اللہ محض اپنے فضل خاص سے ہر صدی کے سرے پر ایک ایسا بطل جلیل پیدا کرے جو اس دور ان مردہ بنادیئے جانے والے دین کو پھر تازہ کر دے۔ حدیث کے الفاظ من یجد دلہا دینہا 'تو بہر حال ابتدائی احوال ہیں وگرنہ اس دین کی مسلم معاشرہ میں وہ حالت بنادی جائے گی جسے حدیث تسبیح و کسب ابداء کہتی ہے۔ اجنبیوں کی طرح وہی چیز عود کرتی ہے جو معاشرہ میں اجنبی اور معدوم ہو چکی ہوتی ہے۔

(۳) عصری روحانی تعلیم و تعلم اور تعمیل و عمل یعنی (Contemporary Spiritual

Knowledge & observance) عالم اسلام میں عصری روایتی روحانی تعلیم و تعلم اور تعمیل و عمل کے تحت جو کچھ قائم ہے اس کا پچانوے فیصد حصہ اسی اصلاً نامحود، ممنوع بلکہ اکثر حرام

توسیعات کا حصہ ہے۔ مسلم معاشرے میں یہ سارے روحانی امور دین اللہ کے نام پر جاری ہیں۔ انہیں سیکھا اور سکھایا جاتا ہے، ان کا استعمال کیا جاتا ہے اور ان کے حاملین کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور دینی اعتبار سے بلند مقام دیا جاتا ہے عہد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد انہیں ہی 'اولیاء اللہ' سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے اور انہیں قرآن و سنت رسول اللہ کے لئے اجنبی اور نامانوس مناصب و مدارج پر سرفراز فرمایا جاتا ہے۔۔۔ جب کہ ان امور کا پچانوے فیصد حصہ 'دینی علم' سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا اور نہ عند اللہ و عند الرسول ان کا کوئی مقام ہے۔ ان امور کا پچانوے فیصد دراصل نامحمود، ممنوع اور اکثر حرام ہے اور ان توسیعات پر مشتمل ہے جو آیہ محکمہ، سنہ قائمہ اور فریضہ عادلہ کے خلاف ہی نہیں بلکہ انہیں اور پورے دین اللہ کو ڈھانپنے والی ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ یہ ساری توسیعات خواہ وہ (۱) عصری سائنس و ٹکنالوجی کی تعلیم و تعلم اور تعمیل و عمل کی توسیعات ہوں یا (۲) عصری مذہبی علوم کی تعلیم و تعلم اور تعمیل و عمل کی یا (۳) عصری روایتی روحانی علوم کی تعلیم و تعلم اور تعمیل و عمل کی۔ سب کا مبلغ اور منبع اور محرک ابلیس ہے۔ ان کا اللہ تعالیٰ کی سنت اس کے ہدیٰ، اللہ، اس کے انبیاء و رسل اور ان کی سنت سے کوئی تعلق نہیں۔

دین اللہ روئے ارض پر:

- (۱) صالح علم کو فروغ دیتا ہے اس لئے وہ انفاقی علم کو فروغ دیتا ہے،
- (۲) صالح ہنر کو فروغ دیتا ہے اس لئے وہ انفاقی ہنر کو فروغ دیتا ہے،
- (۳) صالح عمل کو فروغ دیتا ہے اس لئے وہ انفاقی عمل کو فروغ دیتا ہے تاکہ
- (۴) صالح نتیجہ برآمد ہو۔ صالح نتیجہ ہی بنی نوع آدم کی کامیابی کی ضمانت اور

منصوبہ ربانی کی تکمیل کا زینہ ہے۔

اس لئے دین اللہ میں:

- (۱) مثالی علم (سائنس) وہ ہے جو درج ذیل باتیں متعین طور پر بتاتا ہے:

(۱) حقیقت کا علم

(۲) مقصد کا علم

(۳) تعمیل کا علم اور

- (۳) کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے یعنی حلال و حرام کا علم
- (۲) مثالی ہنر (ٹکنالوجی) وہ ہے جو درج ذیل امور میں احسن طور پر (optimally) معاون ہو:

- (۱) حقیقت تک پہنچنے میں
 - (۲) مقصد کے حصول میں
 - (۳) تعمیل کے پورا کرنے میں اور
 - (۴) کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے یعنی حلال و حرام کی رعایت کرنے میں
- (۳) مثالی عمل (observance) وہ ہے جو درج ذیل امور میں احسن طور پر (optimally) منج ہو:

- (۱) حقیقت تک پہنچنے پر
 - (۲) مقصد کے حصول پر
 - (۳) تعمیل کے پورا کرنے پر
 - (۴) کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے یعنی حلال و حرام کی رعایت کرنے پر
- (۴) سنت اللہ اور سنت الانبیاء:

(الف) سنت اللہ: روئے ارض پر سنت اللہ کیا ہے؟ یہ ایک بنیادی سوال ہے جس کو سمجھے بغیر 'دین اللہ' کا فہم ممکن ہی نہیں۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ: روئے ارض پر سنت اللہ 'عادیۃ اللہ' ہے۔ جس میں سنت اللہ اول و دوم دونوں شامل ہیں اور 'سخر' یعنی انسانوں کے مطابق اسے بنایا جانا اور اس سے استفادہ کے لئے انسان کو باختیار کرنا پر قائم نظام ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ روئے ارض پر سنت اللہ کے دو وجوہ ہیں جن میں پہلی وجہ 'عادیۃ اللہ' ہے اور دوسری وجہ 'تسخیر لئلا انسان' ہے۔ 'تسخیر لئلا انسان' محض ایک عمل نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے یونہی کر دیا ہو بلکہ اس میں ایک 'مقصدیت' ہے جو منصوبہ ربانی کی تکمیل کا اظہار ہے۔ اس طرح روئے ارض پر سنت اللہ 'عادیۃ اللہ'، 'تسخیر لئلا انسان' اور 'منصوبہ ربانی' کے مجموعی نظام کو کہتے ہیں۔

(ب) سنت الانبیاء:

اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت یعنی 'سنت اللہ' کی تعلیم کے لئے وحی کا نزول فرمایا اور اسکے ذریعہ اس نے 'ہدی' کا نظم فرمایا۔ یہی وہ فضل خاص ہے جس کا حضرات آدم و حوا سے اس وقت وعدہ فرمایا گیا تھا جب روئے ارض پر انہیں بسایا جا رہا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

فاما ياتينكم مني هدى (البقرہ ۳۸)

ترجمہ: پس جب تمہارے پاس آئے میری طرف سے ہدی

یہ 'ہدی' دراصل وہ چیز ہے جو وقت نزول روئے ارض پر 'سنت اللہ' کی پوری تفصیل اور اس کی اس عہد خاص میں پوری تطبیق سے باخبر کرتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ بنیادی ہدی کے ایک ہوتے ہوئے بھی اس میں اس عہد کی تطبیق شامل ہوتی تھی جس کی وجہ سے ایک عہد کی کتاب دوسرے عہد میں اپنی اصل میں ایک ہوتے ہوئے بھی ناقابل عمل ہو جاتی تھی۔ اس عصر کی حقیقی زمینی صورتحال اور تطبیق کا اضافی حصہ ایک اور چیز کی ضرورت کو لازم کرتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس ضرورت کی تکمیل فرمادی۔ اور وہ ضرورت تھی سنت کی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو مبعوث فرمایا جو سنت لے کر تشریف لائے۔

سنت الرسول کیا ہے؟

سنت الرسول یا سنت رسول 'سنت اللہ' کی تطبیق کی تعمیل ہے۔ لیکن اس سے کیا مراد ہے؟ اور اس کی تفصیل کیا ہے؟ چنانچہ ان سوالات کے جواب کو اس طرح مختص کیا جاسکتا ہے:

(۱) سنت رسول.... 'سنت اللہ' یعنی 'عادة اللہ'، 'سنیہ لہا انسان' اور 'مقصد و منصوبہ ربانی' کے عین مطابق اور ان کی ہر جگہ رعایت کرتی ہوئی کسی عہد میں اور اس عہد کیلئے وہ تعمیلی نتیجہ ہے جس کے لئے رسول کی بعثت ہوتی ہے۔

(۲) سنت رسول.... مثالی علم پر قائم اور اس کی پوری رعایت کرتی ہوئی تعلیم و تعمیل ہے یعنی سنت رسول انفاقی علم، اس کی انفاقی سطح اور اس کے انفاقی درجہ پر قائم اور ان سب کی پوری رعایت کرتی ہوئی تعلیم و تعمیل ہے۔

(۳) سنت رسول.... مثالی ہنر پر قائم اور اس کی پوری رعایت کرتی ہوئی تعلیم و تعمیل ہے یعنی سنت رسول انفاقی علم، اس کی انفاقی سطح اور اس کے انفاقی درجہ پر قائم اور ان سب کی پوری رعایت کرتی ہوئی تعلیم و تعمیل ہے۔

(۴) سنت رسول.... مثالی عمل پر قائم اور اس کی پوری پوری رعایت کرتی ہوئی تعلیم و تعمیل ہے۔ یعنی سنت رسول انفاقی علم، اس کی انفاقی سطح اور اس کے انفاقی درجہ پر قائم اور ان سب کی پوری پوری رعایت کرتی ہوئی تعلیم و تعمیل ہے۔

(۵) سنت رسول.... دین اللہ کے بنیادی اصول پر قائم بنی نوع آدم کی انفرادی، اجتماعی اور نوعی حیات کی مقصدیت کی پوری پوری رعایت کرتی ہوئی تعلیم و تعمیل ہے۔ یعنی اس میں:

(الف) مستقر کی سطح پر یعنی روئے ارض پر بسنے کے تعلق سے انفرادی، اجتماعی اور نوعی طور پر اصول دین کی پوری پوری رعایت اور اسکی تعلیم و تعمیل ملتی ہے۔

(ب) متاع کی سطح پر یعنی روئے ارض پر جینے اور مقصد حیات پورا کرنے کے لئے اس سے استفادہ کے تعلق سے انفرادی، اجتماعی اور نوعی طور پر اصول دین کی پوری پوری رعایت اور اسکی تعلیم و تعمیل ملتی ہے۔

(ج) حیات کی سطح پر یعنی روئے ارض پر پیدا ہونے، زندہ رہنے، روئے ارض پر حیات کو باقی رکھنے اور مقصد حیات کو پورا کرتے ہوئے مرجانے کے تعلق سے انفرادی، اجتماعی اور نوعی طور پر اصول دین کی پوری پوری رعایت اور اس کی تعلیم و تعمیل ملتی ہے۔

(د) رزق کی سطح پر یعنی روئے ارض پر زندہ رہنے اور مقصد حیات کو پورا کرنے کے تعلق سے انفرادی، اجتماعی اور نوعی طور پر اصول دین کی پوری پوری رعایت اور اس کی تعلیم و تعمیل ملتی ہے۔

(ه) عبادت کی سطح پر یعنی روئے ارض پر اس بنیادی فریضے کی تکمیل کے لئے جس کے لئے مستقر، متاع، حیات، اور رزق کا نظم کیا گیا.... انفرادی، اجتماعی اور نوعی طور پر اصول دین کی پوری پوری رعایت اور اس کی تعلیم و تعمیل ملتی ہے۔

(۶) سنت رسول..... مقصد تخلیق آدم یعنی 'عبادت' کی 'ذیلی' اور 'کلی' اور اجمالی اور تفصیلی ہر توازن کو برقرار رکھتی ہوئی اور ان کی پوری رعایت کرتی ہوئی تعلیم و تعمیل کرتی ہے۔

(ج) سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مراد وہ 'سنت نبوی' ہے جسے نبی آخر الزماں، خاتم النبیین، ختم الرسل، عاقب، حاشر، شفیع، شہید اور محمود نے عرصہ ختم زماں میں روئے ارض پر قائم فرمایا۔ یہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم 'سنت اللہ' کے عین مطابق اور سنت

الانبياء کی جامع اور سب کی خاتم ہے۔

(د) سنت خلفاء راشدین مہدیہین: سنت خلفاء راشدین مہدیہین سے مراد صرف چار خلفاء راشدین کی سنت نہیں بلکہ سنت صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور سنت عدول من کل خلف بھی ہیں۔ جس طرح سنت الانبياء اور بالخصوص سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سنت اللہ پر پوری طرح قائم اور اس کی پوری پوری رعایت کرتی ہے اسی طرح سنت خلفاء راشدین مہدیہین سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر پوری طرح قائم اور اس کی پوری پوری رعایت کرتی ہے۔ سنت خلفاء راشدین مہدیہین بنیادی طور پر سنت صحابہ ہے۔ اور اسی سے متعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما انا عليه واصحابي

(جس پر میں اور میرے ساتھی ہیں)

اور یہی وہ سنت ہے جس کے تعلق سے اس بات کی گواہی دی گئی:

اصحابي كالنجوم بايهم اقتديتم اهتديتم

ترجمہ: میرے ساتھی ستاروں کے مانند ہیں۔ ان میں جس کی بھی تم اقتداء کرو گے ہدایت یاب ہو گے۔

(ہ)

سنت مومنین:

جس طرح سنت الانبياء اور بالخصوص سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سنت اللہ پر پوری طرح قائم اور اس کی پوری پوری رعایت کرتی ہے اور سنت صحابہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر پوری طرح قائم اور اس کی پوری پوری رعایت کرتی ہے اسی طرح مومنین پر لازم ہے کہ وہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور سنت صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر پوری طرح قائم ہوں اور ان کی پوری پوری رعایت کریں۔ ان پر پوری طرح قائم ہونا اور ان کی پوری رعایت کرنا ہی تمسک بالکتاب والسنہ ہے جسے اعتصام بالکتاب والسنہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہی وہ امر ہے جس پر مداومت کا حکم دیا گیا ہے اور یہی وہ بات ہے جس پر فساد کے وقت عمل کرنا مشکل تر ہو جاتا ہے اور اس وقت مخلصین بھی محسوس کرنے لگتے ہیں کہ گویا ان امور دین پر عمل کرنا تقریباً محال ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من تمسک بسنتی عند فساد امتی فله اجر مائة شهید
 ترجمہ: امت میں عام فساد کے وقت جو میری سنت کو مضبوطی سے پکڑ لے گا اسے سو شہیدوں کا اجر
 ملے گا۔

www.bookstube.net

www.urdutube.net

prepared by M. Aamir Mehmood

www.urdumovies.net

www.asraralam.net

سحر اور تسخیر

’عربی‘ میں ’سحر‘ کے درج ذیل معانی ہیں:

- (۱) مخلوق کا از خود بڑا بننا
 - (۲) مخلوق کا از خود حکمراں بننا، کسی چیز کو قابو میں کرنا، کسی کو اپنے تابع کرنا، کسی کو مغلوب کرنا، کسی کو مرعوب کرنا
 - (۳) مخلوق کا از خود باندھنا، مضبوط کرنا،
 - (۴) مخلوق کا از خود منضبط کرنا
 - (۵) مخلوق کا از خود کسی فرد یا شے کو مضبوط یا قرق کرنا
 - (۶) مخلوق کا از خود کسی کو کسی مخصوص کام میں لگانا
 - (۷) مخلوق کا از خود کسی کو کسی مخصوص کام کے لائق بنانا
 - (۸) مخلوق کا از خود کسی کو کسی مخصوص کام کا حکم دینا
 - (۹) مخلوق کا از خود کسی سے کوئی مخصوص کام لینا
 - (۱۰) مخلوق کا از خود کسی چیز کی تلاش کرنا
 - (۱۱) مخلوق کا از خود کسی چیز کی تفتیش کرنا
 - (۱۲) مخلوق کا از خود کسی چیز کو چاہنا
 - (۱۳) مخلوق کا از خود کسی چیز کا مطالبہ کرنا
 - (۱۴) مخلوق کا از خود کسی انجان زمین، علاقہ، علوم میں گھومنا، پھرنا، مشاہدہ کرنا،
- تجربہ کرنا۔

- (۱) قرآنی استعمالات ’سحر‘ اور ’سحر‘ حقیقت اور نتیجے کے اعتبار سے یکساں اور مبلغ اور صورت حصول کے اعتبار سے بالکل مخالف ہیں۔ ’سحر‘ اور ’سحر‘ دونوں کا تعلق ’سنت اللہ‘ سے ہے لیکن ’سحر‘ سنت اللہ کا اجراء اور استعمال اور ’سحر‘ لہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا عطیہ و اختیار ہے جب کہ ’سحر‘ ’سنت اللہ‘ کی خیانت، چوری اور غصب ہے اور ’سحر‘ اس خیانت کردہ، چوری اور

غصب کردہ شے اور قوت کا خود مختارانہ، باغیانہ، اور دشمنانہ استعمال ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ 'سحر' اور 'سحر' حقیقت اور نتیجے یعنی اثر کے اعتبار سے یکساں ہیں لیکن مبلغ اور صورت حصول کے اعتبار سے بالکل مخالف ہیں۔ یعنی:

(۱) 'سحر' اور 'سحر' دونوں سنت اللہ کا حصہ ہیں۔

(۲) 'سحر' کے تحت وہ امور آتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے مخلوق اور یہاں انسان کے لئے

'سحر' نہ بنایا ہے یعنی اس کے اختیار میں دیا ہے جب کہ 'سحر' وہ امور ہیں جن کو انسان نے از خود اور بغیر اللہ تعالیٰ کے 'مسحر' نہ بنائے ہوئے اور اس کی رضا کے بغیر بلکہ منع کرنے کے باوجود اس پر

اختیار حاصل کر لیا ہے۔ ان دونوں کے مابین وہی فرق ہے جو Merchandise (قابل

فروخت و خرید اشياء) اور Contraband (وہ اشياء جن کا حصول، درآمد، برآمد، خرید و فروخت

ممنوع ہے) کے مابین ہوتا ہے۔ ہر چند کہ دونوں اپنی حقیقت اور اثر میں 'مال' (Good) ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ 'سحر' امر مموہ باطل لاحقیقہ لہ، ولا ثبات،

(سحر ایک ایسا امر ہے جو محض دھوکا اور باطل ہے اور اس کی نہ حقیقت ہے نہ اسے ثبات ہے) وہ

غلط کہتے ہیں۔ ایسا کہنے والے ممکن ہے اس اعتبار سے درست کہتے ہوں کہ وہ اس 'سحر' کو جانتے

ہوں جو ان کے ارد گرد مشہور ہوگا۔ لیکن وہ اس 'سحر' کو جاننے والے قطعاً نہیں ہو سکتے جس کا ذکر

قرآن اور احادیث مبارکہ میں ہے۔ 'سحر' کو بے حقیقت کہنا غلط ہے خواہ کہنے والے امام ابو بکر

بصا ص، ابو اسحاق اسفرائینی، علامہ ابن حزم یا ابو جعفر شافعی جیسے لوگ ہی کیوں نہ ہوں۔

(۳) 'سحر' اور اس میں سنت کی پیروی دراصل سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہے

جو سنت اللہ کی بالعمین پیروی ہے۔ اور یہ عبادت کا افضل ترین درجہ ہے۔ اس کے بالمقابل 'سحر'

اور اس سے استفادہ دراصل سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سنت الانبیاء کو کچل ڈالنا اور اس

کے متوازی اپنی خود مختارانہ، باغیانہ اور دشمنانہ سنت جاری کرنا ہے بلکہ فی الواقع ایسا کرنا سنت

اللہ کو کچل ڈالنا اور اس کے متوازی اپنی خود مختارانہ، باغیانہ اور دشمنانہ سنت جاری کرنا ہے۔

یہی سبب ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تعلق سے ایک اصولی بات

بیان فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اجتنبوا

الموبقات: الشوک باللہ والسحر (بخاری: کتاب الطب)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کی: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: ہلاک کرنے والی چیز سے بچو۔ شرک باللہ اور 'سحر'

شرک باللہ مطلقاً اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں شرک ہے۔ لیکن عموماً اسے اللہ تعالیٰ کی ذات میں شرک کو کہتے ہیں۔ اس شرک کے دو وجوہ ہیں:

(۱) اللہ کے علاوہ کسی ذات کو اللہ کی ذات و صفات میں شریک سمجھنا اور ماننا۔

(۲) خود اپنے آپ کو اللہ کی ذات و صفات میں شریک سمجھنا۔

'سحر' دراصل اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اختیار میں شرک ہے۔ اور اس کے بھی دو وجوہ ہیں:

(۱) ساحر کو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اختیار میں شریک سمجھنا یا ماننا۔

(۲) ساحر کا اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی قدرت و اختیار میں شریک سمجھنا اور ماننا۔

اس لئے غور کیا جائے تو 'سحر' پہلے مرحلے میں یا بادی النظر میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے اختیار میں شرک ہے لیکن بالآخر وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات میں شرک ہو جاتا ہے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی دونوں الموبقات ہیں۔

قرآن میں 'سحر' کے دو استعمالات وارد ہوئے ہیں:

(۱) پہلا استعمال: پہلا استعمال مطلق ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

(الف) قال القوا فلما القوا سحرُوا اعین الناس واسترهبوہم وجاء
وبسحر عظیم (الاعراف ۱۱۶)

ترجمہ: کہا ڈالو۔ پس جب انہوں نے ڈالا مرعوب کر دیا لوگوں کو آنکھوں کے سامنے اور ان کو دہشت زدہ کر دیا اور وہ لائے بڑا 'سحر'۔

یہاں 'سحر' سے مراد اپنی طاقت، قدرت اور ناقابل یقین قوت کا استعمال کر کے کسی اعتبار سے ہو خواہ علمی، عملی، فکری، عقلی، نفسیاتی اور ذہنی طور پر کسی کو مرعوب کر دینا۔ یہ مظاہرہ آنکھوں کے سامنے بھی ہو سکتا ہے اور لوگ اسے ہوتے ہوئے دیکھ بھی سکتے ہیں اور آنکھوں سے پرے بھی جس کا صرف نتیجہ دیکھا جاسکتا ہے۔

(۲) قل من بیدہ ملکوت کل شیء و هو یجیر ولا یجار علیہ ان کنتم

تعلمون . میقولون للہ قل فانی تسحرون (المومنون ۹-۸۸)

ترجمہ: تو کہہ! کس کے ہاتھ میں ہے ملکوت ہر چیز کی اور وہ بچا لیتا ہے اور اس سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ اب بتائیں گے اللہ کو۔ تو کہہ! پھر کہاں تم مرعوب ہو جاتے ہو (اور اسے یعنی غیر اللہ کو قدرت والا سمجھنے لگتے ہو)

ان دونوں جگہ 'سحر' کا مطلق استعمال ہے اور اس کا مفہوم ہے غیر معمولی یا محیر العقول قوت و طاقت کا استعمال کر کے کسی کو مغلوب و مرعوب کر دینا اور اسے باور کرانا کہ اس کا استعمال کرنے والا کس طاقت اور قوت کا ملک ہے۔

(۲) دوسرا استعمال: دوسرا استعمال 'ب' صلہ کے ساتھ ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس سے کوئی چیز، طاقت اور قوت مراد ہے جس کا 'استعمال' اس کیفیت کا مظاہرہ کرتا ہے یا وہ تاثیر پیدا کرتا ہے جس سے کسی کے صاحب طاقت و قدرت ہونے اور صاحب اختیار ہونے کا اظہار ہو۔
(۲) سحر اور تسخیر کا اکتشافی نقطہ نظر: 'سحر' اور 'تسخیر' کا اکتشافی نقطہ نظر انفاقی نقطہ نظر کے بالکل برعکس ہے جس کا کسی قدر اجمالی ذکر ابلیسی طریقہ فساد کے عنوان کے تحت اور دیگر مقامات پر کیا جا چکا ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمایا جائے۔

(۳) روئے ارض پر سحر و تسخیر کی اکتشافی صورتحال: الجنہ کی طرح روئے ارض پر بھی ابلیس نے وہی طریقہ فساد اختیار کیا۔ اس نے اس تعلق سے متعدد السطوح تدابیر اختیار کیں جن کا ذکر مختصر اذیل میں کیا جاتا ہے:

(۱) تحریف مقصد: سب سے پہلے ابلیس نے بنی آدم کے دل میں اسکی تخلیق اور روئے ارض پر اس کے بسائے جانے کے پیچھے اصل مقصد کی تحریف کرنے کی کوشش کی۔ اس نے یا تو بنی آدم کو بھلا دیا کہ روئے ارض پر بسانے اور اس سے پہلے الجنہ میں بسائے جانے اور سب سے پہلے آدم کی تخلیق کئے جانے کے پیچھے کیا ربانی مقاصد تھے جن لوگوں کو وہ مقصد یاد تھا انہیں اس نے شک میں ڈال دیا۔ اس نے ان کے دلوں میں شک ڈال کر عبادت انسانی تخلیق اور روئے ارض پر بسائے جانے کا مقصد نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے اس نے دودلیلیں دیں۔

(۱) وہ صلاحیت جو انسان کے اندر پائی جاتی ہے۔ اس نے ان حیرتناک صلاحیتوں کی یاد دلا کر اسے باور کرایا کہ ان صلاحیتوں کا دیا جانا محض 'عبادت' کے لئے نہیں ہو سکتا۔
(۲) وہ چیزیں اور امکانات جو روئے ارض پر پائی جاتی ہیں۔ ہوا، بادل، پانی،

پھیلے میدان، نباتات، حیوانات، چمکتا سورج، معدنیات وغیرہ۔ اس نے ان حیرتناک چیزوں، امکانات اور صورتحال کی یاد دلا کر اسے باور کرایا کہ ان چیزوں اور امکانات کا دیا جانا محض 'عبادت' کے لئے نہیں ہو سکتا۔ اس طرح ٹھیک الجنہ کی طرح روئے ارض پر بھی انسان سب سے پہلے ربانی مقصد کے تعلق سے 'شک' میں پڑ گیا۔ روئے ارض پر الجنہ کی طرح ہی ابلیس اس امر میں کامیاب ہو گیا جس کا ذکر قرآن نے یوں فرمایا ہے:

فازلھما الشیطن عنہا فاخر جھما مما کانا فیہ (البقرہ ۳۶)

ترجمہ: پھر ہلا دیا ان کو شیطان نے اس سے پھر باہر کر دیا ان کو اس صورتحال سے جس میں وہ تھے۔ یہاں 'ہلا دیا' سے مراد ہے 'مقصد تخلیق' اور 'مقصد ربانی' کے تعلق سے 'شک' میں ڈال دیا۔ انسان کو محسوس ہونے لگا کہ ضرور کوئی اور بات ہے اور یہ بات درست نہیں کہ عبادت مقصد حیات ہے۔ اسی طرح 'مما کانا فیہ' سے الجنہ یا وہ راحت و آرام جو وہاں پایا جاتا تھا مراد نہیں۔ بلکہ اس سے اصلاً وہ ذہنی صورتحال مراد ہے جس کے تحت درج ذیل امور وہاں موجود تھے۔

(۱) انفاقی علم پر اکتفاء کرنا اور صرف اسی سے استفادہ کرنا اور وہ بھی صرف انفاقی درجے پر استفادہ کرنا

(۲) انفاقی عمل پر اکتفاء کرنا اور وہ بھی صرف انفاقی درجے پر اکتفاء کرنا۔ اسی طرح روئے ارض پر بھی ابلیس نے بنی آدم کو 'ہلا دیا' اور اس 'ذہنی صورتحال' سے اسے باہر کر دیا جس کے تحت وہ روئے ارض پر انفاقی عمل پر اکتفاء کرتا تھا۔ صرف اسی سے استفادہ کرتا تھا اور صرف انفاقی درجے پر استفادہ کرتا تھا اسی طرح انفاقی ہنر پر اکتفاء کرتا تھا اور صرف انفاقی درجے پر اس سے استفادہ کرتا تھا اور اسی طرح انفاقی عمل پر اکتفاء کرتا تھا اور صرف انفاقی درجے پر یہ عمل کرتا تھا۔

جب بنی آدم نے ابلیسی تحریک پر یہ باور کر لیا کہ اس کی حیات کا وہ مقصد نہیں جو اللہ بتا رہا ہے تو پھر اس نے اس دائرے سے قدم آگے بڑھائے۔ اور یہی وہ بات ہے جسے قرآن نے 'اصلاح کے بعد فساد' کہا ہے قرآن کا ارشاد ہے:

ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا (الاعراف ۵۶)

ترجمہ: اور فساد نہ ڈالو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد

(۲) ضرورت علم: جب انسان نے باور کر لیا کہ اس کی حیات کا وہ مقصد نہیں جو اللہ تعالیٰ بتا رہا ہے بلکہ کچھ اور ہی ہے تو اس نے ابلیس کی مدد سے دوسرے دوسرے مقاصد حیات متعین کر لئے۔ اب اللہ تعالیٰ نے اپنے مقاصد کے تحت ہی 'سنت اللہ' کا اس ارض پر اجراء فرمایا تھا اور انسان کیلئے 'سحر' کا فیصلہ بھی اس مقصد کے تحت ہوا تھا۔ جو اس مقصد کی تکمیل کیلئے کافی تھا۔ لیکن جب انسان نے ربانی مقصد کو چھوڑ کر دوسرے مقاصد متعین کر لئے تو اب نئی صورتحال پیدا ہو گئی جو درج ذیل تھی:

(۱) ان نئے مقاصد کی تکمیل میں ربانی علم کفایت نہیں کرنے لگا اور مزید علم کی ضرورت

آن پڑی۔

(۲) ان نئے مقاصد کی تکمیل میں 'سحر' یعنی ربانی تسخیر کفایت نہیں کرنے لگی اور مزید تسخیر

کی ضرورت آن پڑی۔

(۳) ضرورت اکتشاف: اس مرحلے میں ابلیس نے انسان کو باور کرایا کہ اسے اکتشاف کی

طرف جانا چاہئے اور انفاقی علم اور اس انفاقی علم کے حصول کے راستے کو خیر آباد کہہ دینا چاہئے۔

اس مقام پر مشکل یہ آن پڑی کہ اللہ تعالیٰ علم کا سرچشمہ ہے۔ صرف وہی 'علیم' ہے یعنی العلیم ہے۔

اس کے علاوہ 'علم' کہیں اور پایا نہیں جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے مقصد کی تکمیل کیلئے کافی 'علم'

عطا فرمایا ہے۔ یہ کافی علم انفاقی علم تھا۔ اس سے زیادہ علم انسان کیلئے ضروری تھا نہ مفید۔ چنانچہ

اس انفاقی علم کے ہوتے ہوئے مزید علم روئے ارض پر انسان کو نہیں مل سکتا تھا۔ اب علم حاصل

کرنے کی دو ہی صورتیں تھیں۔ یہ دو صورتیں تھیں:

(۱) عمودی حرکت

(۲) افقی حرکت

اور یہ دونوں صورتیں غصب، چوری اور ناجائز حصول سے ہی حاصل ہو سکتی تھیں لہذا ممنوع

اور حرام تھیں۔ ابلیس نے انسان کو اسی راہ کی طرف رہنمائی کی۔

عمودی حرکت کے ذریعہ اکتشاف: اللہ تعالیٰ نے کائنات میں بے شمار مخلوقات بنائے

ہیں۔ ہر مخلوق کیلئے اللہ تعالیٰ نے 'سنت اللہ' کا اجراء فرمایا ہے۔ اور ہر مخلوق کیلئے اس نے 'سحر' فرمایا

ہے۔ ہر مخلوق کیلئے 'شرع' اور 'منہاج' ہے۔ چنانچہ ہر مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے انفاقی علم اور انفاقی ہنر

عطا فرمایا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے اپنے انفاقی عمل کو انجام دینے کے پابند ہیں۔ ان مخلوقات کی اپنی جگہ الگ الگ کئی حالتیں بھی ہیں جو اپنی دوسری حالت سے بالکل جدا ہیں اور ان کے درمیان شعوری ربط نہیں۔ پھر ان کی تفصیلات ہیں۔ مثلاً خود انسان کی کئی حالتیں درج ذیل ہیں:

(۱) کسی فرد مثلاً 'زید' کی جو سن ۱۹۲۰ میں پیدا ہوا ہے وہ حالت جب وہ پشت آدم میں

الجنتہ میں تھا۔

(۲) جب وہ پشت قاتیل وہائیل و شیث میں تھا۔

(۳) جب وہ اپنے والد کے پشت میں تھا۔

(۴) جب وہ رحم مادر میں جان آنے سے قبل تھا

(۵) جب وہ رحم مادر میں جان آنے کے بعد تھا

(۶) جب وہ بچپن 'نو جوانی' جوانی 'ادھیڑ پن' میں تھا اور اب بڑھاپا میں ہے۔

(۷) جب وہ برزخ میں ہوگا

ظاہر ہے ان میں سے ہر حالت میں اللہ نے اسے انفاقی علم سے نوازا ہوگا۔ یہ انفاقی علم اس کی دوسری حالتوں کے انفاقی علم سے مختلف ہوگا۔ اس پر دیگر تمام مخلوقات اور ان کی حالتوں کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ابلیس نے انسان کو باور کرایا کہ اس کے نئے مقاصد کے لئے ضروری علم عمودی حرکت سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یعنی انسان اپنی سطح چھوڑ کر دوسری مخلوقات کی سطح پر جا کر یا اس سطح کی مخلوقات سے ربط کر کے اس سطح کا انفاقی علم حاصل کر لے۔ اس حصول کی تین ہی صورتیں تھیں:

(۱) چوری۔ چوری سے مراد یہ ہے کہ دوسری مخلوق کے انفاقی علم کو غیر قانونی طریقے اور اس مخلوق کے علم کے بغیر اسے حاصل کر لینا۔

(۲) غصب۔ غصب سے مراد یہ ہے کہ دوسری مخلوق کے انفاقی علم کو اسے مغلوب کر کے یا مجبور کر کے غیر قانونی طریقے سے حاصل کر لینا۔

(۳) خیانت۔ خیانت سے مراد یہ ہے کہ دوسری مخلوق کے انفاقی علم کو اس کے ساتھ تحالف کر کے اس کی رضا سے حاصل کر لینا اور اس مخلوق کا اپنا انفاقی علم ابلیس اور اس کے حلیفوں کو دے دینا۔

چنانچہ ابلیس کی رہنمائی میں انسان نے دوسری مخلوقات کے انفاقی علم کو حاصل کرنے کیلئے چوری، غصب اور خیانت کا راستہ اختیار کیا۔

پھر ہر مخلوق کی اور خود انسان کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں چنانچہ ان الگ الگ حالتوں میں پائے جانے والے انفاقی علم کو مذکورہ راستوں سے حاصل کرنے کا آغاز کیا گیا۔
حرکت (Mobility) اور دیگر امور کے اعتبار سے اگر انسان کے ارد گرد پائی جانے والی مخلوقات اور انکی حالتوں کو ترتیب دیا جائے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انسان کی اکتشافی جدوجہد کا دائرہ کس قدر وسیع ہو سکتا ہے۔

(۳) ملائکہ	روح راجر	امر روح	ما قبل پیدائش -	مابعد موت
(۲) ملک	امر روح	امر روح	ما قبل پیدائش -	مابعد موت
(۱) جن	امر روح	امر روح	ما قبل پیدائش -	مابعد موت
(۰) آدمی	امر روح	امر روح	ما قبل پیدائش -	مابعد موت
(۱) حیوان مطلق	امر روح	امر روح	ما قبل پیدائش -	مابعد موت
(۲) نباتات	امر روح	امر روح	ما قبل پیدائش -	مابعد موت
(۳) جمادات	امر روح	امر روح	ما قبل پیدائش -	مابعد موت

چنانچہ انسان نے ان ذرائع سے علوم حاصل کرنا شروع کر دیئے۔ اس طرح ان ذرائع سے حاصل کردہ سارا علم اکتشافی علم تھا جو ممنوع، حرام، مفسر اور غیر محمود تھا۔ اور یہی 'سحر' کا علم ہے۔
افقی حرکت کے ذریعہ اکتشاف: افقی حرکت کا ذکر اکتشاف کے ذیل میں بالعموم نہیں ہونا

چاہئے۔ اس لئے کہ افقی حرکت کے غیر محمود ہونے کی بات تو وہاں آتی ہے جہاں یہ بات انفاقی سطح پر ہو یعنی انسان کیلئے انسانی انفاقی سطح۔ جب انسان نے اپنی انسانی سطح چھوڑ کر مثلاً جنوں کی سطح پر آ کر وہ علوم حاصل کئے جو جنوں کیلئے انفاقی علم تھا تو اب اگر انسان اس علم کو حاصل کرنے کے بعد اس میں مزید توسیع کرتا ہے تو یہ تو حرام علی الحرام کے درجے کی بات ہوگی۔ اس لئے کہ انسان کیلئے اپنی انفاقی سطح چھوڑ کر جنوں کی سطح پر آنا ہی ممنوع و حرام تھا۔ چہ جائیکہ وہ اس میں اس جانب قدم بڑھانے جدھر قدم بڑھانا خود جنوں کیلئے ناپسندیدہ اور نامحمود تھا اور اگر جن ایسا کرتے تو ان کی اللہ گرفت کرتا یا وہ بالآخر تباہ ہو جاتے۔ تاہم صرف تقریب فہم سیئے ان چاروں افقی سطحوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) درجہ اول: درجہ انفاقی استفادہ

(۲) درجہ دوم: درجہ معلومات خاص

(۳) درجہ سوم: درجہ معلومات و تجربہ، خلق جدید یا درجہ تسخیر

(۴) درجہ چہارم: درجہ تبدیلی سنت

چنانچہ انسان نے ابلیس کی رہنمائی میں طرح طرح کی مخلوقات سے حاصل ہونے والے انفاقی علم میں افقی حرکت کا آغاز کر دیا۔

(۴) ضرورت تو وسیع اس صورتحال نے انسانوں کے درمیان فساد کا ایک نہ ختم ہونے والا دائرہ (Vicious Circle) کے بنانے کا آغاز کر دیا۔ ہر معلومات اور ہر عمل ایک نئے علم اور ایک نئے عمل کی توسیع کا متقاضی ہونے لگا۔ چنانچہ

(۱) علمی توسیع (Scientific or Intellectual Extension)

(۲) ہنری توسیع (Technological Extension)

(۳) عملی توسیع (Practical or Observational Extension) کا

سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ ایک ایسا پاگل پن تھا جس نے بالآخر انسان کو بوجھل بنا دیا۔ یہی وہ گھڑی تھی جب شیطان نے اسے ایک عام نسخہ بتایا کہ وہ اپنی اس حرکت کو ہمہ دم جاری بھی رکھ سکے اور پر نشاط بھی رہے۔ ابلیس نے ان دونوں حرکتوں کا نام 'تسخیر کائنات' رکھ دیا یعنی اس نے سادہ سبق یہ سکھایا کہ انسان کا بنیادی وظیفہ یہ ہے کہ وہ 'کائنات کو مسخر' کرے۔ چنانچہ یہاں سے اس

دائرہ کے بننے کا آغاز ہوا جو بالآخر ایک خطرناک مقام پر پہنچ جاتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ روئے ارض پر سائنس کی کوئی تاریخ نہیں۔ کارل پوپر (Karl Popper) نے اسے ادھورا سفر اور نامکمل دائرہ قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں: ماکان و مایکون باب: ادراک کا ثبات) لیکن ایسا کہنا درست نہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی (Science & Technology) کی فی الواقع تاریخ ہے لیکن یہ تاریخ دائروی (Cyclical) ہے۔ یہ تاریخ دراصل اکتشافی علم، اکتشافی ہنر اور اکتشافی عمل کی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ علمی طور پر انفتی سطح پر درجہ اول پر شروع ہوتی ہے اور جب درجہ چہارم پر پہنچ جاتی ہے تو اس اکتشافی علم کا حامل خود کورب العالمین سمجھنے لگتا ہے اور اس کا بالواسطہ یا بلاواسطہ دعویٰ کر بیٹھتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کا روئے ارض سے خاتمہ کر دیتا ہے۔

اسی طرح یہ تاریخ ہنری طور پر انفتی سطح پر درجہ اول پر شروع ہوتی ہے اور جب درجہ چہارم یعنی درجہ مکلفہ پر پہنچ جاتی ہے تو اس اکتشافی ہنر کا حامل خود کورب العالمین سمجھنے لگتا ہے اور اس کا بالواسطہ یا بلاواسطہ دعویٰ کر بیٹھتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

اسی طرح یہ تاریخ عملی طور پر انفتی سطح پر درجہ اول پر شروع ہوتی ہے اور درجہ چہارم پر پہنچ جاتی ہے تو اس اکتشافی عمل کا حامل خود کورب العالمین سمجھنے لگتا ہے اور اس کا بالواسطہ یا بلاواسطہ دعویٰ کر بیٹھتا ہے۔ چنانچہ یہی وہ مقام ہے جہاں اسے 'سنت اللہ' کو تبدیل کر کے اپنی سنت کے اجراء کا حوصلہ ہوتا ہے اور وہ کہتا ہے انا ربکم الاعلیٰ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ روئے ارض سے اس کا خاتمہ کر دیتا ہے اور ہر بار اس راہ پر چل پڑنے والے اس گمان میں رہتے ہیں کہ وہ پہلے

لوگ ہیں جو اس راہ پر اس قدر آگے جا رہے ہیں۔ (۴) روئے ارض پر 'سحر و تسحیر' کی یعنی اکتشافی علم، ہنر اور عمل کی تاریخ: عہد حاضر میں دنیا کی جو تاریخ بیان کی جاتی ہے وہ ناقص اور غلط ہی نہیں بلکہ گمراہ کن بھی ہے۔ آج بیان کی جانے والی تاریخ میں جسے سائنسی تاریخ تو کہی (Scientific Historiography) کہا جاتا ہے دو باتیں نمایاں ہیں:

(۱) روئے ارض پر انسان کی تاریخ اتنے سالوں قبل شروع ہوئی۔ انسان ارتقائی مراحل (Evolutionary Phases) طے کرتا رہا، پہلے غاروں میں رہتا تھا تو یہ سبھی زمانہ

ان میں سے ہر عہد میں حاملین اکتشاف نے بالآخر اپنے رب العالمین ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ قرآن اس پر صریح ہے کہ روئے ارض پر نیوکلیر عہد، کیمیاوی عہد، جراثیمی عہد اور خلائی عہد آج پہلی بار شروع نہیں ہو رہا ہے بلکہ اس سے پہلے کئی بار یہ فسادات پیدا ہو چکے ہیں اور اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔

(۵) قرآن میں مذکور 'سحر':

(الف) قرآنی نقطہ نظر: اس تعلق سے سب سے چونکا نے والی بات جو قرآن میں نظر آتی ہے وہ 'سحر' کا استعمال ہے۔ قرآن میں 'سحر' کا جہاں جہاں استعمال ہوا اس میں دو پہلو نمایاں ہیں:

(۱) منفی اور

(۲) الزامی

منفی پہلو سے مراد ہے کہ 'سحر' قرآن میں جہاں جہاں استعمال کیا گیا ہے کہیں بھی اس کا اثبات یا مثبت استعمال نہیں ملتا۔ بلکہ منفی استعمال ہی ملتا ہے گویا سحر کوئی ایسی چیز ہے جو قابل نفرت یا قابل مذمت ہے۔ الزامی پہلو سے مراد یہ ہے کہ اس کا استعمال جہاں جہاں ہوا ہے وہاں قائل اسے اپنے مخالف پر الزام لگانے اور اسے قابل مذمت ٹھہرانے کیلئے استعمال کرتا ہے۔ یہاں مزید حیرت میں ڈالنے والی بات یہ ہے کہ ایسے استعمال میں حق (یعنی اللہ رسول اور مومنین) کی جانب سے استعمال برائے نام یعنی زیادہ سے زیادہ ۳ مقامات پر ہے ورنہ بقیہ ۲۰ مقامات پر اس کا استعمال شر اور باطل حق کے خلاف کرتا ہے۔ یعنی ابلیس اور اس کے حلیف اہل حق کے خلاف یہ الزام عاید کرتے ہیں کہ وہ 'سحر' کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور 'ساحر' ہیں۔

چنانچہ (۱) آنحضرت ﷺ کو

(الف) سورہ یونس آیت ۲ اور (ب) سورہ ص آیت ۴ میں علی الترتیب ساحر مبین اور

ساحر کذاب کہا گیا۔

(۲) حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو:

(الف) سورہ الشعراء آیت ۲۴ (ب) سورہ غافر آیت ۲۴ میں علی الترتیب ساحر علیم اور

ساحر کذاب کہا گیا۔

اس کے برخلاف ان انبیاء کرام علیہما السلام کے مقابلے میں لائے گئے لوگوں کو :
(الف) سورۃ الاعراف آیت ۱۱۲ (۲) سورۃ یونس آیت ۷۹ اور (۳) سورۃ الشعراء آیت ۱۷۱ میں علی الترتیب ساحر عظیم، ساحر عظیم اور ساحر عظیم کہا گیا ہے۔

آخر ماجرا کیا ہے؟ اگر 'سحر' بری یا واہمہ اور بے حقیقت چیز ہوتی تو حق اور اہل حق کو اس 'سحر' اور 'ساحر' کا الزام شر اور باطل پر لگانا چاہئے تھا۔ مفسرین کی ساری تشریح "فقہ اسلامی" کی ساری تعریف مناط، تنقیح مناط اور تحقیق مناط اور علوم اسلامی میں درج ساری تفصیلات قرآن سے نہ صرف یہ کہ مطابقت نہیں رکھتیں بلکہ اس کے برخلاف ہیں۔ قرآن کا سارا بیان یہ ہے کہ:
حق باطل پر 'سحر' کا الزام عاید نہیں کرتا اور اگر کرتا ہے تو صرف بیان یہ جب کہ باطل حق پر (یعنی انبیاء پر) 'سحر' کرنے اور 'ساحر' ہونے کا الزام عاید کرتا ہے۔ اور انہیں قابل سزا بلکہ قابل سزائے موت قرار دیتا ہے۔

مفسرین کی تفسیریں 'فقہ اسلامی' کی تحقیق مناط اور علوم اسلامی میں درج تفصیلات کا بیان یہ ہے کہ:

'سحر' ایک بے حقیقت اور جمہور کے نزدیک حقیقت اور ہر دو صورت میں باطل ہے اور 'سحر' کرنا غلط اور 'ساحر' قابل سزا ہے اور بعض صورتوں میں قابل سزائے موت۔

(ب) قرآنی بیان قرآن میں 'سحر' کا استعمال درج ذیل اعتبار سے ہوا ہے:

(۱) سحر (اسم)

(۲) سحر (فعل)

(۳) سحر مبین، سحر مفتری، سحر مستمر، سحر یوثر، سحر عظیم

(۴) ساحر عظیم، ساحر مبین، ساحر کذاب

(۵) ساحر عظیم

(۱) ان استعمالات میں دو امور نہایت اہم ہیں جن پر غور کیا جانا چاہئے۔

پہلا امر: سحر عظیم کا استعمال،

(۲) دوسرا امر: سحر مبین، سحر مفتری، سحر مستمر، سحر یوثر اور سحر عظیم کا استعمال۔

(۳) تیسرا امر: ساحر مبین، ساحر عظیم اور ساحر کذاب کا استعمال۔

پہلا امر: جہاں تک پہلے امر کا ذکر ہے اس میں 'عظیم' صفت کا ہونا عام ہے۔ یعنی یہ سحر کی کوئی مخصوص قسم نہیں بلکہ ہر قسم کا 'سحر' جو غیر معمولی ہو اسے 'سحر عظیم' کہا جاسکتا ہے۔ قرآن نے اسی اعتبار سے اس کا استعمال کیا ہے۔ یعنی جو کچھ اہل فراعنہ نے کیا وہ غیر معمولی سحر کا مظاہرہ تھا۔

دوسرا امر: دوسرے امر میں اصل 'سحر مبین' ہے۔ جہاں تک سحر مفتری 'سحر مستمر اور سحر یوثر' کا تعلق ہے قرآن کا استعمال بتاتا ہے کہ یہ وہ جھوٹے الزامات تھے جو باطل نے انبیاء کرام اور ان کے ہاتھوں ظہور میں آنے والے معجزات کی 'بزعم خویش' حقیقت اجاگر کرتے ہوئے اور لوگوں کو فی الواقع ان معجزات کی حقیقت انبیاء کی عظمت اور ان کی دعوت کو بے حقیقت اور قابل رد قرار دینے کیلئے لگایا تھا۔ تاہم دیکھا جانا چاہئے کہ اس الزامی اور غلط اور بے حقیقت بہتان کی معنویت کیا تھی؟

(۱) سحر مفتری: قرآن کا ارشاد ہے:

فلما جاءهم موسىٰ بايتنا بينت قالوا ما هذا الا سحر مفترى و ما سمعنا بهذا فى آباؤنا الاولين (القصص: ۳۶)

ترجمہ: پھر جب پہنچا ان کے پاس موسیٰ ہماری آیات بینات لیکر تو وہ بولے: (یہ) کچھ نہیں ہے مگر 'سحر مفتری' اور ہم نے (کبھی) سنا نہیں یہ اپنے اگلے باپ دادوں میں۔ غور کیا جائے تو کئی باتیں نظر آتی ہیں: (۱) ان لوگوں نے حضرت موسیٰ کے جس امر پر 'سحر مفتری' کا الزام عاید کیا وہ قرآن کے مطابق 'آیات بینات' تھا یعنی وہ معجزے جو حضرت موسیٰ نے دکھایا۔ تھوڑی دیر کیلئے فرض کیجئے کہ حضرت موسیٰ نے 'ید' کے استعمال سے سارے ملک فرعون میں قحط لادیا یا پانی کو خون بنا دیا یا مڈیاں لادیں یا دباء پھیلا دی۔ اس پر فرعون نے کہا کہ یہ 'سحر مفتری' ہے۔ ظاہر ہے ایسا کہنا حضرت موسیٰ کے اثر کو قوم میں زائل کرنے اور ان کے ذریعہ حق کی قوت کے مظاہرے کو بے حقیقت بنانے کے لئے ہی ہوا ہوگا۔ تو یہ آیات بینات بھلا بے حقیقت اور واہمہ کیسے ہو سکتی ہے؟ ہاں فرعون کا ایسا کہنا درست ہے کہ ایسا ہوتے تو ہم نے کبھی نہیں سنا تھا؟ واضح ہو کہ یہاں یہ استعمال منفی طور پر اور الزام ہے۔ یعنی اگر مثبت اور بیانیہ حقیقت جانی ہو تو 'سحر' کا مفہوم یہ ہوگا کہ انسان کے ذریعہ ایسی قوت حاصل کر لینا جسے اللہ نے انسان کیلئے 'سحر' نہیں کیا تھا۔ مثلاً یہ کہ فرانس میں بیٹھ کر ایک ڈاکٹر کالاس انجیلس (امریکہ) میں ایک

(Stone Age) تھا، پھر ارتقاء پزیر ہوتا ہوتا بنے کے زمانے (Copper Age) میں پھر کانے کے زمانے (Bronze Age) میں، پھر لوہے کے زمانے (Iron Age) میں پھر عہد قدیم (Ancient Age) میں پھر عہد وسطی (Medieval Age) میں پھر عہد جدید (Modern Age) میں پھر اب عہد خلا (Space Age) میں داخل ہو گیا ہے۔

(۲) روئے ارض پر انسان نے جیسی آج ترقی کی ہے اور جیسا علمی و ہنری اور عملی انفجار

(Scientific, Technological & Applicational Explosion) آج

ہوا ہے اس سے قبل کبھی نہیں ہوا تھا۔

یہ دونوں باتیں نادرست غلط اور گمراہ کن ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ روئے ارض پر 'سحر' اور 'تسخیر'

کی انفاقی تاریخ ہی صلاح فی الارض کی تاریخ ہے اور یہی تاریخ انسانی تاریخ ہے۔ صرف اسی تاریخ میں 'وقت' (Time) خط مستقیم (Linear) میں آگے بڑھ رہا ہے۔

اس کے متوازی ایک اور تاریخ ہے جو 'سحر' اور 'تسخیر' کی اکتشانی تاریخ ہے۔ یہی تاریخ

فساد فی الارض کی انسانی تاریخ ہے۔ یہی تاریخ مفسدین فی الارض کی تاریخ ہے۔ اس تاریخ میں

وقت 'وقت' (Time) خط مستقیم (Linear) میں نہیں بلکہ دائروی (Cyclical) طور پر آگے

بڑھ رہا ہے۔ جب یہ دائرہ مکمل ہو جاتا ہے تو اللہ اس اکتشانی علم، اس اکتشانی ہنر اور اس اکتشانی

عمل کو کلی طور پر نابود کر دیتا ہے۔ اور بعد والے جب پھر اسی فساد کا آغاز کرتے ہیں اور ویسا ہی

اکتشانی تعلیم و تعلم، اکتشانی ہنر اور اکتشانی تعمیل و عمل کا آغاز کرتے ہیں تو انہیں لگتا ہے کہ وہی سب

سے پہلے اس کے کرنے والے ہیں۔ جیسا کہ آج کے عہد کے سائنسی تاریخ والے سمجھتے ہیں۔

جب کہ حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس روئے ارض پر آج کی طرح درجہ کمال تک پہنچی

ہوئی اکتشانی صورتحال اپنی اپنی خصوصیات کے ساتھ اس سے قبل بھی کم از کم تین بار روئے ارض پر

طاری ہو چکی ہے۔ یہ تین سائنسی اور تکنیکی عہد (Scientific & Technological

Age) درج ذیل ہیں:

(۱) ما قبل نوح

(۲) ما قبل شعیب

(۳) ما قبل بعثت نبوی ﷺ

شخص کا روبوٹ کے ذریعہ دل کا کھلا آپریشن (Open Heart Surgery) کرنا۔ یا ایک شخص (موجودہ اصطلاح میں بزرگ) کا دہلی میں بیٹھ کر آنکھیں موند کر یا کسی جن موکل کے ذریعہ یہ بتانا کہ زید کا بیٹا جو گھر سے بھاگ گیا ہے وہ اس وقت لکھنؤ میں ہے۔ یہ دونوں امور الگ الگ ذرائع یعنی ان 'علم' اور 'ہنر' (Science & Technology) کے استعمال سے انجام دیئے گئے ہیں جنہیں اللہ نے انسان کو 'سحر' کے تحت نہیں دیا تھا۔ فرعون کا ایسا کہنا ہر چند کہ منفی طور پر اور الزام تھا لیکن صد فی صد درست تھا کہ ایسا ہوتے یعنی کسی شخص کا 'ید' کا استعمال کر کے پانی کو خون کر دینا، سارے ملک میں بیماریاں پیدا کر دینا۔ تو ہم نے نہ کبھی دیکھا تھا نہ سنا تھا۔ کوئی انسان ایسا کرے ممکن نہیں۔ اب ایک شخص جو (الف) یہ مانتا ہو کہ یہ قوت کسی عام انسان کے بس سے باہر ہے۔ اس لئے کہ یہ ان قوتوں میں سے نہیں جو 'سحر' کے دائرے میں داخل ہیں (ب) اور جو یہ ماننا نہیں چاہتا ہو کہ اس شخص کو اسی ذات اور ہستی نے یہ مافوق الانسانی قوت عطا کی ہے جس نے سارے جہان کے انسانوں کو 'سحر' کے تحت طاقت دی ہے۔ تو پھر اب صرف تیسرا راستہ ہی بچ رہتا ہے یعنی یہ کہ ضرور اس شخص نے ان مافوق الانسانی قوت کو 'سحر' اور 'تسحیر' کیا ہے۔ لیکن اس مقام پر وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ لوگ اسی 'سحر' ہی سے سہی مرعوب ہو جائیں۔ لہذا اس نے اس تاثر کو بھی دور کرنے کیلئے ایک اور الزام لگایا کہ یہ 'سحر' 'مفتری' ہے۔ یعنی ایسا محیر العقول کارنامہ جس میں دھوکا اور نمائش ہو۔ یہاں فرعون کے اصلاً مخاطب موسیٰ نہیں بلکہ خود اس کے ملائ ہیں۔

(۲) سحر مستمر: قرآن کا ارشاد ہے

اقتربت الساعة وانشق القمر و ان یروا آیۃ یعرضوا ویقولوا سحر مستمر (القمر: ۱۸)

ترجمہ: پاس آگئی قیامت اور پھٹ گیا چاند اور اگر وہ دیکھیں کوئی نشانی تو نال جائیں اور کہیں یہ 'سحر' مستمر ہے۔

یہاں بھی وہی بات صادق آتی اور وہی صورتحال منطبق ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے ذریعہ ظاہر کی گئیں 'آیات بینات' یعنی 'معجزات' واہمہ بے حقیقت اور خیالی باتیں نہیں تھیں بلکہ اہل حقیقت تھیں اور لوگوں نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جس پر اہل مکہ یعنی علماء یہود و دیگر

یہود اور مشرکین مکہ نے یہ الزام عاید کیا کہ: یہ 'سحر مستر' ہے۔ اس الزام سے کیا مراد ہے؟
 اس الزام سے وہ معنی قطعاً مراد نہیں جو عام ترجمہ میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً یہ جادو ہے پہلے
 سے چلا آتا (ترجمہ شیخ الہند) بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ (۱) بلاشبہ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جسے
 سب کی آنکھوں نے باطمینان دیکھا ہے لیکن ایسا کارنامہ کسی انسان کے بس سے باہر ہے (ب)
 اور وہ یہ ماننا نہیں چاہتے کہ یہ اللہ کے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں اور اللہ جس نے کائنات کو انسان
 کیلئے مسخر بنایا ہے اسی نے یہ قوت اپنے رسول کو دی ہے۔ (ج) ظاہر ہے اس صورت میں یہی
 کہا جائے گا کہ اس شخص نے کسی ذریعہ سے یہ 'سحر' کیا ہے یعنی ایسی حیرتناک قوت حاصل کر لی
 ہے۔ چونکہ یہ غیر معمولی کارنامہ نظر آنے والا اور مختلف بنایا ہوا لگتا ہے اس لئے اسے 'مستر'
 کہا گیا جو فی الواقع 'راء' سے مشتق ہے۔

(۳) سحر یؤثر قرآن کا ارشاد ہے:

انه فکرو قدر فقتل کیف قدر ثم قتل کیف قدر ثم نظر ثم عبس و بسر
 ثم ادبر واستکبر فقال ان هذا الا سحر یؤثر ان هذا الا قول البشر (المدر
 ۲۵-۱۸)

ترجمہ: اس نے سوچا پھر شہر الیا۔ سو مارا جائے کیسا شہر الیا۔ ہاں مارا جائے کیسا شہر الیا! پھر
 نظر ڈالی پھر تیوری چڑھائی اور منہ تھتھایا۔ پھر پیٹھ پھیر لی اور غرور کیا پھر بولا یہ کچھ نہیں مگر سحر یوثر۔
 یہ کچھ نہیں مگر قول آدمی۔

یہاں بھی وہی بات صادق آتی ہے اور وہی صورتحال منطبق ہوتی ہے۔ یہاں جو کارنامہ
 ہے اس کا بھی اعضاء کے ساتھ ساتھ عقل یعنی مدد کہ پر بھی یکساں اثر پایا جاتا ہے۔ اس لئے اسے
 بھی 'سحر' کہا گیا۔ یہ غیر معمولی اور موثر قوت کا اظہار ہے جو صرف محسوس صیغہ سے نہیں بلکہ ایسے
 صیغوں سے بھی ہو سکتا ہے جو غیر مرئی اور غیر محسوس ہیں اور صرف عقلی طور پر سمجھے جاسکتے ہیں۔
 چنانچہ اسی تعلق سے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

”ان من البیان لسحر“

ترجمہ: بے شک بیان کے اندر 'سحر' ہے یہ بیان ایک قسم کا 'سحر' ہے۔

(۳) 'سحر مبین' جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اصل 'سحر مبین' ہے۔ چنانچہ یہی وہ 'سحر' ہے جسے

قرآن بیان کرتا ہے۔ 'سحر مبین' سے کیا مراد ہے؟

یہ وہ ترکیب ہے جس کا استعمال قرآن کی نو سورتوں میں ہوا ہے یعنی (۱) المائدہ آیت ۱۱۰ (۲) الانعام آیت ۷ (۳) یونس آیت ۶۷ (۴) ہود آیت ۷ (۵) نحل آیت ۱۳ (۶) سبا آیت ۴۲ (۷) صافات آیت ۱۵ (۸) الاحقاف آیت ۷ اور (۹) القف آیت ۶ میں۔

مبین کا کیا مفہوم ہے؟ 'مبین' عربی مبین کے نہایت بلیغ الفاظ میں سے ایک لفظ ہے۔ بد قسمتی سے یہ ان الفاظ میں سے ایک ہے جن کی جمہور مفسرین کرام نے عربی مبین سے ناواقفیت کے سبب خوب خوب 'تواضع' کی ہے۔

'عربی مبین' میں مبین کے درج ذیل معانی ہیں:

(۱) ممتاز، امتیاز کردہ، امتیاز شدہ

(۲) الگ الگ کردہ

(۳) ایسی بات جو واضح، ممتاز، جدا جدا ہو۔

(۴) سمجھنا، سمجھ میں آنا، جس کی معنویت قابل فہم ہو۔

(۵) نظر آنا۔

(۶) وہ چیز جو قوای محسوسہ یعنی 'باصرة'، 'شم'، 'لامسہ'، 'ذائقہ'، 'سامعہ' اور قوت مدركہ میں سے ایک یا کئی یا سمجھوں سے سمجھی جائے۔ یا سمجھائی یا واضح کی جاسکے یا سمجھائی یا واضح کی گئی ہو یا جانی یا بتائی اور علم میں لائی گئی ہو۔

(۷) مشاہدہ کی گئی، متعین کی گئی، دھیان دی گئی، ممتاز کی گئی، سوچی اور سمجھی گئی چیز یا بات۔ اس طرح 'سحر مبین' کا مفہوم یوں متعین کیا جاسکتا ہے:

"ایسا تخلیقی کا نامہ جو فوق العادہ ہو یا خرق عادۃ میں سے کسی صورت سے معرض وجود میں آئے یا لایا جائے اور جو قوای محسوسہ و مدركہ کے اعتبار سے واضح اور سمجھا جانے والا ہو۔"

۶۔ (الف) سرف اور اس کی حقیقت:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

ان الله لا يهدي من هو مسرف كذاب (المومن: ۴۰)

ترجمہ: بے شک اللہ ہدایت نہیں دیتا اس کو جو مسرف جھوٹا ہو۔

’سرف کذاب کون ہے؟

یہ آیت بڑی عجیب ہے۔ اس کا تاثر یہ ہے کہ:

(۱) فرعون نے ایک عظیم الشان نظام قائم کیا جو اپنی سائنس، ٹکنالوجی اور عسکری قوت کے اعتبار سے ناقابل چیلنج تھا اور اس غیر معمولی قوت کے غرور میں اس نے ظلم کرنا اور حق بات کے ماننے سے انکار کرنا یہاں تک کہ اپنے کورب الا علی کہنا اور کہلوانا شروع کیا۔

(۲) حضرت موسیٰ اللہ کے حکم سے اس کے پاس تشریف لے گئے، اسے دعوت دی اور اس کے سامنے آیات بینات یعنی معجزات پیش کئے۔

(۳) ان آیات بینات کو اس نے ’سحر‘ اور حضرت موسیٰ پر ’ساحر کذاب‘ کا الزام عاید کیا اور ان کے خاتمے کے درپے ہوا۔

(۴) نظام فرعون کے ایک صالح مومن شخص نے فرعون اور اس کے نظام کو اس اقدام سے باز رکھنا چاہا اور اس تعلق سے دو باتیں پیش کیں۔ اس کی پہلی بات یہ تھی کہ موسیٰ کی بات درست لگتی ہے اور جو معجزے انہوں نے پیش کئے وہ سحر نہیں بلکہ آیات بینات ہیں اور وہ ساحر نہیں بلکہ نبی ہیں۔ گویا ان سے تعرض نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ نبی ہونے کی صورت میں ان کی وعید ضرور سچ ہو کر رہے گی۔ اس سے بچنا چاہئے۔ دوسری بات یہ تھی کہ اگر وہ نبی نہیں بلکہ اس کا جھوٹا دعویٰ کر رہے ہیں تو ان سے تمہیں کوئی خطر نہیں۔ لہذا ہر دو صورت میں تعرض نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

(۵) اس کے بعد وہ شخص ایک نہایت عجیب بات کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ’سرف کذاب‘ کو ہدایت نہیں دیتا۔

اس کے دو پہلو ہیں: (۱) اگر موسیٰ سرف کذاب ہے تو اس کا اللہ کے یہاں کوئی مقام نہیں اور وہ تمہارا بھی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ (۲) کہیں ایسا تو نہیں یعنی ایسا ہی ہے کہ موسیٰ نہیں بلکہ اے فرعون تو اور تیرا نظام سرف کذاب ہے۔ ظاہر ہے بعد کی بات اس نکتہ کو متعین کر دیتی ہے کہ وہ صالح شخص کی بات دراصل یہی تھی کہ اے فرعون تمہارا نظام سرف کذاب ہے اور میں اسی میں تمہاری خیر دیکھ رہا ہوں کہ تم موسیٰ کی بات مان لو۔ ورنہ مجھے ایسا یقین ہو چلا ہے کہ تمہارا اور تمہارے اس نظام کا وہی انجام ہونے والا ہے جو تم سے قبل ’یوم الاحزاب‘ یعنی قوم نوح، شمود اور قوم شعیب کا ہو چکا ہے۔

(۶) اس بات پر بالآخر مہر تصدیق ثابت کرتے ہوئے وہ صالح شخص گویا ہوتا ہے:
 کَذَالِكَ يَضِلُّ اللَّهُ مِنْهُ مَسْرُوفٌ مَرْتَابًا (المومن: ۳۴) اسی طرح بھٹکاتا ہے اللہ اس کو
 جو 'سرف' مرتابا ہے۔

اور اسکی مزید تشریح کرتے ہوئے کہا گیا: یہ وہی ہے جو جدال کرتے ہیں اللہ کی آیات پر
 اس حال میں کہ ان کے پاس کوئی سلطان نہیں پہنچی ہوتی ہے۔ دراصل وہ اللہ اور اہل ایمان کے
 نزدیک بڑے بیزار ہیں۔ اس طرح اللہ ان تمام لوگوں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے جو متکبر اور جبار
 ہو جاتے ہیں۔

(۷) 'متکبر جبار روئے ارض' پر وہی ہوتے ہیں جو اپنے 'سحر' سے اس مقام پر پہنچ جاتے
 ہیں جہاں انہیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ 'رب العالمین' کی طرح ہو گئے ہیں۔
 'سرف' کیا ہے؟

'عربی مبین' میں 'سرف' اور 'سحف' ایک ہی چیز ہیں۔ جس کا مفہوم ہے کسی چیز کو پھاڑ ڈالنا
 - کسی چیز کا پھٹ جانا۔

'سرف' آفاق و انفس میں یہ ہے کہ کوئی انسان 'مسخر'ہ چیزوں، باتوں اور قوتوں کو اللہ تعالیٰ
 کی مرضی کے برخلاف جا کر اس کی سنت کو پھاڑ ڈالے اور اس پر قابض ہو جائے۔ اس اعتبار سے
 'سرف' 'سحر' ہے اور 'سرف' 'ساحر'۔

الجنة میں ابلیس نے حضرات آدم و حوا کو اس 'سرف' کی طرف راغب کیا تھا اور وہاں
 جو گناہ سرزد ہوا وہ دراصل 'سرف' کا ہی گناہ تھا۔

اس روئے ارض پر 'سرف' وہ بنیادی گناہ ہے جو بعد کے تمام گناہوں کا سبب بنا۔
 روئے ارض پر 'سرف' کی دو قسمیں ہیں۔ گذشتہ صفحات میں اس عاجز نے اسی کو توسیعات
 کہا ہے۔

وہ دو اقسام کے 'سرف' درج ذیل ہیں:

(۱) صعود: 'صعود' وہ سرف ہے جو عمودی تبدیلی کے ساتھ ہو۔ یعنی انسان کا انسانی انفاقی
 سطح سے عمودی چھلانگ لگا کر نیچے یعنی حیوان مطلق، نباتات اور جمادات کی انفاقی سطح کے علم، ہنر
 اور عمل کو قابو میں کر لینا۔ اور اسی طرح انسانی انفاقی سطح سے اوپر یعنی جن، ملک، ملائکہ اور تمام اقسام

کی ارواح کی انفاقی سطح کے علم، ہنر اور عمل کو قابو میں کر لینا۔ صعود کے وہ مختلف طریقے جو ابلیس نے انسان کو بتائے ہیں ان میں چند درج ذیل ہیں۔

- (۱) سمع۔ سمع کا تعلق انسان کیلئے ناجائز علوم کو خلاف قانون حاصل کرنے سے ہے۔
- (۲) خطف۔ خطف کا تعلق انسان کیلئے ناجائز علوم کو خلاف قانون چرائینے سے ہے
- (۳) تعلم۔ تعلم کا تعلق انسان کے ذریعہ ناجائز علوم کا ان کے مجاز حاملین کی مدد سے خلاف ضابطہ حاصل کر لینے سے ہے۔
- (۴) بحث۔ بحث کا تعلق انسان کا عطا کردہ علوم کی جائز حد سے آگے جا کر یا ان کے اندر ناجائز علوم کو حاصل کرنے سے ہے۔

انسان نے ابلیس کی تحریک اور رہنمائی میں سمع، خطف، تعلم اور بحث کے ذریعہ عمودی چھلانگ لگالی اور اس طرح صعود کر کے سرف کیا اور ان چیزوں کو 'سحر' کیا جس کا وہ مجاز نہ تھا۔

(۲) اعتداد: اعتداد وہ سرف ہے جو افقی تبدیلی کے ساتھ ہو یعنی انسان اپنی انفاقی سطح کے انفاقی درجہ سے افقاً (Horizontally) تجاوز کرے اور اسی طرح بلکہ اس سے اشد سرف وہ ہے کہ انسان اپنی انفاقی سطح سے عمودی چھلانگ لگائے اور دیگر مخلوقات کی انفاقی سطح کے انفاقی درجہ پر پہنچ کر وہاں سے پھر آگے جا کر افقی حرکت کرے اور اس طرح تجاوز پر تجاوز کرتا جائے۔

اس طرح روئے ارض پر اعتداد کی وہ شکلیں پائی جاتی ہیں

- (۱) انسان کا انسانی انفاقی سطح اور انفاقی درجے سے اعتداد۔
 - (۲) انسان کا دیگر مخلوقات کی انفاقی سطحوں اور ان کی انفاقی درجے سے اعتداد۔
- 'صعود کی طرح اعتداد میں بھی انسان سمع، خطف، تعلم اور بحث کے ذرائع ہی استعمال کرتا ہے۔ اس طرح صعود اور اعتداد دونوں کا نتیجہ سرف، یعنی 'سحر' کی شکل میں سامنے آتا ہے۔
- (ب) سحر: سحر اور کفر اللہ رب العالمین نے قرآن میں صراحت کی ہے کہ جب ابلیس انسان کو سنت اللہ سے ہٹانے کیلئے اسے سرف اور سحر کیلئے مہمیز کرتا ہے تو وہ صرف اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ وہ انہیں اس راہ میں زیادہ سے زیادہ آگے لے جانے کی کوشش کرتا ہے چنانچہ اس کے تین مدارج ہیں۔

'سحر' کے یہ تینوں مدارج درج ذیل ہیں:

(۱) پہلا مدرج: سحر یا سحر

(۲) دوسرا مدرج: استخر اور

(۳) تیسرا مدرج: کفر

ان تینوں مدارج کی تشریح ان شاء اللہ اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔

(۷) (الف) روئے ارض پر 'سرف' کی تاریخ: اللہ تعالیٰ نے حضرات آدم و حوا علیہما السلام کو روئے ارض پر بس جانے کا حکم فرمایا اور اس کے بعد انہیں زیست کے لئے بنی آدم کی زندگی کا سارا خاکہ بتا دیا۔ چنانچہ حضرات آدم و حوا علیہما السلام اللہ تعالیٰ کے اس خاکے کے عین مطابق بس کر رہے گئے۔ لہذا ان باتوں کا ذکر اللہ تعالیٰ اس طرح فرماتے ہیں:

(۱) وَقُلْنَا اهْبِطُوا (البقرہ: ۳۶)

ترجمہ: اور ہم نے (آدم و حوا) سے کہا اترو۔

(۲) وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مَسَاقِلُ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (البقرہ: ۳۶)

ترجمہ: اور تمہارے لئے ہے زمین میں مسقر اور متاع ایک مدت کیلئے

(۳) وَقُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَا مَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنْهُ هَدًى فَمَنْ تَبَعَ هُدًى فَلَا

خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (البقرہ: ۳۸)

ترجمہ: اور ہم نے کہا یہاں سے تم سب اکٹھے اترو اور جب ہماری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو تم میں جو اس کی پیروی کرے گا اس پر نہ تو کوئی خوف ہوگا نہ وہ ملول ہوگا۔ چنانچہ ان باتوں کے عین مطابق حضرات آدم و حوا علیہما السلام روئے ارض پر بس گئے۔ اس کے بعد ان سے کہا گیا:

(۱) إِنَّ رَبَّكُمْ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يَغْشَى الْيَلَّ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ إِلَّا لَ الْخَلْقِ وَالْأَمْرِ تَبَرَّكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ . وَلَا تَفْسُدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِنَ الْمُحْسِنِينَ . وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَّحَ بَشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ حَتَّىٰ إِذَا أَقْلَتِ سَحَابًا ثَقَالًا مَّقْنَهُ لِبَلَدٍ مَّيْتٍ فَأَنْزَلْنَا

به الماء فاخرجنا به من كل الثمرات كذلك نخرج الموتى لعلكم تذكرون .
والبلد الطيب يخرج نباته باذن ربه والذي خبث لا يخرج الا نكدا كذلك
نصرف الابت لقوم يشكرون (الاعراف ۵۸-۵۷)

ترجمہ: بے شک تمہارا رب اللہ ہے۔ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا چھ دن میں پھر
قرار پکڑا عرش پر۔ اڑھاتا ہے رات پر دن کہ وہ اس کے پیچھے لگا آتا ہے دوڑتا ہوا اور پیدا کئے
سورج اور چاند اور تارے مسخر کردہ اپنے حکم سے۔ سن لو اسی کا ہے خلق اور امر بڑی برکت والا ہے
اللہ رب العالمین۔ پکارو اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے بے شک وہ اعتدال کرنے والوں کو پسند
نہیں کرتا۔ اور زمین میں فساد نہ ڈالو اس کی اصلاح کے بعد اور پکارو اس کو ڈر اور توقع سے بے
شک اللہ کی رحمت نزدیک ہے صرف اللہ کے لئے یکسو لوگوں سے اور وہی ہے کہ چھوڑتا ہے
ہوائیں خوش خبری لانے والی رحمت سے پہلے یہاں تک کہ جب وہ اٹھالاتی ہیں بھاری بادل تو
سیراب کر دیتے ہیں ہم مردہ زمین کو پھر ہم اتارتے ہیں اس بادل سے پانی پھر اس سے نکالتے
ہیں سب طرح کے پھل اس طرح ہم نکالیں گے مردوں کو تا کہ تم غور کرو۔ اور جو زمین پاکیزہ ہے
اس کا سبزہ نکلتا ہے اس کے رب کے حکم سے اور جو ناپاک ہے اس میں نہیں نکلتا مگر ناقص یوں
پھیر پھیر کر بتلاتے ہیں ہم آیتیں شکر گزار لوگوں کو۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے روئے ارض پر زندگی اور حیات کے تعلق سے ساری منصوبہ
ربانی کھول کر بتادی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱) ان الله فالق الحب والنوى 'يخرج الحي من الميت و يخرج الميت
من الحي ذلکم الله فانی یوفکون (الانعام: ۹۵)

ترجمہ: بے شک اللہ پھوڑنے والا ہے دانہ اور گٹھلی نکالتا ہے مردہ سے زندہ اور نکالنے والا
بے زندہ سے مردہ یہ ہے اللہ پھر تم کدھر بکے جاتے ہو؟

(۲) فالق الا صبح و جعل الیل سکنا و الشمس والقمر حساباً ذلک
نقدیر العزیز العلیم (الانعام: ۹۶)

ترجمہ: پھوڑ نکالنے والا صبح کی روشنی کا۔ اور اس نے رات بنائی آرام کو اور سورج اور چاند
حساب کیلئے۔ یہ اندازہ رکھا ہوا ہے زور آور خبردار کا۔

(۳) وهو الذی جعل لکم النجوم لتہتدوا بہا فی ظلمت البر والبحر قد فصلنا الایت لقوم یعلمون (الانعام: ۹۷)

ترجمہ: اور اسی نے بنادیئے تمہارے واسطے ستارے کہ ان کے وسیلہ سے راستے معلوم کرو اندھیروں میں خشکی اور پانی کے۔ البتہ ہم نے کھول کر بیان کر دیئے پتے ان لوگوں کے جو جانتے ہیں۔

(۴) وهو الذی انشا کم من نفس واحدہ فمستقر و مستودع قد فصلنا الایت لقوم یفقیہون (الانعام: ۹۸)

ترجمہ: اور وہی ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا ایک شخص سے پھر ایک تو تمہارا ٹھکانا ہے اور ایک امانت رکھنے کی جگہ۔ البتہ ہم نے کھول کر سنائیئے پتے اس قوم کو جو سوچتے ہیں۔

(۵) وهو الذی انزل من السماء ماء فاخرجنا بہ نبات کل شی فَاخرجنا منہ خضرًا نخرج منہ حیاً متراکبا و من النخل من طلعہا قنوان دانیۃ و جنت من اعیاب والزیتون والرمان مشتبہا و غیر متشابہ انظرو الی ثمرہ اذا اثمر و ینعہ ان فی ذلکم لایت لقوم یؤمنون (الانعام: ۹۹)

ترجمہ: اور اسی نے اتارا آسمان سے پانی پھر نکالی ہم نے اس سے اگنے والی ہر چیز پھر نکالی اس میں سے سبزہ جس سے ہم نکالتے ہیں دانے ایک پر ایک چڑھا ہوا اور کھجور کے گانھے میں سے پھل کے گچھے جھکے ہوئے اور باغ انگور کے اور زیتون کے اور انار کے آپس میں ملتے جلتے اور جدا جدا بھی دیکھو ہر ایک درخت کے پھل کو جب وہ پھل لاتا ہے اور اس کے پکنے کو۔ ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ایمان والوں کے واسطے۔

(۶) فکلوا مماذ کرا سم اللہ علیہ ان کنتم بایتہ مومنین (الانعام: ۱۱۸)

ترجمہ: سو تم کھاؤ اس جانور میں سے جس پر نام لیا گیا ہے اللہ کا اگر تم کو اس کے حکموں پر ایمان ہے۔

(۷) وهو الذی انشا جنت معروشت و غیر معروشت و النخل و الزرع مختلفا اکلہ و الزیتون و الرمان متشابہا و غیر متشابہ کلوا من ثمرہ اذا اثمر و آتوا حقہ یوم حصادہ ولا تسرفوا انہ لا یحب المترفین (الانعام: ۱۴۱)

ترجمہ: اور اس نے پیدا کئے باغ جو ٹیٹوں پر چڑھائے جاتے ہیں اور جو ٹیٹوں پر نہیں چڑھائے جاتے اور پھل کے درخت اور کھیتی الگ الگ قسم کے ہیں ان کے پھل اور پیدا کیا زیتون اور انار ایک دوسرے کے مشابہ اور جدا جدا بھی۔ کھاؤ ان کے پھل میں سے جس دن پھل لاویں۔ اور ادا کرو ان کا حق جس دن ان کو کاٹو اور سرف نہ کرو۔ بے شک اس (اللہ) کو وہ لوگ پسند نہیں جو سرف کرتے ہیں۔

(۸) وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُولَةٌ وَفَرَشًا كُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوا

خَطَوَاتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (الانعام: ۱۴۲)

ترجمہ: اور پیدا کئے مواشی بوجھ اٹھانے والے اور زمین سے لگے ہوئے کھاؤ اللہ کے رزق میں سے اور مت چلو شیطان کے قدموں پر بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اگر اس پورے ماڈل پر غور کیا جائے تو تین باتوں کا علم ہوتا ہے:

(۱) روئے ارض پر اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا اور بنی آدم کیلئے حیات یعنی مستقر، متاع اور مقصد کیلئے کیا نظم فرمایا تھا؟ اور اس کا کون سا درجہ رکھا تھا؟ یہ وہی درجہ ہے جس کا ذکر آیات: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ مَا اَرِيْدُ مِنْهُمْ مِنْ رِّزْقٍ وَمَا اَرِيْدُ اَنْ يَطْعَمُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (الذاریات: ۸-۵۶)

(ترجمہ: اور میں نے جو خلق کئے ہیں جن اور آدمی سوا اپنی عبادت کو۔ میں نہیں چاہتا ان سے روزینہ اور نہیں چاہتا کہ مجھ کو کھلائیں۔ اللہ جو ہے وہی ہے (زاق زور آور مضبوط)۔ میں کیا گیا ہے۔

حضرات آدم و حوا اسی سطح پر تھے۔ اگر آج پورا بنی نوع آدم اسی سطح پر جما ہوتا تو روئے ارض کی کروڑوں مخلوقات کی طرح بنی آدم کی پوری آبادی کو اللہ بغیر کسب کئے روزانہ زندگی کی ہر ضرورت پوری کراتا۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی جانب سے سب کچھ سمجھانے اپنی ساری منصوبہ بندی کو واضح کر کے بیان کرنے، تمام خطرات سے آگاہ کرنے اور مقصد تک پہنچنے کی آسان ترین راہ بتانے کے باوجود فساد برپا ہو ہی گیا۔ یہی وہ فساد ہے جو حضرات آدم و حوا کے زمین پر آنے اور حضرت نوح کے مبعوث کئے جانے کے مابین برپا ہوا۔ اسی لئے سورۃ الاعراف میں اس تنبیہ فساد کے فوراً بعد

حضرت نوح کے مبعوث کئے جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ پورا عہد کئی ہزار سالوں پر مشتمل ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان ہزاروں سالوں میں روئے ارض پر آخر ہوا کیا تھا؟ لیکن اس حادثہ کو سمجھنے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ روئے ارض کی صورتحال حادثہ کے وقت کیا تھی؟
 روئے ارض کی صورتحال: اس وقت روئے ارض پر جو صورتحال تھی اسے اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

(۱) روئے ارض پر غذا کی صورتحال:

اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا اور بنی آدم کیلئے بنیادی طور پر تین غذائیں پیدا کیں:

(۱) پانی

(۲) جسم

(۳) جسم کا پھل

پانی: روئے ارض پر حیات کیلئے بنیادی چیز پانی ہے۔ فی الواقع جسم اور جسم کا پھل اسی پانی سے پیدا کئے گئے

جسم: جسم کے بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ نے کئی اقسام پیدا کئے جو درج ذیل ہیں:

(۱) نباتات کا جسم۔ تنا، جڑ، ڈنڈھل اور پتی

(۲) حیوانات کا جسم۔

(۱) چرند کا جسم۔ بکری، اونٹ، گائے، ہرن وغیرہ کا گوشت

(۲) پرند کا جسم: مرغ، چتر وغیرہ کا گوشت

(۳) مائی حیوانات کا جسم۔ مچھلی وغیرہ کا گوشت

جسم کا پھل یعنی پیداوار:

(۱) نباتات کا پھل۔ پھل، پھول، گٹھلی، پھول کی پتی، گوند وغیرہ

(۲) حیوانات کا پھل۔ دودھ، شہد وغیرہ

(۳) انسان کا پھل۔ ماں کا دودھ۔

(۲) روئے ارض پر لباس کی صورت حال:

(۱) نباتات سے حاصل ہونے والے لباس: پتیوں سے بنا لباس، ریشوں سے بنا لباس

وغیرہ

(۲) حیوانات سے حاصل ہونے والے لباس: چمڑے سے بنا لباس، ہڈیوں سے بنا لباس

وغیرہ

(۳) روئے ارض پر رہائش کی صورتحال:

(۱) نباتات سے حاصل ہونے والی رہائش: لکڑی سے بنی رہائش، پتیوں سے بنی رہائش وغیرہ

(۲) جمادات سے حاصل ہونیوالی رہائش: غار، پتھروں سے بنی رہائش، مٹی سے بنی

رہائش وغیرہ

(۳) حیوانات سے حاصل ہونے والی رہائش: چمڑے سے بنی رہائش وغیرہ

(ج) روئے ارض پر سرف کا آغاز:

اگر قدرت نظر سے غور کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے روئے ارض پر انسانوں کیلئے زیست گاہ ہی

ماڈل پسند فرمایا تھا جسے 'من و سلوی ماڈل' (Man & Salwa Model) کہا جاتا ہے یا یوں

کہا جائے کہ من و سلوی ماڈل دراصل اسی اولین ماڈل کی بازیافت تھا جو روئے ارض پر اللہ تعالیٰ

نے بنی آدم کیلئے قائم فرمایا تھا جسے بنی اسرائیل نے رد کر دیا۔ اس 'من و سلوی ماڈل' کے بنیادی

امور درج ذیل تھے۔

(۱) غذا، لباس اور رہائش کی ضروریات قدرت کی بلا قیمت دی گئی نعمتوں سے پوری

ہوں۔

(۲) غذا، لباس اور رہائش کی ضروریات کی تکمیل کیلئے معیار مطلوب صرف جارحہ متصل

مثلاً ہاتھ پاؤں، پیٹھ یا زیادہ سے زیادہ جارحہ منفصل مثلاً لاشی، پتھر، لکڑی وغیرہ کے بنے جارحہ

سے ہو۔

(۳) غذا، لباس اور رہائش کی ضروریات کیلئے موکی صورتحال مثلاً ٹھنڈک میں گرمی، گرمی

میں ٹھنڈک کیلئے قدرتی صورتحال سے تکمیل ہو مثلاً جاڑے میں دودھ کا تھنوں سے گرم گرم ٹکنا اور

کنویں یا تالاب کے پانی کا گرم ٹکنا یا زیادہ سے زیادہ دن کی دھوپ میں یا پتھروں پر دودھ کا گرم

کیا جانا یا چمڑے میں جسم کا گرم کیا جانا۔

ان تمام امور کیلئے قدرت نے روئے ارض پر پورا پورا لظہم فرمایا تھا۔ اور ان میں سے کسی

شے کے لئے 'کسب' کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ غور کیا جائے کہ انسان کے علاوہ ساری مخلوقات روئے ارض پر اسی ماڈل پر اب بھی قائم ہیں۔ انسان بھی روئے ارض کی مخلوق ہوتے ہوئے اب ان سے بالکل مختلف ہو گیا ہے اور اس کی زندگی زیادہ سے زیادہ مصنوعی اور کم سے کم فطری رہ گئی ہے۔

روئے ارض پر 'سرف' کا آغاز فی الواقع ابلیس کی تحریک پر ہوا۔ یہ ابلیس ہی کی کوشش تھی کہ روئے ارض پر علم طبیعیات (Physical Science) اور علم ہنر (Technology) کا پھر اسی طرح آغاز ہوا جس طرح الجنتہ میں ہوا تھا۔ اس بار اس کا آلہ کار حضرات آدم و حوا نہیں بلکہ ان کی پہلی اور عند اللہ ناجائز و نامقبول اولاد قانیل بنی۔

قانیل کا جرم: ابلیس نے جو سب سے بڑا فساد روئے ارض پر ڈالا وہ یہ تھا کہ اس نے قانیل کو اس بات کیلئے اکسایا کہ وہ مذکورہ 'من و سلوی ماڈل' کو درہم برہم کر دے۔ چنانچہ قانیل کو اس تعلق سے ابلیس نے مخصوص ہدایات دیں اور اسے اکتشافی علم، اکتشافی ہنر اور اکتشافی عمل کی طرف راغب کیا اور انفاقی علم، انفاقی ہنر اور انفاقی عمل کو خیر آباد کہنے کیلئے متحرک کیا۔ چنانچہ قانیل نے روئے ارض پر اسی گناہ کا ارتکاب کیا جو حضرات آدم و حوا سے الجنتہ میں ہوا تھا۔

قانیل نے انفاقی علم، انفاقی ہنر اور انفاقی عمل کو خیر آباد کہہ دیا جس پر حضرات آدم و حوا اور ان کی دیگر ذریعات عمل پیرا تھیں۔ اور پھر قانیل نے روئے ارض پر علم طبیعیات (Physical Science) اور علم ہنر (Technology) کو توسیع دینے کا براہ راست اقدام کیا۔

(۱) سرف کا آغاز: چنانچہ قانیل نے سب سے پہلا فساد غذا اور اس کے حصول میں سرف کے آغاز سے کیا۔ اس نے 'من و سلوی ماڈل' کی طرح از خود حاصل ہونے والی غذا کو 'ترجیحی غذا' (Preferred Food) میں بدلنا چاہا۔ اسے اب وہ غذائیں مطلوب نہیں تھیں جو قدرت از خود روئے ارض پر پیدا کر رہی تھی بلکہ اس نے چاہا کہ روئے ارض پر اپنی خواہش اور پسند کے مطابق غذا اگائے۔ اور اس طرح قانیل نے 'کاشت' کا آغاز کیا۔ 'کاشت' ایک 'ترجیحی غذا' کا حصول تھی۔ جو 'من و سلوی ماڈل' کی ضد اور اسے فساد زدہ کر دینے والی تھی۔ اس کیلئے قانیل نے متصل جارحہ مثلاً ہاتھ اور منفصل جارحہ مثلاً لٹھی کے بجائے آلہ یا اوزار (Instrument) یعنی ہل اور جوئے بنائے۔ اور اس طرح علم ہنر (Technology) کو جارحہ (Tool) کی

سطح سے آلہ و اوزار (Instrument) کی سطح پر توسیع دے دی۔

اس طرح روئے ارض پر بیک وقت دو بنیادی توسیع ہوئے جو دو بنیادی فسادات تھے۔ پہلا فساد تھا زراعت اور دوسرا صنعت۔ اس کی ایک دوسری ترتیب بھی ممکن ہے یعنی پہلا فساد تھا صنعت اور دوسرا فساد تھا زراعت۔ یعنی پہلے ہل بنائے گئے پھر کاشت ہوئی۔

روئے زمین کے تین بنیادی توسیع اور فساد: روئے ارض پر پوری انسانی تاریخ میں آدم و حوا کے بسائے جانے سے لیکر آج تک جب کہ انسان خلائی دور میں ہے خواہ اس کے کتنے ہی دائرے پورے ہوئے ہوں بنیادی طور پر صرف تین توسیعات ہوئیں اور یہی تین توسیعات تین بنیادی فساد ہیں: آج ترقی یافتہ معاشرے میں خواہ کروڑوں کام ہو رہے ہوں اور ان کی کتنی ہی خصوصیات (Specialisation) ہوں وہ سب بنیادی طور پر انہیں تین توسیعات کے ذیل میں ہیں۔ یہ تین توسیعات درج ذیل ہیں:

(۱) صنعت یعنی (Manufacturing)

(۲) زراعت یعنی (Agriculture) اور

(۳) تجارت یعنی (Exchange)

بعض صحائف کے مطابق قانبل ہی پہلا 'صناع' (Manufacturer) اور پہلا

زراعت (Agriculturist) تھا۔ ممکن ہے وہی پہلا تاجر (Exchanger) بھی ہو۔

ایسا لگتا ہے کہ اس پہلے فساد کے بعد دوسرے فسادات کا آغاز ہوا اور اس بار یہ فساد بیک

وقت زندگی کے تینوں شعبوں کو محیط ہو گیا۔ یہ تینوں فسادات تین شعبوں سے متعلق تھے جن کے جلو

میں علم طبیعیات اور علم ہنر کے فسادات کا سلسلہ جلوہ گر ہوتا چلا گیا۔

(۱) طباشت (Cooking): یہ دوسرے مرحلے کا فساد ہے جس کا تعلق غذا کے حصول

سے آگے جا کر فطری اور مفت اکل و شرب (Intake) کے بجائے مصنوعی اور ترجیحی اکل و

شراب (Artificial & Preferred Intake) سے ہے۔ چنانچہ طباشت

(Cooking) کا فساد شروع ہوا جس نے علم ہنر (Technology) میں 'آگ بنانے'

(To get fire) کا آغاز کیا۔ آگ بہت بڑا آلہ یا اوزار (Instrument) تھا جس کا

حصول کیا گیا۔

(۲) حیاکت (Weaving): یہ بھی دوسرے مرحلے کا فساد ہے جس کا تعلق لباس کے حصول سے آگے جا کر 'فطری اور مفت ملبوس' (Natural & Free Garments) سے آگے جا کر 'مصنوعی اور ترجیحی ملبوس' (Artificial & Preferred Garments) سے ہے۔ چنانچہ حیاکت (Weaving) کا فساد شروع ہوا۔ جس نے علم ہنر (Technology) میں انسان کو جارحہ سے آگے آلہ تک پہنچا دیا۔

(۳) عمارت (Building): یہ بھی دوسرے مرحلے کا فساد ہے جس کا تعلق رہائش کے حصول سے آگے جا کر 'فطری اور مفت رہائش' (Natural & Free Abode) سے آگے جا کر 'مصنوعی اور ترجیحی رہائش' (Artificial & Preferred Abode) سے ہے۔ چنانچہ عمارت (Building) کا فساد شروع ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ قاتیل ہی دراصل وہ پہلا شخص ہے جس نے اس فساد کا آغاز کیا۔ مشہور ہے کہ قاتیل پہلا عمار (City-Builder) تھا۔

(۸) (الف) سنت کی حقیقت: سنت نبوی ﷺ 'سنت قائمہ' کی تخری، مکمل اور جامع ترین شکل یا بالفاظ دیگر 'سنت قائمہ' پر قائم کردہ نمونہ ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ روئے ارض پر 'سنت قائمہ' کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ رسولوں اور انبیاء کی روئے ارض پر وہ سنت جو 'سنت اللہ' کی عکس اور اس پر پورا عمل کرنے کا نمونہ ہے دراصل وہی 'سنت قائمہ' ہے۔ اس سنت کی تین بنیادی خصوصیات ہیں:

(۱) حسنہ: یہی سنت 'سنت حسنہ' ہے۔ یعنی حقیقت، عمل اور مقصد برآری کے اعتبار سے یہی سب سے بہتر طریقہ ہے۔

(۲) سمحہ: یہی سنت 'سنت سمحہ' ہے۔ یعنی یہی طریقہ اپنی حقیقت، اپنے عمل درآمد میں آسانی اور مقصد برآری میں یقینی ہونے کے اعتبار سے سب سے بہتر ہے۔

(۳) ضعیفہ: یہی سنت 'سنت ضعیفہ' ہے۔ یعنی یہی طریقہ اپنی حقیقت، اپنے عمل درآمد اور اپنی مقصد برآری کے اعتبار سے 'سنت اللہ' کا بالکل عکس اور مثل ہے۔

(ب) اقامت سنت: اللہ کے تمام رسولوں کی بعثت کے بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد 'اقامت سنت قائمہ' ہے۔ غور کیا جائے تو اقامت سنت قائمہ دراصل اس 'سنت اللہ' کی جس کو ابلیس کی تحریک اور اس کے نتیجے میں انسانوں کی گمراہی یا غفلت نے روئے ارض پر منہدم کر دیا

ہے، از سر نو بحالی اور اس کا از سر نو اجراء اور رواج ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمام انبیاء اور بالخصوص رسول انبیاء کی بنیادی ذمہ داری روئے ارض پر اس 'ماڈل' پر انسانوں کو از سر نو قائم کر دینا ہی ہے جس پر بنی نوع آدم اس روئے ارض پر بسائے گئے تھے اور پھر اسی منہج پر ان کی قیادت کرنا تاکہ اس مقصد کے حصول کی صورت پیدا ہو جو اس نوع آدم کا فرض منہجی ہے۔ یہی منہدم شدہ وہ 'ماڈل' ہے جس کی از سر نو اقامت کی جدوجہد حضرت نوح علیہ السلام نے فرمائی، یہی وہ 'ماڈل' ہے جس کی بحالی کی کوشش حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہی وہ کوشش تھی جسے تاریخ 'من و سلوئی' ماڈل کے نام سے جانتی ہے۔ اور یہی وہ اکمل و احسن بحالی تھی جو نبی آخر الزماں ﷺ کے ذریعہ سنت نبوی ﷺ کی صورت میں انجام پذیر ہوئی۔ سنت نبی ﷺ جو عہد نبوی تا قیامت 'سنت قائمہ' کی سب سے جامع شکل ہے دراصل روئے ارض پر برپا ہر طرح کے 'سرف'، سحر اور اسکی ہر توسیع کا خاتمہ اور اس کی جگہ 'سنت اللہ' کی بحالی یعنی علم، ہنر اور عمل کی انسانی انفاقی سطح اور انفاقی درجہ پر بحالی کا دوسرا نام ہے۔

اس مقام پر دو سوالات قابل بحث ہیں:

(۱) پہلا سوال: 'مدون فقہ اور مدون حدیث' سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلاں عمل سنت نبوی ہے اور فلاں عمل سنت نبوی نہیں ہے مثلاً مسواک کرنا، داہنے ہاتھ سے کھانا کھانا، اور اسی طرح دیگر سینکڑوں امور جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سنت نبوی ﷺ ہیں۔ چنانچہ محدثین کرام نے ایسی احادیث کو 'سنن' کے نام سے جمع فرمایا ہے۔ اہل فقہ اسلامی اس سے آگے جا کر 'حکم' کی تحقیق کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ مثلاً فلاں عمل سنت نہیں ہے۔ محدثین کرام تو صرف اس پر حصہ کرتے ہیں کہ فلاں عمل 'سنت نبوی ﷺ' ہے لیکن 'اہل فقہ اسلامی' تو اس سے آگے جا کر یہ بھی حکم لگاتے ہیں کہ فلاں عمل سنت نبوی ﷺ نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے جا کر وہ یہ بھی 'حکم' فرماتے ہیں کہ فلاں عمل سنت نبوی کے کس درجہ میں ہے یعنی فلاں عمل 'سنت' موکدہ ہے اور فلاں 'سنت' مستحبہ ہے۔ ان کی کیا حقیقت ہے؟

ان کی حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ہی نقطہ ہاکی نظر 'سنت قائمہ' اور اس کی جامع ترین شکل اور آخری نمونہ۔ آنحضور ﷺ کی سنت نبوی ﷺ کی اصلی صورت کو مسخ کرنے والے ہیں۔ محدثین کرام کا ذکر تو بہر حال بعد میں آنا چاہئے اس لئے کہ 'مدون حدیث' 'مدون فقہ' کے بہت

بعد کا عمل ہے۔ پھر ان محدثین کے ذریعہ سنت کے 'مسخ' کرنے کا عمل کمتر درجہ کا ہے۔ ان سے یہ کام اس طرح ہو گیا کہ انہیں جو روایتیں ملیں اس کی انہوں نے تہویب و تدوین کر دی۔ آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے زمانے کی دوری اور ان سے 'فہم دین' کے اخذ کی راہ میں پیدا ہو جانے والی معنوی فصل کے سبب بہت سے امور دین میں محدثین کرام ان روایتوں کی کنہہ تک نہ جاسکے اور اسی لاعلمی میں روایت کی موجودہ ترتیب قائم کر دی۔ چنانچہ ایک جانب حقیقت سے لاعلمی اور دوسری جانب حقیقت کو مترشح کرنے والی اور ان پر مبنی روایتوں کو ترتیب دینے میں جو ادارتی عمل ان سے سرزد ہوا وہ بعض اوقات 'سنت نبوی' ﷺ کی شکل بدل دینے والا بن گیا۔ اس کو مزید مسخ کرنے کی ذمہ داری 'وضع حدیث' کی سازش پر بھی عاید ہوتی ہے۔ اس طوفان نے محدثین میں موجود صحیح روایتوں کو من و عن دانقوں سے پکڑنے اور ان پر حصر کرنے اور موضوع روایتوں کو رائج نہ ہونے دینے کی وہ صورت حال پیدا کر دی جس سے وہ شکل بن گئی جو بالآخر چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں محدثین کے یہاں باضابطہ نسخ صورت میں پائی جاتی ہے۔ لیکن جہاں تک 'اہل فقہ اسلامی' کا معاملہ ہے تو ان کا عمل تو ہر اس 'سنت' کی شکل بدل دینے بلکہ اس کو تلپیٹ کر دینے والا تھا۔ خصوصاً اس حالت میں کہ اس کی تدوین اس حالت میں ہوئی کہ ابھی احادیث کا ایک بھی جامع ذخیرہ مدون نہیں ہو سکا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کہنا کہ تدوین فقہ کرتے وقت اہل فقہ کے پاس یہ پورا ذخیرہ احادیث موجود تھا خلاف واقعہ بات ہوگی اگر ایسا ہی تھا تو لازماً اس صورت میں یہ بھی ماننا ہوگا کہ اس ذخیرہ احادیث کے غٹ و کمین کی چھان پھٹک بھی ہو گئی ہوگی۔ یعنی پہلے (۱) ذخیرہ احادیث کا جمع ہونا (۲) پھر ان کی چھان پھٹک ہونا اور تب کہیں جا کر (۳) تیسرے مرحلے میں ان کی بنیادوں پر تدوین فقہ کا عمل ہونا تسلیم کرنا ہوگا۔ اگر واقعی ایسا ہی تھا تو سن 140 ہجری کے بعد امام بخاری متوفی 256 ہجری، امام مسلم متوفی 261 ہجری، امام ترمذی متوفی 279 ہجری اور ابن ماجہ متوفی 273 ہجری تک کس کام میں لگے تھے؟ اور اس سے زیادہ بڑی بات یہ کہ کیوں لگے تھے؟ لیکن سب سے اہم بات یہ کہ ایسا وہ ایک کمرے میں بیٹھ کر یعنی (Table-work) کے بطور کیوں نہیں کر رہے تھے اور اس کے بجائے قریہ قریہ، شہر شہر ملک ملک جا کر جمع حدیث کا کام انجام دینے پر کیوں مجبور تھے؟ آخر ایسا کیوں تھا؟

واقعہ یہ ہے کہ محدثین کرام اپنے خلوص کے باوجود بوجہ یہ جاننے سے قاصر تھے کہ وہ کیا 'سنت اللہ' تھی جس پر روئے ارض میں 'سنت قائمہ' قائم ہوئی اور جس پر ہر زمانے میں انبیاء کرام اور صلحاء عمل پیرا رہے اور جس کے انہدام کے بعد اسے از سر نو قائم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے رسول اپنی سنت کے ساتھ آتے رہے اور جسے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے از سر نو اور احسن و اکمل شکل میں اپنی 'سنت نبوی' صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ قیامت تک کے لئے قائم فرمادیا۔

اس کے برخلاف 'فقہا کرام' کا عمل تو ایک سوچا سمجھا عمل معلوم ہوتا ہے ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے دراصل اس بات کی کوشش شروع کی کہ وہ 'سنت قائمہ' جسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی 'سنت نبوی' صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں قائم فرمادی ہے از سر نو منہدم ہو جائے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

ان دونوں صورتحال کا ہی وہ نتیجہ تھا کہ امت میں 'سنت نبوی' صلی اللہ علیہ وسلم یعنی مکمل سنت قائمہ کا فہم جاتا رہا۔ اگر لوگ اس 'سنت قائمہ' کو جانتے ہوتے جس کی از سر نو اقامت اور تکمیل کے لئے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر 'سنت نبوی' صلی اللہ علیہ وسلم قائم فرمائی تھی تو تدوین حدیث میں وہ صورتحال پائی نہ جاتی جواب ہے۔ اگر لوگ اس 'سنت قائمہ' کو جانتے جس کی اقامت کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ عمل کیا جس سے وہ 'سنت نبوی' قائم ہوئی جسے آج سنت کہا جاتا ہے تو لوگ یہ بھی جانتے کہ:

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسواک کیوں کرتے تھے؟ یعنی مسواک کرنا سنت نبوی ہے لیکن وہ کون سی 'سنت قائمہ' ہے جس کی از سر نو اقامت، بحالی یا رواج کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسواک کرنے کی سنت قائم فرمائی؟

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 'ہل' دیکھ کر کیوں فرمایا کہ جس گھر میں یہ داخل ہو وہاں 'ذل' آجاتا ہے؟ یعنی وہ کیا 'سنت قائمہ' ہے جس کی بحالی کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا؟

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں فرمایا کہ جس گھر والوں میں کھجور ہو وہ گھر والے بھوکے نہیں؟

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں فرمایا کہ بہترین سالن سرکہ ہے؟

(۵) رسول ﷺ کے عہد میں ریت گھڑی، دھوپ گھڑی، آبی گھڑی حتیٰ کہ میکانیکی گھڑی اور کلینڈر بھی رائج تھے۔ پھر وہ کون سی سنت قائم تھی جس کی بحالی اور اقامت کے لئے آپ نے طلوع، زوال، فتنے، حیط الابيض، حیط الاسود، اور غسق اور اہلۃ کی اور رویت کی سنت نبوی قائم فرمائی۔

(۶) آپ ﷺ کے عہد میں میزائل مثلاً منجنيق، آرمرڈ کار اور ٹینک مثلاً طرح طرح کے رتھ رائج تھے۔ وہ کون سی سنت قائم تھی جس کی اقامت کے لئے آپ نے غزوہ احزاب میں صرف خندق کھودنے اور موجودہ تھیاردوں کو استعمال کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی اور نہ آلات حرب کی جنگی پیمانے پر تیاری کی حالانکہ آپ کا کم از کم ایک بار یعنی غزوہ تبوک میں عملاً مقابلہ ایک سو پر پاور (Super Power) سے ہوا تھا، نہ ان کی خرید کا سامان کیا۔ حتیٰ کہ جب 'ذات انواط' کو دیکھ کر بعض اصحاب نے اس کی خواہش کی تو آپ نے فرمایا کہ کیا تم لوگ بھی اسی طرح کہنا چاہتے ہو جیسا موسیٰ کی قوم نے موسیٰ سے کہا تھا؟

(۷) وہ کیا سنت قائم تھی جس کی از سر نو بحالی کے لئے آپ ﷺ نے گھوڑے کی پیشانی کے بال پکڑ کر فرمایا اس میں برکت ہے اور اس کے بول و براز میں تمہارے لئے اجر ہے؟

(۸) وہ کیا سنت قائم تھی جس کی از سر نو اقامت کے لئے آپ نے فرمایا کہ سات جنگوں پر نماز نہ پڑھو اور ان میں دو مقامات تھے بیت اللہ کی چھت کے اوپر اور ارض بابل؟

(۹) وہ کیا سنت قائم تھی جس کی از سر نو اقامت کے لئے آپ نے فرمایا کہ اگر تم لوگ نکل جانے پر ہی مجبور ہو تو زمین جہش کی طرف نکل جاؤ۔ اور اس کے اسباب میں ایک وجہ یہ تھی کہ وہ ارض صدق ہے؟

(۱۰) وہ کیا سنت قائم تھی جس کی از سر نو بحالی اور اقامت کے لئے آپ نے فرمایا: الفطرہ پانچ ہیں، ختنہ کرنا، مو سے زیر ناف صاف کرنا، مونچھیں پست کرنا، ناخن کاٹنا اور بغلوں کے بال اکھاڑنا؟

(۱۱) وہ کیا سنت قائم تھی جس کی از سر نو بحالی اور اقامت کے لئے آپ نے قزع (ٹیک چھوڑنے) سے منع کیا۔ مخنثین مرد (مخنثین من الرجال) اور مترجلات عورت (المترجلین من النساء) پر اور اسی طرح مشمکین من الرجال بالنساء اور لمتشبھات من النساء بالرجال پر لعنت فرمائی؟

(۱۲) وہ کیا سنت قائم تھی جس کی از سر نو اقامت کے لئے آپ ﷺ نے

الواصلہ، المسترسلۃ، الواشمۃ، اور المستوشمہ پر لعنت فرمائی؟

(۱۳) وہ کیا سنت قائم تھی جس کی از سر نو اقامت اور بحالی کے لئے آپ ﷺ نے

الواشمات، المستوشمات، المتمصات، المتفلجات للحسن کو خلق اللہ میں

تبدیلی (الغیرات خلق اللہ) قرار دیکر ان پر لعنت فرمائی؟

(۱۴) وہ کیا سنت قائم تھی جس کی از سر نو اقامت اور بحالی کے لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ

کرگٹ الفویسق ہے؟

(۱۵) وہ کیا سنت قائم تھی جس کی از سر نو اقامت اور بحالی کے لئے آپ ﷺ نے فرمایا:

مسلمان کا بہترین مال چند بکریاں ہوں گی؟

(۱۶) وہ کیا سنت قائم تھی جس کی از سر نو اقامت اور بحالی کے لئے آپ ﷺ نے فرمایا:

پانچ فواسق ہیں۔ انہیں حرم شریف میں بھی قتل کر دیا جائے۔ الفجار، العقرب، الحدیاء،

الغراب، الکلب العقور؟

(۱۷) وہ کیا سنت قائم تھی جس کی از سر نو اقامت و بحالی کے لئے ایک طرف توفیق مکہ کے

دن آپ ﷺ نے فرمایا کہ آج کے دن پہلی بار آخری بار حرم مجھ پر حلال کر دیا گیا ہے۔

اور دوسری طرف آپ ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ایوم یوم الحمتہ (آج خون بہانے کا

دن ہے) کہنے پر ان کے ہاتھوں سے جھنڈا لے لیا اور فرمایا ایوم یوم الرحمتہ (آج مرحمت کا دن

ہے)؟

(۱۸) وہ کیا سنت قائم تھی جس کی از سر نو اقامت و بحالی کے لئے آپ نے حضرت عثمانؓ

سے فرمایا اللہ تعالیٰ تم کو ایک قمیص پہنائے گا۔ لوگ تم سے مطالبہ کریں گے کہ یہ قمیص اتار دو۔ اے

عثمان یہ قمیص نہ اتارنا خواہ اس میں تمہاری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ اور اے عثمان آدم کے

بیٹے کی طرح عمل کرنا؟

(۱۹) وہ کیا سنت قائم تھی جس کی از سر نو اقامت و بحالی کے لئے آپ ﷺ نے حضرت

علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا: اے علی! لوگ تم کو قتل کر دیں گے۔ تم صبر کرنا؟

(۲۰) وہ کیا سنت قائم تھی جس کی از سر نو اقامت و بحالی کے لئے آپ نے حضرت رافع

رضی اللہ عنہ کی اس وقت تنبیہ فرمائی جب حضرت رافع کے ذریعہ بکری کے دونوں دست ہانڈی سے نکال کر آنحضور ﷺ کو پیش کرنے اور آپ ﷺ کے ذریعہ دونوں دست نوش فرمالینے کے بعد مزید دست کا مطالبہ کرنے پر حضرت رافع نے فرمایا: اے اللہ کے رسول بکری میں دو ہی دست ہوتے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: اے رافع اگر تم نے یہ نہ کہا ہوتا اور میرے کہنے پر ہانڈی سے نکالتے جاتے تو جتنے دست چاہتے اتنے دست نکلتے؟

(۲۱) وہ کیا 'سنت قائمہ' تھی جس کی از سر نو اقامت و بحالی کے لئے آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم مجھے دو چیزوں کی ضمانت دو جو تمہارے دونوں جبڑوں کے درمیان اور دونوں جاتھوں کے درمیان ہے تو میں تمہیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں؟

(۲۲) وہ کیا 'سنت قائمہ' تھی جس کی از سر نو اقامت و بحالی کے لئے آپ ﷺ نے ظہر یا عصر میں سے کوئی نماز دو رکعت پڑھائی اور جب ذوالیہدین نامی شخص نے پوچھا اے اللہ کے رسول کیا آپ بھول گئے یا آپ نے قصر کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہ میں بھولا نہ نماز میں کمی ہوئی؟ اور پھر آپ نے نماز پوری کی اور سجدہ کیا پھر سر اٹھا کر تکبیر کہی پھر تکبیر کہی اور سجدہ کیا۔ پھر سر اٹھا کر تکبیر کہی؟

(۲۳) وہ کیا 'سنت قائمہ' تھی جس کی از سر نو اقامت و بحالی کے لئے آپ ﷺ نے فرمایا: دیکھو قیامت سے پہلے ایسے فتنے برپا ہونگے جیسے اندھیری رات کا ٹکڑا۔ آدمی مومن کی طرح صبح کرے گا تو کافر کی طرح شام اور مومن کی طرح شام کرے گا تو کافر کی طرح صبح۔ اس میں بیٹھا ہوا کھڑے سے بہتر ہوگا اور چلنے والا دوڑنے والے سے۔ پس تم ہی کہنا توڑ ڈالنا اور تانت کاٹ ڈالنا؟

یہی وجہ ہے کہ جب 'خلافت علی منہاج النبوۃ' یعنی خلافت راشدہ کے بعد اللہ کے سب سے آخری رسول اور تمام رسولوں کے قائد، نبی آخر الزماں ﷺ کی سب سے بڑی سنت نبوی ﷺ یعنی سب سے بنیادی 'سنت قائمہ'..... 'الحکم' یعنی 'خلافت ملک اللہ' ختم کرنے اور اسے منہدم کر کے تقویٰ کے بجائے موروٹی بنانے کا آغاز ہوا تو چند افراد کو چھوڑ کر بقیہ لوگ یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ روئے ارض پر کتنی بڑی سنت نبوی ﷺ کا خاتمہ کر کے کس عظیم الشان 'سنت قائمہ' کا خاتمہ کیا جا رہا ہے؟

اگر سنت نبوی ﷺ کا فہم اور اس کی روشنی میں 'سنت قائمہ' کا فہم امت میں باقی رہتا تو جس وقت عبدالملک بن مروان خلیفہ اموی اور ہارون الرشید خلیفہ عباسی مسلمانوں میں اپنی فیاضی اور آنحضور ﷺ سے اپنے دلی تعلق کا ثبوت دینے کے لئے مسجد نبوی کی عظیم الشان تعمیر کروا رہے تھے تو اس وقت علماء کرام اور بطور خاص فقہاء کرام نے ان سے پوچھا ہوتا کہ سنت نبوی ﷺ کی یہ خلاف ورزی کیوں کی جا رہی ہے جو دراصل اس چیز کو ڈھا رہی ہے جس کی اقامت کے لئے نبی آخر الزماں تشریف لائے تھے؟ یہاں ایک مخصوص سوال امت میں پائے جانے والے 'فہم سنت' کے تعلق سے کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ مخصوص سوال دراصل کئی سوالات کا مجموعہ ہے جو درج ذیل ہے:

- (۱) کیا عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں فن تعمیر پایا ہی نہیں جاتا تھا؟
- (۲) کیا آپ ﷺ قیصر و کسریٰ کے محلات اور اس کے ایک منزلہ، دو منزلہ، سہ منزلہ عالیشان تعمیراتی نمونوں سے واقف نہ تھے؟
- (۳) کیا ایسے عالیشان خوبصورت تعمیرات بنانے والے عالم عرب میں پائے نہیں جاتے تھے؟
- (۴) کیا وفات نبوی ﷺ تک اہل ایمان مسلسل اتنے مفلوک الحال رہے کہ وہ مسجد نبوی کو بہت، عالیشان نہ سہی مگر ایک خوبصورت تعمیری عمارت میں تبدیل کرنے کے اہل نہ تھے؟
- (۵) کیا اس وقت اہل ایمان کی مرکزیت، ہمہ وقت آمد و رفت اور ضرورت کی مسجد نبوی کے علاوہ کوئی اور جگہ تھی؟
- (۶) کیا اس وقت ایسی مرکزی جگہ اور مقدس مرکز کی تعمیر اہل ایمان کی ترجیحات میں نہ تھیں؟
- (۷) کیا مسجد کی تعمیر معیوب بات تھی؟

اگر یہ سب درست نہیں تو پھر اس حدیث میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ کیا ہے؟ وہ کیا سنت قائمہ تھی جس کی اقامت و بحالی کے لئے آپ ﷺ کوشاں تھے اور 'سنت نبوی' کی اقامت فرما رہے تھے:

عن ابی سلمہ قال سالت اباسعید الخدری فقال جاءت سحابة

فمطرت حتى سال السقف و كان من جريد النخل فاقیمت الصلوة فرایت رسول الله صلى الله عليه وسلم یسجد فی الماء والطين حتی رایت اثر الطین فی جبهته (رواه البخاری کتاب الاذان)

ترجمہ: حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمن سے، انہوں نے کہا میں نے ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے پوچھا: انہوں نے کہا: ایک ابر کا ٹکڑا آیا۔ وہ برسا۔ یہاں تک کہ مسجد کی چھت بننے لگی۔ وہ کھجور کی شاخوں کی تھی ہی۔ پھر نماز کی تکبیر ہوئی۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ کیچڑ پانی میں سجدہ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ کیچڑ کا نشان آپ کی مبارک پیشانی میں میں نے دیکھا۔

(۲) دوسرا سوال: دوسرا سوال محدثین کرام اور فقہاء کرام کے ’فہم سنت نبوی‘ کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً امام مسلم علیہ الرحمہ نے مسلم شریف میں باضابطہ باب باندھا ہے: بسباب وجوب امتثال ما قالہ شرعا دون ما ذکرہ من معائش الدنیا علی سبیل الراۓ۔ (باب آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو شرعاً حکم دیں اس پر چلنا واجب ہے اور جو بات دنیا کی معاش کی نسبت اپنی رائے سے فرما دیں اس پر چلنا واجب نہیں)

اس ذیل میں امام صاحب نے تین حدیثیں درج کی ہیں چنانچہ:

(۱) پہلی حدیث میں کہا گیا: فانی انما ظننت ظناً فلا تؤاخذونی بالظن ولكن اذا حدثکم عن الله شیئاً فخذوا به فانی لن اکذب علی الله عزوجل (ترجمہ: میں نے تو ایک خیال کیا تھا۔ تو مت اختیار کرو میرے خیال کو لیکن جب میں اللہ کی طرف سے کوئی بات کہوں تو اس کو اختیار کرو۔ اسلئے کہ میں اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولنے والا نہیں)

(۲) دوسری حدیث میں کہا گیا: فقال انما انا بشر واذا امرتکم بشی من دینکم فخذوا به واذا امرتکم بشی من رأی فانما انا بشر (ترجمہ: آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک میں آدمی ہوں۔ جب میں کسی بات کا جس کا تعلق تمہارے دین سے ہے حکم کروں تو اسے اختیار کرو اور جب میں کسی بات کا جس کا تعلق میری رائے سے ہے حکم کروں تو (تم کو اختیار ہے کرو یا نہ کرو) پس میں آدمی ہوں)۔

(۳) تیسری حدیث میں کہا گیا: قال انتم اعلم بامر دنیاکم (ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لوگ اپنی دنیا کے معاملات کو (مجھ سے) زیادہ جانتے ہو)۔

محدثین کرام کے یہاں اور ان کے حوالے سے پوری امت میں صحیح ترین حدیثیں وہ سمجھی جاتی ہیں جن کو شیخین نے بیان کیا ہو۔ بعض محدثین کے مطابق مسلم شریف میں مذکور احادیث کا درجہ بخاری سے بھی اونچا ہے۔ یہاں محدثین کرام اور ان کی جمع کردہ ان احادیث کے بارے میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) وہ احادیث کس قدر صحیح ہیں خواہ وہ شیخین کی روایت کردہ ہی کیوں نہ ہوں؟ دراصل یہ سوال اس شعبہ اصول و موازین روایت و درایت سے متعلق ہے جس پر ان محدثین کرام نے عمل فرمایا۔ اس سوال سے یہ مراد نہیں کہ یہ ذخیرہ احادیث مرجع اور قابل اعتناء نہیں۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ وہ اصول و موازین حدیث جو باضابطہ طور پر حاکم نیشاپوری اور خطیب بغدادی سے لیکر ابن حجر عسقلانی تک مضبوط ہوتے رہے اور جن پر جرح و تعدیل کی ساری عمارت کھڑی ہے وہ کس قدر قابل اعتماد ہیں؟۔ ہمیں سے ایک ایسا سوال بھی پیدا ہوتا ہے جو فی الواقع اس پورے نظام دین پر از سر نو غور کرنے پر مجبور کرتا ہے جسے 'علماء وقت' 'حکومت وقت' کے سائے میں پچھلے چودہ سو سالوں سے تعمیر کرتے آرہے ہیں اور وہ سوال یہ ہے کہ 'دین اللہ' کا وہ نقطہ نظر، ہیئت اور توازن جو اب پایا جاتا ہے وہ اصلاً 'سنت اللہ'، 'سنت قائمہ' اور 'سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم' کے مطابق ہے بھی یا نہیں؟ اور یہ سوال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ احادیث جو مذکورہ اصول و موازین روایت و درایت کے مطابق صحیح اور مضبوط تھیں کمزور ثابت ہو جائیں اور وہ احادیث جنہیں کمزور اور ضعیف سمجھی جاتی ہیں مضبوط اور صحیح ثابت ہو جائیں تو اس 'نظام دین' کا کیا ہوگا جو ان بنیادوں پر استوار ہوا ہے جو اس صورت میں آج خود زیر بحث آگئی ہیں؟

(۲) اس تعلق سے دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ محدثین کرام جو بالخصوص تیسری صدی ہجری میں یا اس کے بعد ہوئے ان کا 'فہم دین' خالص تھا یعنی وہی تھا جو حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا تھا یا اس پر اس عہد کی عظیم سازش، حکومتوں کے رویوں اور سب سے زیادہ فقہاء کرام کی 'جسارتوں' اور بالخصوص 'علماء وقت' جو پوری خلافت کے طول و عرض میں لاکھوں کی تعداد میں عدالتوں، سرکاری عہدوں، مساجد، مدارس اور دیگر شعبہ ہای زندگی میں پائے جاتے تھے کا اثر آگیا تھا اور وہ 'فہم دین' دراصل اس معاشرتی صورتحال کو منعکس کر رہا تھا جو ارد گرد میں پایا جاتا تھا اور فی الواقع ان میں اس 'فہم دین' کا فقدان تھا جو حضرات صحابہ کرام کو ملا تھا؟

یہاں علی الترتیب دو باتیں قابل غور ہیں:

- (۱) مسلم شریف کی ان تینوں احادیث کے 'متن' درست ہیں یا نہیں؟
- (۲) امام مسلم نے جو عنوان قائم کیا ہے وہ جس 'فہم دین' پر مبنی ہے وہ درست ہے یا نہیں؟

فی الواقع یہاں ایک تیسرا سوال بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ حدیثیں جو امام مسلم کے نام سے مسلم شریف میں درج ہیں انہیں فی الواقع امام صاحب نے درج بھی کی تھیں یا نہیں یا اگر درج کی تھیں تو وہ من و عن ایسے ہی درج ہوئی تھیں یا نہیں؟ یہ دراصل اس تسلیم شدہ بات پر سوال ہے کہ وہ روایت حدیث جس کا ہر محدث آج تک حدیث، حدیثی، سمعنا، عن فلان، عن فلان کہہ کر ذکر کرتا ہے خود وہ کس قدر صحیح اور درست ہے۔ لیکن ہم تیسرے سوال کو قلم انداز کرتے ہیں اور سر درست یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ فی الواقع امام صاحب نے یہ حدیثیں ایسے ہی درج کی تھیں صرف دو سوالوں پر بحث کرتے ہیں۔

اس تعلق سے سب سے ضروری سوالات ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت سے متعلق پیدا ہوتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

- (۱) کیا ایمان بالرسالت مشروط ہے؟ یعنی کیا دین میں اس کی گنجائش ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت دی ہے کہ انسان انفرادی اور اجتماعی امور میں زندگی کے بعض حصوں پر رسول کی بات مانے اور بعض حصوں پر ماننے اور نہ ماننے کا اسے اختیار ہے؟

(۲) کیا ایمان بالرسالت جزوی ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا قرآن و سنت میں ایسی کوئی تفصیل یا اجمالی اصول بتایا گیا ہے کہ فلاں فلاں امور وہ ہیں جن میں رسول کی بات ماننا واجب ہے اور فلاں فلاں امور میں اختیار ہے؟ اگر صراحتاً ایسی بات موجود نہیں حتیٰ کہ مجمل طور پر کوئی تناسب بھی نہیں بتایا گیا ہے مثلاً یہ کہ ستر فی صد امور زندگی پر رسول کی بات واجب الاتباع ہے اور بقیہ تیس فیصد پر واجب الاتباع نہیں ہے تو اس صورت میں اس آدمی کا کیا حکم ہے جو واجب الاتباع کو گھٹنا کر ایک فیصد کر دے اور اختیاری کو خانوے فیصد؟ پھر کیا قرآن کی کوئی صریح آیت ایسی موجود ہے جس نے یہ صراحت کی ہو کہ یہ 'امور دین' ہیں اور وہ 'امور دنیا'؟

- (۳) اگر امور حیات فی الواقع 'امور دین' اور امور دنیا میں منقسم ہیں تو کیا کوئی ایک قرآنی

آیت یہ بتاتی ہے کہ یہ امور دین ہیں اور وہ امور دنیا؟

فی الواقع قرآن اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سنت صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور عقل یہی بتاتے ہیں کہ ایمان بالرسالت مشروط ہے اور نہ جزوی۔ عقل تو یہاں تک کہتی ہے کہ وہ مشروط اور جزوی ہو ہی نہیں سکتا۔

ایمان بالرسالت کا مشروط اور جزوی ہونا اور امور حیات کا امور دین اور امور دنیا میں منقسم ہونا سنت اللہ کا منہدم کر دیا جانا ہے۔

قرآن اور سنت رسول ﷺ ان امور میں صریح ہیں کہ یہ مشروط اور جزوی ہیں اور نہ منقسم۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاؤُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا. فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يَحْكُمُوا بِمَا فِي كِتَابِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يَرْضُوا لِمَا هُمْ بِحُكْمٍ. (النساء ۶۵)

ترجمہ: اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی واسطے کہ اس کا ہی حکم مانیں اللہ کے فرمانے سے۔ اور اگر وہ لوگ جس وقت انہوں نے اپنا برا کیا تھا آتے تیرے پاس پھر اللہ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کو بخشواتا تو البتہ اللہ کو پائے معاف کرنے والا مہربان۔ سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ تجھ کو ہی منصف جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے پھر نہ پاویں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلہ سے اور قبول کریں خوشی سے۔

(۲) قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ. قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ (آل عمران ۳۱)

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میرا اتباع کرو تا کہ محبت کرے تم سے اللہ اور بخشنے گناہ تمہارے اور اللہ بخشنے والا ہے مہربان۔ آپ کہہ دیجئے اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی۔ پھر اگر اعراض کریں تو اللہ کو محبت نہیں ہے کافروں سے۔

یہ دونوں آیتیں درج ذیل امور میں صریح ہیں:

- (۱) رسول کا ہر اعتبار سے اتباع کیا جائے۔
 (۲) رسول کا اتباع اللہ کا اتباع ہے۔
 (۳) یہ اتباع مشروط ہے نہ جزوی۔
 (۴) رسول کا فیصلہ آخری ہے۔ یعنی وہاں امکان سوال، امکان شک یا امکان نظر ثانی کی کوئی گنجائش نہیں۔

(۵) قل اطیعوا اللہ والرسول سے دیگر معانی کے ساتھ ساتھ یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ جو لوگ رسول کے اتباع کو مشروط جزوی اور امور دین اور امور دنیا میں منقسم مانتے ہیں ان پر لازم آئے گا کہ یہی بات ان کے نزدیک خود اللہ کے لئے بھی متحقق ہو جائے۔ یعنی زندگی کے بعض حصوں میں اللہ کا حکم واجب الاتباع نہیں ہے جبکہ یہ بات ایمان بالرسالت کیا ایمان باللہ کے بھی خلاف ہو جائے گی۔
 آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۱) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : کل امتی یدخلون الجنة الا من ابی قیل ومن ابی قال من اطاعنی دخل الجنة ومن عصانی فقد ابی (رواہ البخاری)
 ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے تمام امتی داخل جنت ہوں گے مگر جس نے انکار کیا۔ سرکار سے دریافت کیا گیا کہ 'کس نے انکار کیا؟' آپ نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے نافرمانی کی اس نے انکار کیا۔

(۲) وعن جابر : والداعی محمد فمن اطاع محمداً فقد اطاع اللہ ومن عصی محمداً فقد عصی اللہ ومحمد فرق بین الناس (رواہ البخاری)
 ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: اور داعی محمد ہیں۔ پس جس نے محمد کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور محمد لوگوں کے مابین (حق و باطل کا) فرق ہیں۔

(۳) وعن عبد اللہ ابن عمر وقال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : لا یؤمن احدکم حتی یکون ھولہ تبعاً لما جئت به (رواہ فی شرح السنة وقال النووی فی اربعینہ ھذا حدیث صحیح رویناہ فی کتاب الحجۃ باسناد صحیح)

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم اس وقت تک ایمان والے ہو ہی نہیں سکتے جب تک تمہاری خواہش اس کے تابع نہ رہے جسے میں لیکر آیا ہوں۔

ان صریح نصوص کی موجودگی میں جو بات سامنے آتی ہے وہ درج ذیل ہے:

(۱) مسلم شریف کی یہ تینوں حدیثیں اور ان کی بنیادوں پر پھیلے نظام دین کے وہ سارے امور جن کا اس 'حکم' سے تعلق ہے جو ان حدیثوں سے نکلتا ہے محل غور ہیں۔

(۲) امام مسلم کے 'فہم دین' کا معاملہ بھی محل غور ہے۔

اس کے متعدد اسباب ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) ان احادیث کے تعلق سے ایسا سمجھنے کی گنجائش تو موجود ہے کہ فی الواقع آنحضور ﷺ نے کہا ہوگا کہ فلاں کام جس طرح مناسب سمجھو کرو۔ یہ اس طرح کی بات ہوئی کہ کسی مثلاً اجتماع کانگراں اعلیٰ اپنے کسی ماتحت کے پوچھنے پر کہ کھانا کیا بنے گا؟ یہ کہہ دے کہ جیسا چاہو بنا لو۔ جب ایسا کہا جاتا ہے تو اس طرح کے فقرہ میں کئی باتیں موجود ہوتی ہیں۔

(۱) یہ مجمل فقرہ دراصل ایک قسم کی ہدایت ہی ہے۔ اس ہدایت کی صورت مختار و مجاز ہدایت یعنی (Delegated Guidance) کی ہے۔ لیکن ایسی ہدایت میں کئی باتیں مفہوم (Understood) ہوتی ہیں:

(الف) جسے ایسی ہدایت دی جا رہی ہے اس پر ہدایت دینے والے کو اعتماد ہوتا ہے کہ وہ کھانے والوں کی تعداد، ان کی نوعیت، حالات، موسم، عادت، بعض لوگوں کی مجبوریوں اور بنیادی اصولوں مثلاً حلال و حرام کی تمیز کی رعایت کرے گا۔

(ب) ایسی ہدایت دے کر وہ دراصل یہ اعتماد ظاہر کرتا ہے کہ ان امور کو سامنے رکھ کر کوئی شخص خود فیصلہ کر لے گا اس لئے بجائے اس کے کہ ہر چھوٹی چھوٹی بات کے لئے اپنے پاس بلائے اسے ہی مجاز قرار دے دیتا ہے کہ وہ خود فیصلہ کر لے۔

اس صورت میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بعض امور کے تعلق سے لوگوں کو خود مجاز قرار دے دیا کہ وہ حسب صورت و حالت و ضرورت فیصلہ کر لیں۔ لیکن یہ کہنا کہ آپ نے امور حیات کی تقسیم کی اور یہ کہ ان میں ایک حصے میں آپ واجب الاتباع

ہیں اور دوسرے حصے میں نہیں خلاف سنت اللہ اور خلاف دین اللہ ہے۔

جہاں تک متون حدیث میں (۱) فانی انما ظننت ظنا فلا تواء خذونی بالظن
ولکن اذا حدثکم عن اللہ شیئا فخذوا بہ فانی لن اکذب علی اللہ عزوجل
(۲) انما انا بشر اذا امرتکم بشیء من دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشیء من
رای فانما انا بشر اور (۳) انتم اعلم بامر دنیا کم کی بات ہے، یہ نہ صرف وظیفہ
رسالت اور حقیقت رسالت کے خلاف ہے بلکہ مقام رسالت اور مقام رسول کی اس سے بڑی
تذلیل اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ یہ پیرایہ بیان نبوی ہو ہی نہیں سکتا۔

جو ذات گرامی سنت اللہ کی جاننے والی روئے زمین پر واحد ذات ہو وہ لوگوں سے یہ
کہے کہ یہ میرا ظن ہے، یا یہ کہ تم اپنی دنیا کے امور کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو ایسا کہنا ایسا ہی ہے بلکہ
اس سے بھی فروتر کہ جیسے کسی دارالعلوم کا شیخ الادب کسی بچے سے جو شرح مائے عامل، میزان اور
منشعب پڑھتا ہو یہ کہے کہ دیکھو کتاب میں اسم، فعل اور ضمیر کیا ہے میں کیا جانوں تم لوگ اس کا علم
مجھ سے بہتر رکھتے ہو لہذا جس لفظ کو مناسب سمجھو اسم قرار دے دو اور جسے مناسب سمجھو فعل قرار
دے دو۔ اور یہ کہ اس تعلق سے میری بات کو ظن سمجھو۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

بفرض محال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ آنحضور ﷺ نے ایسا ہی کیا ہوگا۔ تو احادیث کا
پورا ذخیرہ اس کی گواہی دیتا ہے کہ نعوذ باللہ وہ خود اپنی بات پر پورے نہیں اترے۔ اس تعلق سے
درج ذیل امور قابل غور ہیں:

(۱) آپ ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کو کوئی شخص کیسے سمجھ سکتا ہے کہ فلاں امر آپ کے ظن
سے ہے یا حکم من اللہ ہے تا وقتیکہ آپ ﷺ اپنی ہر ایسی بات، عمل اور تقریر کے تعلق سے یہ
صراحت نہ فرمادیں کہ یہ فلاں ہے فلاں نہیں۔ کیا ایسی بات پورے ذخیرہ حدیث میں کہیں ملتی
ہے؟

(۲) کیا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ تعامل ملتا ہے کہ وہ ہر بات کے تعلق سے یہ
دریافت کریں کہ یہ بات کہاں سے کہی جا رہی ہے؟ یہ حکم من اللہ ہے یا ظن؟

(۳) مثلاً صلوا کما رانیتمونی اصلی (نماز قائم کرو جیسا کہ تم نے مجھے نماز قائم
کرتے دیکھا ہے) کے بارے میں یہ کیسے سمجھا جائے کہ یہ بات آپ نے ظن سے کہی یا حکم من۔

اللہ ہے؟

(۴) وہ کیا اصول دین ہے اور کہاں ہے جس کی بنیاد پر پیشاب کرنا، بیوی سے ہمبستری کرنا حتیٰ کہ چھینکتا تو امور دین ہے اور کھیتی کرنا اور لاکھوں روپے کی کاشت کرنا امور دنیا؟
اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پر غور کیا جائے کہ آنحضور ﷺ نے فی الواقع کیا کہا تھا اور کیوں کہا تھا؟ اور بعد میں اس بات کو جو کچھ بنا دیا گیا وہ کیوں ہوا؟ اور سب سے اہم بات یہ کہ حدیث مبارکہ اور سنت نبوی کی یہ درگت کرنے والے لوگ کون تھے؟

عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم مریقہ یلقحون فقال لو لم تفعلوا الصلح قال فخرج شیصاً فمر بہم فقال ما لنخلکم قالوا قلت کذا وکذا قال انتم اعلم بامر دنیا کم (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ لوگوں پر گزرے جو گاہہ کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: اگر نہ کرو تو 'صلاح' ہو جائے۔ لوگوں نے گاہہ کرنا ترک کر دیا۔ تو نرم گٹھلی کی چھوٹی کھجوریں پیدا ہوئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم (کچھ عرصے کے بعد پھر ادھر سے) گزرے تو آپ نے پوچھا: کیسی کھجوریں پیدا ہوئیں؟ لوگوں نے کہا: آپ نے ایسا (کرنے کو کہا ہم لوگوں نے ویسا ہی کیا اس کی وجہ سے یہ صورت حال ہے یعنی نرم گٹھلی کی چھوٹی کھجوریں پیدا ہوئی ہیں گویا لوگوں نے اس تبدیلی پر کہا کہ ایسی کھجوریں اس لئے پیدا ہوئیں کہ ہم نے گاہہ نہیں کیا۔ اس پر) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنی دنیا کے امر کو زیادہ جانتے ہو (یا میں)؟ یعنی یہ جو گاہہ نہ کرنے سے ایسی کھجوریں پیدا ہوئی ہیں جسے تم کم نفع بخش سمجھ رہے ہو یہ تمہارے لئے زیادہ 'صلاح' کی بات ہے یا وہ جب وہ گاہہ کرنے سے خوب بھری بھری پیدا ہو رہی تھیں۔ تم اس 'صلاح' کو کیا جانو جسے میں جانتا ہوں۔ تمہاری نظر تو صرف اس کے وزن اور گودا کی طرف ہے۔ اور تم یہ سمجھ رہے ہو کہ اس طرح پیداوار بھی کم ہوئی ہے لہذا بیچنے پر منافع بھی کم ہوگا۔ حالانکہ گاہہ کرنے سے تم نے اس 'صلاح' کو جو برباد کیا ہے اور اس کے جو نقصانات ہیں ان کا تم کو اندازہ نہیں۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم دراصل 'سنت اللہ' کے جاننے والے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ لوگ 'غیر فطری کاشت' کر رہے ہیں جو 'سنت اللہ' کی خلاف ورزی ہے

اور جس کے سبب 'صلاح' فساد میں بدل رہی ہے تو آپ نے اسے منع فرما دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے لفظ 'تصلح' استعمال فرمایا۔ جب لوگوں نے کم پیداوار کی شکایت کی تو آپ نے حقیقت بتادی۔

ممکن ہے کہ یہاں اس مفہوم کی بھی گنجائش ہو کہ آپ نے باوجود اس کے کہ گامبھ کرنا 'سنت اللہ' کی حقیقی خلاف ورزی تھی اس کی اجازت مرحمت فرمادی جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانی معاشرے میں 'سنت اللہ' کی خلاف ورزی میں رونما ہونے والے نقص فسادات کو تشریحی طور پر محض اس لئے 'جائز' قرار دے دیا کہ لوگوں کو انہیں یکسر منع کر دینے سے ضرر ہوتا۔ تاہم معیار مطلوب یعنی پہلا انفاقی درجہ حسب سابق برقرار رکھا گیا۔ مثلاً روٹی اور اون سے باضابطہ بنے اور سلے ہوئے کپڑے، گھاس اور لکڑی سے باضابطہ بنائے ہوئے کاغذ اور اس پر لکھی ہوئی کتاب وغیرہ۔ اگرچہ 'سنت اللہ' پر اضافہ اور توسیع تھے اور ان کی وجہ سے کچھ نہ کچھ 'صلاح' ضرور متاثر ہوئی تھی تاہم انہیں تشریحی طور پر گوارہ کر کے 'جائز' قرار دے دیا گیا۔ اس صورت میں 'اتم اعلم بامر دنیا کم' کا مفہوم یہ ہو جائے گا کہ ہر چند کہ یہ امور 'صلاح' کے خلاف اور 'سنت اللہ' کو متاثر کرنے والے ہیں تاہم چلو اس حد تک اجازت دی جاتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مفہوم لینا کہ آپ نے باضابطہ 'امور حیات' کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے جس میں ایک حصے پر آپ ﷺ کا اتباع واجب ہے اور دوسرے حصے پر نہیں بالکل الٹی بات ہے۔

غور کیا جائے تو امور حیات کی یہ تقسیم دراصل وہ پہلا سیکولرائزیشن (Secularization) ہے جس کا تعارف اور رواج اسلامی معاشرے میں 661 عیسوی کے بعد ہوا۔ سیکولرائزیشن امور حیات کو دو حصوں میں بانٹنے اور اس کے ایک حصے سے اللہ اور اس کے رسول کا قبضہ اختیار ختم کرنے کا دوسرا نام ہے۔ جب اس نقطے پر غور کیا جائے گا تو یہ بات بخوبی سمجھ میں آجائے گی اور بطور خاص اس صورت میں کہ تدوین حدیث تدوین فقہ کے بعد کا عمل ہے کہ وہ اقدامات جو نظام وقت (جس میں سازش کرنے والے اور حکومت دونوں شامل تھے) کے لطف خاص سے پورے بلاد اسلامی میں کئے جا رہے تھے اور جن کے تحت دیگر امور کے ساتھ سنت کی جگہ اس فقہ کو زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کیا جا رہا تھا جو سنت کی نقیض تھی۔ فقہ کا یہ نفاذ دراصل معاشرے سے قرآن اور سنت نبوی کا اخراج و انہدام تھا۔ یہی وہ فضا تھی جس میں سنت کا علم تیزی

سے متا جا رہا تھا یا مٹایا جا رہا تھا۔ چنانچہ دو تین نسلوں کے گزرنے کے بعد ایسے لوگوں کی تعداد مٹھی بھر رہ گئی جو اصل سنت نبوی ﷺ کے جائے والے تھے۔ جب کہ معاشرے میں اس سنت نبوی کا چلن عام ہو چکا تھا جسے فقہ اسلامی سنت کہہ کر اس سے متعلق پورے احکام مدون کر چکی تھی۔ عصر حاضر میں دنیائے آدمیت میں سیکولرائزیشن (Secularization) کے اصلی علم برداروں کو دیکھ کر باسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ کون لوگ تھے جو خلافت راشدہ کے بعد یہی سیکولرائزیشن (Secularization) اسلامی معاشرے میں رائج کر رہے تھے اور جس کے زیر سایہ فقہ اسلامی کی تشکیل کی جا رہی تھی۔ جامع محدثین اور مدون محدثین کا اس معاشرے سے متاثر ہونا خلاف معمول نہ تھا جس میں سب سے زیادہ اس بات کو دخل تھا کہ اس فہم دین کو رکھنے والے لوگ معاشرے میں خال خال پائے جانے لگے ہوں جن کو یہ فہم صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے براہ راست ملا تھا۔ چنانچہ 'فہم دین' کے فقدان کے پیدا کردہ اس اضطراب کا ثبوت ہے کہ محدثین کرام نے بعض ایسی باتیں بھی لکھ دیں ہیں جو سنت کے اس گہرے علم پر مبنی ہیں جو صحابہ کرام کو حاصل تھا لیکن ان باتوں کو لکھنے کے باوجود ایسا لگتا ہے کہ محدثین یہ نہیں جانتے تھے کہ ان باتوں کی کنہہ کیا ہے؟ مثلاً:

(۱) امام بخاری نے کتاب الوضو میں باب باندھا ہے: باب من لم يتوضأ من لحم الشاة و السويق و اكل ابو بكر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم لحما فلم يتوضوا (باب جس نے بکری کے گوشت اور ستو (اور آگ سے پکی ہوئی چیزیں) کھانے کے بعد وضو نہ کیا اور ابو بکر عمر اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے گوشت کھایا) اور پھر نماز پڑھی) اور وضو نہ کیا۔

اسی طرح امام صاحب نے دوسرا باب باندھا: باب من مضمض من السويق ولم يتوضأ (باب جس نے ستو کھانے کے بعد کلی کی (اور نماز پڑھ لی) اور وضو نہ کیا۔

اسی طرح امام صاحب نے تیسرا باب باندھا ہے: باب هل يمضمض من اللبن (باب کیا دودھ سے (یعنی دودھ پی کر) کلی کی جائے؟

امام بخاری نے ان ابواب کے تحت حدیثیں جمع فرمادی ہیں۔ لیکن پورا اسلامی علوم کا ذخیرہ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ یہ ابواب اس طرح کیوں باندھے گئے ہیں؟ اسلامی علوم کے

ذخیرے میں جو بات ملتی ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بھنا ہوا گوشت کھانے سے وضو لازم آتا ہے یا نہیں؟ ستو کھانے سے وضو لازم آتا ہے یا نہیں؟ دودھ پینے سے وضو لازم آتا ہے یا نہیں؟ ستو کھانے کے بعد کی گئی کلی کا سبب کیا تھا؟ دودھ پینے کے بعد کی گئی کلی کا سبب کیا تھا؟ یہی وہ باتیں ہیں جو پورے شرح وسط سے کہی جاتی ہیں۔ لیکن جوام السوالات ہے اس کا کہیں ذکر نہیں۔ اور وہ ہے:

جس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم لایعنی گفتگو نہیں فرماتے تھے اور جب بھی کہتے فصیح و بلیغ بات کہتے تھے اسی طرح صحابہ کرام بھی لایعنی باتیں کہنے کے عادی تھے نہ سننے کے، پوچھنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سوال پوچھنے کے تعلق سے وہ سب سے کم گو اور محتاط تھے۔ جس کا گواہ خود احادیث کا ذخیرہ ہے بلکہ جو مرتبہ صحابیت میں جتنا بڑھا ہوا تھا وہ اتنا ہی کم سوال کرنے والا تھا۔ پھر جب سب سے پہلے مثلاً باب مذکورہ اولیٰ میں حضرت عطاء بن یسار نے حضرت عبداللہ بن عباس سے پوچھا ہو گا یا حضرت عبداللہ بن عباس نے انہیں بتایا ہو گا تو اس وقت آخر وہ کیا سوال پیدا ہوا تھا جس کے جواب میں یہ حدیث بتائی گئی؟ اور اس سے زیادہ اہم بات یہ کہ وہ سوال کیوں پیدا ہوا تھا؟

اس سوال کا پیدا ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ خلافت راشدہ میں اصحاب رسول ﷺ 'سنت اللہ'، 'سنت قائمہ' اور 'سنت نبوی' کی حقیقت اور ان پر مبنی 'فہم دین' ضرور رکھتے تھے اسی فہم کے رکھنے کی وجہ سے جب کوئی اشکال پیدا ہوتا تو بزرگوں سے دریافت فرماتے۔ چنانچہ 'سنت اللہ' اور 'سنت قائمہ' کا علم انہیں بتاتا تھا کہ فطری طور پر موبود چیزوں مثلاً گوشت پر آگ کے ذریعہ طباحت اضافہ ہے اسی طرح پیسا ہوا گیہوں یعنی ستوا اضافہ ہے پھر فقہاء اس کی صلاح متاثر ہوئی ہوگی۔ جب اسکی صلاح متاثر ہوئی تو پھر کیا وہ مانع وضو ہے؟ یا یہ کہ وہ مانع وضو کیوں نہیں؟ اور یہ کہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں کہ بھنا ہوا گوشت کھا کر وضو نہیں کرتے اور نماز پڑھ لیتے ہیں؟ اس پر حضرت ابن عباس نے انہیں بتایا کہ انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور فلاں فلاں کو بھی ایسا کرتے دیکھا تھا۔ چنانچہ ایسا کرنا 'سنت اللہ' اور 'سنت قائمہ' کے خلاف نہیں بلکہ 'جائز' ہے اسی لئے آپ ﷺ نے اس پر 'سنت نبوی' قائم فرمائی۔

اسی طرح یہ سوال پیدا ہوا کہ دودھ تو فطری اخذ (Natural Intake) ہے پھر یہ

بات کیوں مشہور ہے کہ آنحضور ﷺ نے دودھ پی کر کلی کی ہر چند کہ وضو نہیں فرمایا؟ اس کے جواب میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ پی کر کلی کی اور پھر اسکی وجہ بھی بیان فرمادی کہ دراصل کلی کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اس میں چکنائی ہوتی ہے اور آپ ﷺ کو نماز پڑھانی تھی چنانچہ آپ کو مناسب نہیں لگی، ہر چند کہ اس چکنائی سے وضو لازم نہیں آتا۔

چونکہ اصحاب رسول ﷺ کے یہاں پایا جانے والا 'فہم دین' اس معاشرے میں مفقود ہو چکا تھا لہذا اسی کا نتیجہ ہے کہ اب ان سوالات کے تحت بیان کردہ احادیث کا رخ، زاویہ اور توازن بدل گئے لہذا ان کی معنویت بھی بدل گئی۔

صحابہ کرام کا تعامل: صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا تعامل تھا ہے کہ وہ 'سنت اللہ'، 'سنت قائمہ'، اور 'سنت نبوی' ﷺ پر مبنی 'فہم دین' کے پورے پورے حامل تھے لہذا ان کا رد عمل اور جو جتنا زیادہ 'فہم دین' کا حامل تھا اس کا مخصوص رد عمل دیگر لوگوں سے اتنا ہی مختلف ہوتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صرف اس لئے ساری امت پر ممتاز نہیں کہ ان کی معیت آنحضور ﷺ کے ساتھ سب سے زیادہ رہی بلکہ فی الواقع اس لئے ممتاز ہیں کہ آنحضور ﷺ کے بعد امت 'محمدیہ' میں سنت اللہ، 'سنت قائمہ' اور سنت نبوی' کا جاننے والا ان سے زیادہ کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ یہی سب ہے کہ درج ذیل امور میں ان کا فیصلہ سب سے مختلف تھا:

(۱) جب بعض لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا اور حضرت ابوبکر نے ان پر لشکر کشی کا ارادہ کیا تو ہر صحابی حتیٰ کہ حضرت عمر کو بھی ان پر لشکر کشی میں تردد تھا حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ اگر اس کے لئے کوئی نہیں اٹھے گا تو ابوبکر ان سے تنہا جہاد کرے گا اور یا تو وہ ایک رسی جو وہ زکوٰۃ کے بطور دیتے تھے لیکر رہے گا یا اسی جہاد میں اپنی جان دے دے گا۔ چونکہ حضرت ابوبکرؓ جانتے تھے کہ یہ زکوٰۃ دینے سے انکار نہیں بلکہ اس سنت نبوی اور سنت قائمہ اور سنت اللہ کو ڈھادینا ہے جس کی اقامت کے لئے آنحضور ﷺ کی بعثت ہوئی تھی۔ چنانچہ یہ عمل دراصل آنحضور ﷺ کے پورے عمل کو تکلیف کر دینے کے مترادف ہے۔ لہذا یا تو اس سنت کی بحالی کی جائے یا اسی بحالی کی جدوجہد میں جان دے دی جائے یہی حاصل حیات ہے۔

لیکن جب معاشرے سے یہ علم عام طور پر جاتا رہا اور اس 'خلافت رسول اللہ' کو لوگوں

نے تقویٰ کے بجائے موروٹی اور خلافت کے بجائے ملوکیت میں بدل دینا چاہا اور وہ چند لوگ جو اس 'سنت نبوی' کا فہم رکھتے تھے اس رجحان اور تبدیلی پر بے چہین ہوا ٹھٹھے اور اسے بچانے کے لئے سر دھڑکی بازی لگانے لگے تو وہ لوگ جنہیں وہ علم نہ تھا انہیں معلوم ہی نہیں ہوا کہ روئے ارض پر کیا توڑا جا رہا ہے اور اسکا ٹوٹنا 'نظام رسالت' میں کیا معنی رکھتا ہے؟ لہذا ان کے کانوں پر جوں تک نہ رہی بلکہ اس سنت کو بچانے والے ہی متشدد اور باغی قرار دے گئے۔ سو سالوں کے بعد تو نوبت یہ ہو گئی کہ 'فقہ اسلامی' نے باضابطہ فتویٰ دے دیا کہ وہ 'سنت اللہ' اور 'سنت قائمہ' جس کو قائم کرنے کے لئے اللہ کے رسول مبعوث ہوئے اور انہوں نے 'خلافت اللہ' قائم کر کے جس سنت نبوی کو قائم فرمایا تھا اس کے غیر عادل لوگوں کے ہاتھوں میں جانے سے روئے ارض پر کوئی قیامت نہیں ٹوٹتی بلکہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہتا ہے۔ بنی آخر الزماں کی قائم کردہ سب سے بڑی سنت نبوی رہے یا جائے اس سے دین اللہ پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور تاریخ اسلامی میں اس فتویٰ کو 'فہم دین' کا سب سے بڑا فیصلہ اور فقاہت کا سب سے بڑا ثبوت سمجھا گیا۔

خود کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

(۹) مقابلہ حُر و محر: (الف) روئے ارض پر معرکہ خیر و شر معرکہ حق و باطل ہے۔

دقت نظر سے دیکھا جائے تو اس معرکہ کے دو جوہ ہیں:

(۱) وجہ معاملہ: وجہ معاملہ سے مراد ہے وہ نکتہ جس پر معرکہ خیر و شر مرکوز رہتا ہے۔ اور

حضرات آدم و حوا علیہما السلام سے ظہور دجال، نزول عیسیٰ ابن مریم اور قیام قیامت تک سارا معرکہ اصلاً اسی نکتہ پر لڑا جاتا رہا ہے اور لڑا جائے گا۔ اس اعتبار سے حضرات آدم و حوا علیہما السلام سے لیکر قیام قیامت تک وہ مرکزی نکتہ ہے:

'ملک اللہ'

چنانچہ انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی پوری جدوجہد کا مرکز 'اقامت ملک اللہ' رہی

ہے۔

(۲) وجہ تدبیر: وجہ تدبیر سے مراد ہے وہ تدبیر جو معرکہ خیر و شر میں حق اور باطل — انبیاء

و رسل اور اہل باطل ابلیس اور اس کے حلیف اختیار کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ قرآن و سنت نبوی

ﷺ سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ معرکہ خیر و شر جو حضرات آدم و حوا علیہما السلام کے وقت سے لڑا جا رہا ہے اور تا قیام قیامت لڑا جائے گا بنیادی اعتبار سے انہیں تدبیروں سے لڑا جائے گا جو اب تک قائم چلا آ رہا ہے۔ اس اعتبار سے وہ تدابیر درج ذیل ہیں:

(۱) تدبیر سحر: ابلیس، باطل اور اس کے حلیف ہمیشہ سے اس معرکہ میں جس تدبیر کا استعمال کرتے آئے ہیں وہ تدبیر 'سحر' ہے۔ یعنی 'مسخر' امور یعنی انفاقی علم، ہنر اور عمل اور اس کے انفاقی درجہ سے ہٹ کر اکتشافی کوششوں یعنی 'سرف'، 'سحر' کے ذریعہ اکتشافی علم، اکتشافی ہنر اور اکتشافی عمل اور اس کے اکتشافی آخری درجوں تک جا کر اس سے حاصل کردہ قوتوں کا حق کے خلاف استعمال کرنا۔ بالفاظ دیگر:

Physical Knowledge or
Science

(۱) طبیعیاتی علم یا علم طبیعیات

Technology (Physical)

(۲) علم ہنر و ہنرمندی بر طبیعیات

Action through

(۳) عمل بذریعہ آلات طبیعیاتی علم و ٹکنالوجی

Equipments made of

Physical Knowledge & Technology

Metaphysical knowledge or science

(۴) ماوراء طبیعیات علم

& Technology (Metaphysical)

(۵) علم ہنر و ہنرمندی بر علم

ماوراء طبیعیات

Action through Equipments

(۶) عمل بذریعہ آلات

made of Metaphysical know-

ماوراء طبیعیاتی علم و ٹکنالوجی

ledge & Technology

کا استعمال کر کے اہل حق کو ملک اللہ کی اقامت سے روکنا۔

(۲) تدبیر سحر: اللہ کے رسل اور انبیاء کرام اور اہل ایمان اس کے برخلاف اس معرکہ میں ہمیشہ جس تدبیر کلم استعمال کرتے رہے ہیں وہ تدبیر 'سحر' ہے۔ یعنی 'مسخر' امور یعنی انفاقی علم، انفاقی ہنر اور انفاقی عمل اور اس کے انفاقی درجہ پر ثابت قدم رہتے ہوئے اس سے حاصل کردہ

قوت کے استعمال سے روئے ارض پر ملک اللہ کی اقامت کرنا۔

چنانچہ حق و باطل کے مابین یہ تدبیری صورتحال بلا استثناء ہمیشہ قائم رہی ہے:

- | | | |
|-----|-------------------------|-------------------------------|
| (۱) | مابین قانبل | وحضرت ہانبل علیہ السلام |
| (۲) | مابین قوم نوح | وحضرت نوح علیہ السلام |
| (۳) | مابین قوم عاد | وحضرت ہود علیہ السلام |
| (۴) | مابین قوم ثمود | وحضرت صالح علیہ السلام |
| (۵) | مابین قوم ابراہیم | وحضرت ابراہیم علیہ السلام |
| (۶) | مابین فرعون و قوم فرعون | وحضرت موسیٰ علیہ السلام |
| (۷) | مابین جالوت و قوم جالوت | وحضرت داؤد علیہ السلام |
| (۸) | مابین قوم محمد | وحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم |

اور یہی صورتحال قرآن و سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی صراحت کے مطابق اس وقت ان شاء اللہ ہوگی یعنی:

مابین یہود، دجالہ و دجال اکبر
و اہل ایمان، حضرت مہدی و حضرت عیسیٰ ابن مریم
علیہما السلام

(ب) صورت استعمال تدبیر:

(۱) حقیقی صورتحال اور حقیقی کشش: حقیقی کشش (Actual Tension) ہے

مراد ہے فکۃ تصادم سے دونوں طرف پائی جانے والی صورتحال اور وہاں پائی جانے والی کشیدگی۔
مثلاً صورت درج ذیل:

حق	مع	اقامت ملک اللہ	مع	باطل
حق	مع	کشش	مع	کشش
انفاقی علم، انفاقی				اکتشافی علم، اکتشافی
ہنر اور انفاقی عمل				ہنر و اکتشافی عمل

ظاہر ہے یہ صورتحال وہی ہوگی جو درج ذیل تعبیر سے ظاہر کی جاسکتی ہے:

حق لائٹنی، تلوار، تیر اور گھوڑے کے ساتھ ہوگا اور باطل ICBM اور جوہری

(Nuclear)، کیمیادی (Chemical)، جراثیمی (Bactereological)، لیزر اور
 کانے ٹک (Kinetic) ہتھیاروں کے ساتھ۔ تاریخِ معرکہ خیر و شر کی مثالی صورتحال (Ideal
 Situation) یہی ہے۔ اس کے برخلاف ان دونوں نقطوں کے مابین جتنی کم دوری ہوگی اتنی
 صورتحال غیر مثالی (Unideal) ہوگی۔

معرکہ خیر و شر میں باطل کی یہ تاریخ کبھی نہیں رہی کہ وہ اس اعتبار سے حق سے نزدیکی
 پیدا کرے۔ یعنی اکتشافی علم، اکتشافی ہنر اور اکتشافی عمل کی تخفیف کی باطل کے نزدیک کبھی روایت
 نہیں رہی ہے۔ اس کے برخلاف اہل ایمان کے یہاں ایسی غلطی ضرور ہوئی ہے کہ وہ باطل سے
 قریب تر ہو چکے ہوں۔ لیکن ایسا ہونا حق کی مثالیت کو ہمیشہ مجروح کرتا رہا اور اس کی پاداش میں
 حق ہمیشہ ہزیمت اٹھاتا رہا ہے۔ تاوقتیکہ اہل حق نے فیصلہ نہ کر لیا ہو کہ وہ اب مزید سے صرف نظر
 کر کے اور ہر اضطراب سے فارغ ہو کر اور صرف اللہ کی طرف یکسو ہو کر وہ مثالی حالت قائم کریں
 گے جو معیارِ مطلوب ہے۔ یعنی جب بھی اہل حق کے یہاں باطل اور اس کے اکتشافی علم، اکتشافی
 ہنر اور اکتشافی عمل کو دیکھ کر حق کے تقاضوں کو مثالی سطح پر پورا کرنے کے بجائے اکتشافی علم، اکتشافی
 ہنر اور اکتشافی عمل میں مسابقت کرنے کا عمل شروع ہوا ہے انہیں ہزیمت اور مغلوبیت کے سوا کچھ
 ہاتھ نہیں آیا ہے تاوقتیکہ وہ اس فریب و سراب سے نکل کر حق کی مثالی صورتحال قائم نہ کر لیں۔ اس
 کی خاص وجوہات درج ذیل ہیں:

(۱) باطل ابلیس کی بات مان کر انفاقی علم، ہنر اور عمل کو کلیتہاً چھوڑ دیتا ہے اور اکتشافی علم، ہنر
 اور عمل کو اس کے آخری افقی درجوں میں اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے برخلاف حق ایسا نہیں کرتا اور
 نہ کر سکتا ہے۔ اگر کئی طور پر کر لے تو وہ حق باقی نہیں رہے گا اور بات ختم ہو جائے گی۔ اور نہ کرنے
 کی صورت میں وہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے جو باطل کے یہاں ہوتے ہیں۔

(۲) اس صورت میں حق انفاقی علم، انفاقی ہنر اور انفاقی عمل کے ساتھ اس کے معیارِ مطلوب
 پر چونکہ عمل نہیں کرتا اور اپنی صلاحیتیں و اہلیتیں نکات پر صرف کرتا ہے اس لئے وہ امرائے نصیب
 نہیں ہوتا جو روئے ارض پر حق کے لئے خاص ہے یعنی 'نصر اللہ جسے نصرة' بھی کہا جاتا ہے۔

'نصر اللہ' کیا ہے؟ عالمِ کمون و تخلیق میں انسانی انفاقی سطح اور اس کے انفاقی درجہ کے علاوہ وہ ساری
 عمودی اور افقی سطحیں اور درجے جن کا احاطہ ابلیس بھی نہیں کر سکتا ان کے علم، ہنر اور عمل کا کسی

وقت خاص میں اللہ تعالیٰ کے ذریعہ حق کے لئے 'مسخر لہ' بنادیا جاتا۔ اس 'نصر اللہ' کے نازل ہونے کے چند مضبوط شرائط ہیں۔ جب وہ شرائط پورے ہوں تو یہ 'نصر اللہ' حاصل رہتا ہے یا ہوتا ہے ورنہ نہیں۔ وہ خصوصیات و شرائط درج ذیل ہیں:

- (۱) 'نصر اللہ' ہمیشہ فی زمانہ باطل کی طاقت قوت کے بالمقابل کافی اور حاوی ہوتا ہے۔
- (۲) 'نصر اللہ' کی یقینی آخری منزل یہ ہے کہ 'الفتح' نصیب ہو جائے۔
- (۳) 'نصر اللہ' انفاقی سطح اور انفاقی درجہ مثالی کے Proportional ہوتا ہے۔ یعنی فرد حق یا جماعت حق جس قدر انفاقی سطح اور اس کے انفاقی درجہ مثالی پر ہونگے 'نصر اللہ' اتنا ہی بھرپور ہوگا اور زیادہ ہوگا۔ اس کے برخلاف فرد حق یا جماعت حق کی حقیقی صورتحال انفاقی سطح اور انفاقی درجہ مثالی سے جتنی ہٹی ہوئی ہوگی یعنی جتنی باطل سے قریب تر ہوگی نصر اللہ اسی قدر کم ہوگا بلکہ ممکن ہے کہ سرے سے ہی نہ ہو۔

(۴) اگر اہل حق معیار مطلوب پر ہیں اور اہل باطل اپنی اکتشافی طاقت و جبروت کی انتہاء پر اور صورتحال یہ ہو کہ بظاہر دونوں کے مابین کسی مقابلہ و محاذ آرائی کا تصور بھی محال ہو تو اس وقت 'نصر اللہ' کا نزول اس طرح ہوتا ہے کہ اہل حق کے سامنے باطل نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ یوں 'نصر اللہ' کی شکلیں ہزاروں سے متجاوز ہیں لیکن اجمالی طور پر انہیں درج ذیل خانوں یا قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے:

- (۱) عنایت
- (۲) معیت
- (۳) ربط قلب
- (۴) شد عہد
- (۵) شد ملک
- (۶) تثبیت
- (۷) برہان
- (۸) سلطان
- (۹) رعب

- (۱۰) سکنہ
(۱۱) تائید
(۱۲) المائدہ
(۱۳) آیت
(۱۴) کلمہ
(۱۵) روح
(۱۶) کفل
(۱۷) حیات
(۱۸) قرن
(۱۹) سحر
(۲۰) جند
(۲۱) ملائکہ

ان میں سے ہر ایک کے تحت بیسیوں وجوہ و اطراف ہیں جن کا ذکر سر دست مقصود نہیں۔ روئے ارض پر خیر و شر کا آخری معرکہ دجال ہوگا۔ یہ معرکہ بنیادی طور پر 'معرکہ سحر و سحر' ہوگا بلکہ روئے ارض پر معرکہ سحر و سحر کی سب سے بڑی انتہائی شکل۔

جدید سائنس اور جدید ٹکنالوجی

سائنس (علم) کیا ہے؟ ٹکنالوجی (ہنر) کیا ہے؟ جدید سائنس کیا ہے؟ جدید ٹکنالوجی کیا ہے؟ یہ سوالات نہایت اہم ہیں۔ اس تعلق سے جو بات کہی جاسکتی ہے وہ درج ذیل ہیں:

- (۱) انفاقی علم ہی اصلی سائنس ہے۔
(۲) انفاقی علم کا انفاقی درجہ میں استعمال اور اس سے استفادہ ہی اصلی اور جائز استعمال اور استفادہ ہے۔

(۳) انفاقی ہنر ہی اصلی ٹکنالوجی ہے۔

(۴) انفاقی ہنر کا انفاقی درجہ میں استعمال اور اس سے استفادہ ہی اصلی اور جائز

استعمال اور استفادہ ہے۔

(۵) انفاقی علم اور انفاقی ہنر سے استفادہ کرتے ہوئے مقصد حیات یعنی منصوبہ ربانی کی تکمیل کرنا ہی انفاقی عمل صالح ہے۔

(۶) عمل صالح ہی نبوی طریقہ ہے۔

(۷) اکتشافی علم (مشہور سائنس) سحر ہے۔

(۸) اکتشافی علم کا اکتشافی درجہ میں استعمال اور اس سے استفادہ کرنا سحر کرنا،

ساحری اور ناجائز ہے۔

(۹) اکتشافی ہنر (مشہور ٹکنالوجی) سحر ہے۔

(۱۰) اکتشافی ہنر کا اکتشافی درجہ یعنی غیر انفاقی درجے میں استعمال اور اس سے

استفادہ کرنا سحر کرنا، ساحری اور ناجائز ہے۔

(۱۱) اکتشافی علم (مشہور سائنس) اور اکتشافی ہنر (مشہور ٹکنالوجی) سے استفادہ

کرتے ہوئے روئے ارض کو مسخر کرنا مقصد حیات اور اس پر جاری منصوبہ ربانی کو منہدم کرنا اور اس سے بغاوت ہے اور یہی عمل غیر صالح ہے۔

(۱۲) روئے ارض پر اللہ کے ہر باغی اور دشمن مثل ابلیس کا یہی طریقہ رہا ہے۔

(۱۳) سائنس و ٹکنالوجی (یعنی مشہور سائنس اور مشہور ٹکنالوجی) سحر ہیں۔

(۱۴) جدید سائنس اور جدید ٹکنالوجی (یعنی موجودہ مغربی سائنس اور موجودہ

مغربی ٹکنالوجی) سحر ہیں۔

(۱۵) یہ جدید سائنس اور یہ جدید ٹکنالوجی حق ہیں۔ یعنی یہ حقیقت ہیں۔ یہ کوئی

واہمہ نہیں ہیں۔

(۱۶) یہ جدید سائنس اور یہ جدید ٹکنالوجی حق ہیں۔ یعنی ان کا اثر ہوتا ہے۔ یہ اثر

واہمہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

(۱۷) یہ جدید سائنس اور جدید ٹکنالوجی حق ہیں۔ یعنی ان کو اور ان کے اثرات کو

قوای محسوسہ سے پایا (مثلاً دیکھا، سنا، چھو یا، چکھا اور سونگھا جاسکتا ہے) اور قوت مدرکہ (عقل)

سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اس لئے یہ سحر مبین ہیں۔

(۱۸)۔ یہ جدید سائنس اور یہ جدید ٹکنالوجی حق ہیں۔ یعنی باطل کے ذریعہ ان کے استعمال سے اہل حق اس کا حقیقی اثر محسوس کر کے یا اس کے استفادہ سے محروم کر دیئے جانے پر اس کا حقیقی اثر محسوس کر کے اس سے خوفزدہ ہو جاتے یا ہو سکتے ہیں۔ ایسا خوفزدہ ہونا واہمہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

(۱۹)۔ یہ جدید سائنس اور یہ جدید ٹکنالوجی حق ہیں۔ یعنی ان سے اہل ایمان میں دہشت کی کیفیت پیدا ہوتی یا پیدا کی جاسکتی ہے۔ یہ دہشت ایک حقیقت ہے اور کسی واہمہ یا کمزوری ایمان کا نتیجہ نہیں۔ روئے ارض کا سب سے مضبوط ایمان رکھنے والا انسان بھی اس کے مظاہرے سے حقیقی طور پر خوفزدہ ہو سکتا ہے۔

(۲۰)۔ یہ جدید سائنس اور یہ جدید ٹکنالوجی باطل ہیں۔ یعنی یہ سحر یعنی 'سحر' نہیں۔ اس طرح حاصل کردہ علم اور ہنر اور اس کا استعمال 'نا جائز' اور غیر مجاز ہیں۔ اس لئے کہ یہ اس علم اور ہنر پر مبنی ہیں جو نا جائز طور پر حاصل کردہ ہیں اور استعمال و استفادہ کردہ ہیں۔

(۲۱)۔ یہ جدید سائنس اور یہ جدید ٹکنالوجی باطل ہیں۔ یعنی یہ فی الواقع ابلیسی طریقہ ہیں۔ اس لئے باطل ہیں۔ اس طریقہ کو انبیاء اور رسل سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ سحران کے خلاف ہمیشہ استعمال ہوئے ہیں۔

(۲۲)۔ یہ جدید سائنس اور یہ جدید ٹکنالوجی باطل ہیں۔ اس لئے کہ یہ 'سنت اللہ'، 'سنت قائمہ' اور 'سنت نبوی' کے خلاف ہیں۔

(۲۳)۔ یہ جدید سائنس اور یہ جدید ٹکنالوجی باطل ہیں۔ اس لئے کہ یہ 'سنت اللہ'، 'سنت قائمہ' اور 'سنت نبوی' کو منہدم کرنے والے ہیں یعنی اہل حق جس تناسب میں اس کا استعمال اور اس سے استفادہ اور اس پر توکل کریں گے اسی تناسب میں وہ سنت اللہ، سنت قائمہ اور سنت نبوی کو منہدم کریں گے۔

(۲۴)۔ یہ جدید سائنس اور یہ جدید ٹکنالوجی مومن کے لئے مضرت رساں اور نقصان دہ اور باطل کے لئے مفید اور نفع بخش ہیں۔ یہ باطل کے لئے مفید اور نفع بخش اس لئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بغاوت کی مدت میں ابلیس اور اس کے قبیعین کو مہلت کا ردی ہے لہذا اس مدت میں اگر وہ ان چیزوں سے استفادہ کرتے ہیں جو نا جائز ہی کیوں نہ ہوں تو انہیں ان کے

اندر موجود سنت اللہ سے فائدہ اور نفع مل سکتا ہے۔ لیکن مومن ان سے استفادہ صرف حدود اللہ کو پھلانگ کر ہی کر سکتا ہے اور اس صورت میں اسے وہ نصرتیں نہیں مل سکتیں جن کا ملنا اس صورت میں یقینی ہوتا ہے جب وہ پوری طرح حدود اللہ کی پاسداری کرے اور معیار مطلوب پر قائم رہے۔ لہذا اگر اہل حق اور اہل باطل ایک دوسرے کے خلاف معرکہ حق و باطل میں بیک وقت یکساں سائنس اور ٹکنالوجی سے استفادہ کرتے ہوئے کارروائی کریں تو چاہے پہلے اہل حق کو کامیابی مل جائے لیکن بالآخر وہ ناکام ہونگے اور باطل غالب آجائے گا۔ تاہم دین اللہ ہر موجود سطح پر خود ترک اسلحہ (Self Disarmament) کی اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی عنوة حاصل شدہ کسی بھی سطح کے اسلحے کے استعمال سے روکتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر اہل باطل سائنس اور ٹکنالوجی کا استعمال کریں اور اہل حق انفاقی علم و ہنر کا انفاقی درجے میں تو خواہ پہلے اہل حق کو بہت نقصان ہو لیکن بالآخر حق غالب آجائے گا اور باطل مغلوب ہو کر رہے گا۔ اس لئے کہ اتنا حصہ جس میں اکتشافی علم و ہنر کے استعمال سے باطل حق پر غالب و قابو رہتا ہے اللہ کی نصرتوں سے نہ صرف برابر کر دیا جائے گا بلکہ اسے ایک ایسی نصرت بھی ملے گی جس کے سامنے باطل کی ساری اکتشافی علم و ہنر کی قوت بے بس ہو کر رہ جائے گی۔ یہی تاریخ و رواد معرکہ خیر و شر ہے۔

فساد قبل نوح

دجال جلد اول کے صفحات ۲۹۳ تا ۳۴۰ میں ان فسادات کو صرف معروضی طور پر بیان کیا گیا تھا لیکن مزید تفہیم کے لئے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ انہیں موضوعی اور متعین طور پر بھی بیان کر دیا جائے تاکہ فساد کی سنگینی اور اس کی ہمہ گیری کا درست اندازہ لگایا جاسکے۔ ”کتاب ادریس“ ۴۱ میں مذکور ہے کہ ابلیس جن ملائکہ سے تحالف کرنے میں کامیاب ہوا وہ تعداد میں کل دوسو (۲۰۰) تھے جن میں بیس بڑے اور ان کے ماتحت فی کس دس دس چھوٹے ملائکہ تھے۔ یہ ملائکہ تدبیر عالم کے مختلف امور پر متعین تھے۔ ابلیس نے ان میں رسوخ حاصل کیا، انہیں ورغلا یا، اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے اور اپنے علم وقوت کا رضاء الہی کے دائرے سے باہر جا کر حتیٰ کہ اس کے خلاف استعمال کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اور اس طرح ان کے ذریعہ اس نے متعلقہ امور میں جن پر یہ ملائکہ متعین تھے فساد انگیزی کی تاک کہ حیات انسانی تباہ و برباد ہو جائے۔ بنیادی طور پر ان ملائکہ نے جن امور کے تعلق سے اپنے علوم وقوت کا ناجائز استعمال کیا یا جن کے میکانزم (Mechanism) کی معلومات ابلیس یا اس سے متعلق انسانوں اور دیگر مخلوقات کو دیں جس سے بعد میں فساد برپا ہوا وہ پانچ تھے:

(۱) رمز حیات (Code of Life): رمز حیات سے مراد انسان، جمادات، نباتات، حیوانات اور دیگر مخلوقات کی حیات کا راز ہے جسے تقریب فہم کے لئے Code کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً عالم نفس یا عالم اشیاء میں ان کی حیات کا رمز کیا ہے؟

(۲) رمز افزائش (Code of Pro-Creation): رمز افزائش سے مراد مذکورہ مخلوقات کی حیات نفسانی یا حیات عالم اشیاء میں ان کی افزائش کا راز ہے۔ مثلاً یہ کہ یہ چیزیں عالم اشیاء میں کس طرح بڑھتی ہیں؟

(۳) رمز تربیب (Code of Providence and Sustenance): رمز تربیب سے مراد مذکورہ مخلوقات کی مثلاً حیات نفس یا حیات عالم اشیاء میں ارتقاء و ارتقاء کا راز ہے۔ یعنی یہ راز کہ عالم میں کوئی نفس کس طرح ارتقاء پزیر ہوتا ہے؟

(۴) رمز تبدیلی (Code of Transformation : Interchange, رمز تبدیلی سے مراد ان مخلوقات کی حیات عالم اشیاء Intrachange (vice versa) : رمز تبدیلی میں تبدیلی باہم کاراز کیا ہے؟

(۵) رمز موت (Code of Death): رمز موت سے مراد ہے ان مخلوقات کی حیات عالم اشیاء میں موت واقع ہونے کا راز کیا ہے؟ اور اس موت کی کیا حقیقت و ہیئت ہے؟ چنانچہ ابلیس سے تحالف کے بعد ان ملائکہ نے ارض و ماوراء ارض میں ابلیس کی رضا کے مطابق مذکورہ امور میں تصرف بجا کرنا شروع کیا۔ لہذا بہت جلد پورے کرہ ہای ارض اور ماوراء ارض کے ملکوت میں فساد برپا ہونا شروع ہو گیا۔ چونکہ ان کا تعلق عالم خلق کی دونوں سمتوں یعنی فردی و کلی (Microcosmic & Macrocosmic) سے تھا لہذا دیکھتے دیکھتے ان دونوں ہی جہوں کے اعتبار سے ان فسادات نے فساد عظیم کا رخ اختیار کر لیا۔ ہر چند کہ یہ کام ابلیس نے معرکہ خلافت کے تعلق سے کیا تھا اور اس کا اصلی نشانہ بنی آدم تھا لیکن اس کی پلیٹ میں گویا زمین اور زمین کی قریبی ساری کائنات آگئی۔ چونکہ اس فساد انگیزی کے ذریعہ اللہ کی جاری سنتوں کا اس کی رضا کے خلاف استعمال کیا گیا تھا لہذا جلد ہی کائنات کے اس حصے میں ربانی نظام میں تبدیلی، بگاڑ، تعطل یا کجی پیدا ہو گئی۔ گویا ابلیس نے اس بات کی کوشش کی کہ حیات انسانی اور ماحول حیات انسانی میں ربانی نظام معطل و مخلوج اور ابلیسی نظام جاری و ساری ہو جائے تاکہ نتائج اس کی مرضی کے عین مطابق برآمد ہوں۔ قرآن، تاریخ انسانی اور آفاق و انفس میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ امور جن میں ابلیس کو کامیابی ملی درج ذیل تھیں:

- (۱) بین نجومی انتظام (Intrastellar Management)
- (۲) شمسی انتظام (Solar System Management)
- (۳) بین سیارہائی انتظام (Inter-Planetary Management)
- (۴) ارضی انتظام (Planet or Gaia Management)
- (۵) ارضی ماحولیاتی انتظام (Environmental & Ecological Management)
- (۶) نباتاتی انتظام (Botanical Management)

(۷) حیواناتی انتظام (Zoological Management)

(۸) جماداتی انتظام (Geological Management)

(۹) انسانی انتظام (Human Management)

چنانچہ ان امور میں ربانی انتظام کا جزوی یا کلی تعطل اور اس کی جگہ ابلسی انتظام کا اجراء یا تسلط طرح طرح کے فسادات برپا کرنے کا موجب بن گئے۔ اسی طرح چند ہی سو سالوں میں ایک ہمہ گیر فساد برپا ہو گیا۔ اس فساد کی درجہ بندی درج ذیل طریقہ سے کی جاسکتی ہے:

(۱) فساد ماوراء نظام شمسی (Intra-Stellar Disorder)

(۲) فساد نظام شمسی (Solar System Disorder)

(۳) فساد نظام تحتی خلاء (Lower Space Disorder)

(۴) فساد کرۂ برقی (Ionospheric Disorder)

(۵) فساد کرۂ عنان و مزن (Synnophic Disorder)

(۶) فساد کرۂ ہوا (Biospheric Disorder)

(۷) فساد کرۂ آب ارضی (Terrestrial Water Disorder)

(۸) فساد کرۂ بحر (Hydrospheric Disorder)

(۹) فساد کرۂ زمین (Lithospheric Disorder)

(۱۰) فساد عالم نباتات ارض (Botanical World Disorder)

(۱۱) فساد عالم حیوانات ارض (Zoological World Disorder)

(۱۲) فساد عالم حشرات الارض (Terrestrial & Sub-Terrestrial)

Animate Disorder)

(۱۳) فساد عالم انسان (Human World Disorder)

چونکہ یہ فسادات ہمہ گیر تھے لہذا ان کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ بھی ہمہ گیر تھے جن کو ہزاروں شعبوں میں شمار کیا جاسکتا ہے لیکن ان میں سے ایک ایسا فساد بھی برپا ہوا جس کے نتیجے میں روئے ارض اور ماوراء ارض میں کئی نئی مخلوقات اور ذی روح پیدا ہو گئیں جو بے حد خطرناک تھیں اور یہ نئی مخلوقات پیدا ہونے کے بعد خود نظام کائنات کو درہم برہم کرنے لگیں۔ فساد علی

الفساد کی یہ صورت ناقابل بیان تباہیوں کا باعث ہوئی۔ ان نئی اور خطرناک مخلوقات کو تین خانوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے:

- (۱) ماوراء ارضی نئی مخلوقات (Trans-terrestrial New Creatures)
- (۲) ارضی و فضائی نئی مخلوقات (Terrestrial & Aerial New Creatures)
- (۳) تحت و طبقات ارضی نئی مخلوقات (Sub-terrestrial New Creatures)

ماوراء ارضی نئی مخلوقات: ماوراء ارضی نئی مخلوقات میں ظاہر ہے انسانی جزئیوں کے برابر تھا اس لئے کہ ان کا دائرہ حیات اور دائرہ عمل ماوراء ارضی تھا۔ ماوراء ارضی کے دائرے میں چونکہ یہ زمین بھی آتی ہے اس لئے یہ نئی اور خطرناک مخلوقات ستاروں، نظام شمسی اور سیاروں کی طرح اس زمین پر بھی آمد و رفت، چلت بھرت اور عمل دخل رکھتی تھیں۔ یہ کتنی طاقت ور اور انسانی قوت کے تصور سے ماوراء تھیں کہ انسانوں کو ان پر مافوق الفطرت ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

قرآن نے ان کی اقسام چھ شمار کی ہیں: قرآن کا ارشاد ہے:

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا (نوح ۲۳)

ترجمہ: اور وہ سب بولے ہرگز نہ چھوڑو اپنے آئینوں کو اور نہ چھوڑو ود کو اور نہ سواع کو اور نہ یغوث کو اور یعوق کو اور نہ نسر کو یہ چھ مخلوقات تھیں:

- (۱) آلہ
- (۲) ود
- (۳) سواع
- (۴) یغوث
- (۵) نسر اور
- (۶) یعوق

ارضی وفضائی نئی مخلوقات : ارضی وفضائی نئی مخلوقات ماوراء ارض نئی مخلوقات کے مقابلے میں کم طاقت ور اور کم خطرناک تھیں مگر انسانوں کے لئے اتنی ہی خطرناک تھیں۔ یہ نئی مخلوقات پوری روئے زمین اور اس کی فضا میں اپنی اپنی خصوصیات کے ساتھ عمل دخل رکھتی تھیں۔ ان میں سے بعض زمین پر چلنے والی اور بعض زمین پر چلنے اور فضا میں اڑنے والی دونوں ہی تھیں۔ قرآن نے ان ارضی وفضائی نئی مخلوقات کی پانچ قسمیں شمار کی ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) جبار

(۲) نفل

(۳) نفر

(۴) عفریت

(۵) انسان غیر صالح

غیر صالح انسان انسان ہوتے ہوئے انسان نہیں تھے۔ ”غیر صالح“ قرآن کی ایک مخصوص اصطلاح ہے بطور خاص اس وقت جب کہ اس کا استعمال طوفان نوح سے قبل کی فضا میں کیا جا رہا ہو۔ ایسی حالت میں ”غیر صالح“ کا مفہوم اس مفہوم سے قطعاً الگ ہوتا ہے جو عام طور پر احادیث، فقہ اور اخلاقیات کے تناظر میں پایا جاتا ہے۔ عہد طوفان نوح سے ماقبل کے تناظر میں اس کا مفہوم ہے رموز حیات، افزائش، تربیب، تبدیلی اور موت سے عبارت ربانی نظام کو معطل، مفلوج یا تبدیل کر کے ابلیسی خواہشات اور طریقہ کے مطابق پیدا شدہ، پروردہ یا تبدیل شدہ انسان نما پیکر وجود۔ چنانچہ فناء و ملکوت کے زمانے میں ایسے بہت سے انسان نما پیکر وجود پیدا ہوئے جن کی متعدد قسمیں بھی تھیں۔

تحت و طبقات ارضی نئی مخلوقات : تحت و طبقات ارضی نئی مخلوقات جو اس فساد انگیزی کے نتیجے میں پیدا ہوئیں وہ بھی ماقبل کی دونوں قسموں سے کم خطرناک نہیں تھیں۔ یہ مخلوقات عموماً زمین پر ریگنے والی، دوڑنے والی، پھد کئے والی یا اڑنے والی مگر زیر زمین رہنے والی تھیں۔ یہ عام طور پر دیو ہیکل ہوا کرتی تھیں۔ قرآن نے ان میں تین مخلوقات کا ذکر صراحتاً کیا ہے جو درج ذیل ہیں:

(۱) دابہ

(۲) نملہ

(۳) یا جوج ماجوج

اس تعلق سے جہاں یہ بات ممکن ہے کہ یہ ماوراء ارضی، ارضی و فضائی اور تحت و طبقات ارضی نئی مخلوقات اس دور فساد ملکوت میں بالکل پہلی بار پیدا ہوئی ہوں وہیں یہ بات بھی ممکن ہے کہ یہ کروڑوں اور اربوں سال قبل کائنات میں پیدا کی گئیں ہوں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ارتقاء کی ناکامی کے سبب ختم کر دیا ہو لیکن ملائکہ سے مخالف کر کے ابلیس نے ان فنا کردہ مخلوقات کو از سر نو پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہو جیسا کہ آج یوراسک پارک (Jurassic park) کی تشکیل کی کوششیں ہو رہی ہیں۔

بہر حال اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان فسادات کے سبب جو ملکوت میں بدیا کئے گئے تھے زمین اور ماوراء زمین کی کیا حالت ہوئی ہوگی؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چند ہی سو سالوں کے اندر اندر ہر طرف ربانی نظام مفلوج اور ابلیسی نظام کا تسلط ہو گیا ہوگا اور چند نفوس قدسیہ اور چند جاندار اور پیڑ پودوں کو چھوڑ کر بقیہ روئے ارض و ماوراء ارض کائنات پوری طرح فساد آلودہ ہو گئی ہوگی۔ حاصل بحث یہ ہے کہ حضرت اور بلیس کے ذوالکفل بنادیئے جانے کے بعد ابلیس نے منہج سفک دم یعنی منہج خوں ریزی کو ترک کر دیا۔ اب اس کی ساری توجہ ارض و سماء میں فساد ملکوت کے ذریعہ بنی آدم کو تباہ کرنے کی طرف ہو گئی۔ چنانچہ روئے ارض پر جہاں دیگر مخلوقات کے مابین بنی آدم افزائش کے مرحلے سے گزر رہے تھے اور بہت ممکن ہے کہ ان کی تعداد لاکھوں بلکہ کروڑوں سے متجاوز ہو چکی ہو ابلیس نے ایک ایسی فکر اور تہذیب کی بنیاد ڈالی جس کے پیچھے بنیادی محرک ملکوت کو مسخر کرنے اور اسے اپنی مرضی کے مطابق ربانی طریقے کے بجائے اپنے طریقے سے چلانے کا عزم تھا۔ لہذا تھوڑے ہی عرصے میں بنی نوع انسان میں سے ایک تعداد نے ابلیس کے ساتھ تحالف کر لیا اور بقیہ آبادی ان کے ہاتھوں میں مجبور محض ہو گئی۔ تدبیر عالم پر متعین بعض ملائکہ کے حلیف ہونے کے سبب ملکوت پر ابلیس کا جو تسلط قائم ہوا اور اس سے جو طاقت ہاتھ آئی وہ سب بنی بقیہ انسانی آبادی کے ان کے ہاتھوں میں مجبور محض بن جانے کا۔ ایسی حالت میں عالم انسانیت کے وہ چند نفوس قدسیہ جو ثابت قدم رہ گئے تھے اور جنہوں نے ابلیس کی بالادستی قبول نہیں کی وہ پورے معاشرے سے کاٹ کر رکھ دیئے گئے تھے اور ابلیس کے ذریعہ حاصل کردہ اس قوت قاہرہ کے سامنے وہ تقریباً بے بس ہو چکے تھے۔ یہی وہ حالت ہے جس کا

اندازہ درج ذیل آیات سے ہوتا ہے:

(۱) قال الملاء من قومہ انا لنراک فی ضلال مبین (الاعراف ۶۰)

ترجمہ: بولے ملائ اس کی قوم کے ہم دیکھتے ہیں تجھ کو صریح گمراہی میں۔

(۲) قال الملاء الذین کفروا من قومہ انا لنراک فی سفاہة وانا لنظنک من

الکذبین (الاعراف ۶۶)

ترجمہ: بولے سردار جو کافر تھے اس کی قوم میں ہم تو دیکھتے ہیں تجھ کو عقل نہیں اور ہم تو تجھ کو جھوٹا گمان کرتے ہیں۔

(۳) فاجمعوا امرکم وشرکاءکم ثم لایکن امرکم علیکم غمۃ ثم اقضوا

الی ولا تنظرون (یونس ۷۱)

ترجمہ: اب تم سب مل کر مقرر کرو اپنا کام اور جمع کرو اپنے شریکوں کو پھر نہ رہے تم کو اپنے کام میں شبہ پھر کر گزرو میرے ساتھ اور مجھ کو مہلت نہ دو۔

(۴) ولا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب ولا اقول انی ملک

ولا اقول للذین تزددی اعینکم لی یوتیہم اللہ خیرا (ہود ۳۱)

ترجمہ: اور میں نہیں کہتا تم کو کہ میرے پاس ہیں خزانے اللہ کے اور نہ میں خبر رکھوں غیب کی اور نہ کہوں کہ میں ملک ہوں اور نہ کہوں کہ جو لوگ تمہاری نظر میں حقیر ہیں نہ دے گا ان کو اللہ بھلائی۔

(۵) قالوا انؤمن لک واتبعک الارذلون (الشعراء ۱۱۱)

ترجمہ: بولے کیا ہم تجھ کو مان لیں اور تیرے ساتھ ہو رہے ہیں کہنے

(۶) قالوا لئن لم تنتہ یروح لتکوفن من المرجومین (الشعراء ۱۱۶)

ترجمہ: بولے اگر تو نہ چھوڑے گا اے نوح تو ضرور سنگسار کر دیا جائے گا

(۷) ونجینہ واهلہ من الکرب العظیم (الصافات ۷۶)

ترجمہ: اور بچا دیا اس کو اور اس کے گھر والوں کو اس بڑی گھبراہٹ سے

(۸) وقوم نوح من قبل انہم کانوا ہم اظلم واطغی (النجم ۵۲)

ترجمہ: اور نوح کی قوم کو ان سے پہلے وہ تو تھے اور بھی ظالم اور سرکش

(۹) فذعاربہ انی مغلوب فانتصر (القمر ۱۰)

ترجمہ: پھر پکارا اپنے رب کو کہ میں مغلوب ہو گیا اب تو ہی مدد کر

(۱۰) ومکروا مکرا کبارا (نوح ۲۲)

ترجمہ: اور مکر کیا بہت بڑا مکر۔

یہ وہ حالات تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا: حضرت نوح روئے ارض پر سب سے پہلے اولی العزم رسول بن کر تشریف لائے۔ ان کی پیدائش خود ایک آیت باہرہ تھی۔

”کتاب نوح“ میں مذکور واقعہ اس کی اچھی تفہیم کراتا ہے:

”حضرت ادریس نے کہا: اس کے چند دنوں کے بعد میرے بیٹے متو صالح نے اپنے بیٹے لایح کی شادی کر دی اور وہ خاتون حاملہ ہو گئی اور اس نے ایک بیٹا جنا۔ اس (بچے) کا جسم برف سے زیادہ سفید اور گلاب سے زیادہ سرخ کھلتا ہوا تھا۔ اس کے سر کے بال اور دراز زلفیں رکاکل اون سے زیادہ سفید تھیں اور اس کی آنکھیں حسین تھیں۔ جب اس (بچے) نے آنکھیں کھولیں تو سارا گھر سورج کی طرح جگمگا اٹھا اور سارا گھر بقیعہ نور ہو گیا۔ دائی کے ہاتھوں میں جاتے ہی وہ کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے دہن کھولے اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح کی۔ (یہ دیکھ کر) اس کے والد لایح اس سے خوفزدہ ہو گئے اور بھاگ کر اپنے والد متو صالح کے پاس آئے اور ان سے فرمایا: میرے ہاں ایک عجیب و غریب بیٹا تولد ہوا ہے جو انسانوں سے مختلف ہے اور آٹھوں (ابناء نور) سے ملتا جلتا ہے۔ اس کی فطرت بھی مختلف ہے وہ ہماری طرح بھی نہیں ہے۔ اسکی آنکھیں ایسی ہیں گویا ان سے سورج کی کرنیں نکل رہی ہوں اور اس کا چہرہ پروقار ہے۔ (اسے دیکھ کر) مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ میری اولاد نہیں بلکہ ملک کی اولاد ہے۔ مجھے خوف ہے کہ اس کے عہد حیات میں روئے ارض پر کوئی عجیب و غریب واقعہ رونما ہوگا۔ اور اب اے میرے والد محترم! میں درخواست لیکر آیا ہوں اور التجا کرتا ہوں کہ آپ (ہمارے جد) حضرت انس (ادریس) کے پاس جائیں اور ان سے دریافت کریں کہ اس (ولادت) کی حقیقت کیا ہے؟ اس لئے کہ ان (حضرت انس ادریس) کا مسکن ملائکہ کے مابین ہے۔ جب متو صالح نے اپنے بیٹے کی باتیں سنیں تو وہ میرے پاس افق کے قریب آیا اس لئے کہ اس نے سنا تھا کہ میں وہاں ہوں اور اس نے زور سے پکارا یہاں تک کہ میں نے اس کی آواز سنی اور اس کے پاس آیا۔ میں نے اس سے کہا: دیکھو! میں یہاں ہوں،

میرے بیٹے! تم میرے پاس کس غرض سے آئے ہو؟ چنانچہ اس نے جواب دیا اور کہا: میں ایک بڑی فکر اور پریشانی کی وجہ سے آپ کے پاس آیا ہوں اور ایک بڑی پریشان کن رویت میرے آنے کا سبب ہوئی ہے۔ اور اب ابا جان میری بات سنئے۔ میرے بیٹے لایح کے ہاں ایک بیٹا تولد ہوا ہے جو اوروں سے بالکل مختلف ہے۔ اس کی فطرت انسانوں کی طرح نہیں۔ اس کے جسم کی رنگت برف سے زیادہ سفید اور گلاب سے زیادہ سرخ کھلتا ہوا ہے۔ اس کے سر کے بال اون سے زیادہ سفید ہیں، اسکی آنکھیں سورج کی کرنوں کے مثل ہیں (پیدا ہوتے ہی) جیسے اس نے آنکھیں کھولیں سارا گھر منور ہو گیا، اور وہ دائی کے ہاتھوں میں کھڑا ہو گیا اور اس نے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کی، (یہ دیکھ کر) اس کے والد لایح خوفزدہ ہو گئے اور بھاگ کر میرے پاس آئے۔ اسے یقین ہی نہیں ہے کہ وہ اس کی اولاد ہے۔ اس لئے کہ وہ ملک السموت سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ اور دیکھئے میں آپ کے پاس اسی لئے آیا ہوں تاکہ آپ اس کی حقیقت سے ہم سب کو آگاہ کریں۔ تب میں انس (ادریس) نے جواب دیا اور کہا: اللہ رب العالمین روئے ارض پر ایک عجیب چیز کرنے والا ہے۔ اور اسے میں نے رویت میں دیکھا ہے۔ اور اب اسکی تمہیں خبر دیتا ہوں کہ میرے والد حضرت یرد کے عہد میں بعض ملائکہ نے کلمۃ اللہ کے تقدس کو پامال کیا۔ اور جان لو کہ ان لوگوں نے گناہ کیا اور حق کی خلاف ورزی کی اور خود کو عورتوں سے مزوج کیا اور ان کے ساتھ گناہ کئے، بعض نے ان میں سے بعض سے شادی کر لی اور ان سے اولادیں ہوئیں۔ انہوں نے روئے زمین پر جبار پیدا کئے یہ جبار روح کے مطابق نہیں بلکہ لحم کے مطابق پیدا کئے گئے، اور (اسی وجہ سے) روئے ارض پر بڑی بھاری سزا کا نفاذ ہونے والا ہے۔ اور روئے ارض تمام نجاستوں سے پاک کر دی جائے گی۔ پوری روئے زمین پر ایک بڑی تباہی مقدر ہو چکی ہے اور ایک بڑی تباہی اور ایک بڑا سیلاب آئیگا جو ایک سال تک رہے گا۔ اور یہ بیٹا جو تمہارے یہاں تولد ہوا ہے زمین پر زندہ بچ جائے گا اور اس کے تین بیٹے اس کے ساتھ بچیں گے۔ جبکہ روئے ارض پر ساری خلقت آدم ماری جائے گی۔ اور اب اپنے بیٹے لایح کو بتادو کہ تولد ہونے والا وہ بیٹا اسی کا ہے اس کا نام نوح رکھو اس لئے کہ صرف وہی بچا لیا جانے والا ہے۔۔۔۔۔ جب میتو صالح نے اپنے والد حضرت انس (ادریس) کی باتیں سنیں اور انہوں نے اسے سارے راز سر بستہ کھول کر دکھادیئے تھے۔ تو وہ واپس آئے اور لوگوں کو وہ باتیں بتائیں اور اس بچے کا نام نوح رکھ دیا اس

لئے کہ وہی زمین کی تباہی کے بعد اسے پھر استوار کرے گا۔“

اسی سنگین صورتحال میں جس کا ذکر ابھی ابھی کیا گیا حضرت نوح علیہ السلام مبعوث فرمائے گئے۔ ارض و ماوراء ارض میں ہر جگہ پھیلا فساد ملکوت اللہ تعالیٰ سے اصلاح احوال کے لئے کلی تباہی کا تقاضا کر رہا تھا تا کہ از سر نو تعمیر بلکہ تخلیق کی جائے۔ لیکن روئے ارض پر نوع آدم کی موجودگی خواہ وہ چند نفوس قدسیہ تک ہی محدود کیوں نہ رہ گئی ہو۔ ان میثاقوں کے تحت جو حضرت آدم اور حضرت ہابیل کی بحالی حیثیت آدم کے تعلق سے کئے گئے خدمات و اعمال کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے رحمت و فضل کئے تھے۔ لہذا ان رحمتوں کے بعد ایسا کرنے خود عند اللہ درست نہ تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس فساد کے خاتمے کے لئے سہ روئے اقدامات (Three- Dimensional Operation) کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ وہ سزا دینے سے قبل بھی مخلوق کو پلٹ آنے کا موقع عنایت فرماتے ہیں۔ لہذا اس سنگین صورتحال کے باوجود بھی اللہ نے پلٹ آنے کے مواقع عنایت فرمائے۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

وما اهلكنا من قرية الا لھا منذرون ذكرا وما كنا ظلمين (الشعراء، ۹-۲۰۸)

ترجمہ: اور کوئی آبادی نہیں غارت کی ہم نے جس کے لئے نہیں تھے ڈر خانے والے یا دولا نے کو اور ہمارا کام نہیں ہے ظلم کرنا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا تا کہ وہ اس کلی عذاب سے قبل بنی آدم کو بچانے کی سعی فرمائیں۔

اس فساد ملکوت کے خاتمے کے لئے سہ روئے اقدامات درج ذیل تھیں:

(۱) مقرب ملائکہ بالخصوص حضرت میکال اور حضرت جبریل کے ذریعہ

اقدامات

(۲) حضرت ادریس ذوالکفل کے ذریعہ اقدامات اور

(۳) طوفان یعنی فارتور اور پھر بلع ماء، قلع ساء، فیض ماء، قحطی امر اور استوی علی

الجودی کے ذریعہ اقدامات

حضرت نوح علیہ السلام نے تمام روئے ارض کے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا اور انہیں اس فساد عظیم سے آگاہ کیا۔ جو عالم انسانیت کو چاروں طرف سے گھیر چکا تھا۔ انہوں نے لوگوں کو صاف صاف متنبہ کیا اور پکارا کہ لوگ اس فساد عظیم کا جسے ابلیس نے بھڑکایا ہے حصہ نہ بنیں اور

اس کی حقیقت کو سمجھ کر اللہ کی طرف اور اپنے منصب کی حفاظت کی طرف متوجہ ہوں۔ اور حضرت نوح نے انداز کا آغاز فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے ان تینوں اقدامات کو وقفے وقفے سے روئے ارض پر رو بہ عمل لانے کا فیصلہ فرمایا۔ چنانچہ یہ تینوں اقدامات اسی ترتیب سے نافذ العمل ہوئے۔ ممکن ہے کہ ان تینوں کی تعمیل میں کئی کئی سو سالوں کا وقفہ رہا ہو مگر یہ واضح ہے کہ ان تینوں اقدامات کا زمانہ حضرت نوح علیہ السلام کا عہد ہی ہے۔ یہ طوفان روئے ارض پر اس وقت آیا جب آپ کی عمر شریف تقریباً چھ سو سال ہو چکی تھی۔ یعنی نوح علیہ السلام کے ذریعہ لوگوں کے مابین بلاغ مبین، نصیح مبین اور انداز مبین کا زمانہ قبل طوفان تقریباً ساڑھے پانچ سو سال سے زیادہ کا رہا ہے۔

دجال جلد اول میں حضرت ذوالقرنین سے متعلق اس عاجز نے لکھا تھا: ”کہ یہ زمانہ حضرت نوح سے قبل یا فوراً قبل کا زمانہ تھا یا خود حضرت نوح کے ساتھ ساتھ ہی یہ زمانہ آیا۔“ (دجال جلد اول صفحہ ۳۱۵) اب بعض باوثوق شہادتوں کے ملنے کے بعد میں کسی قدر حزم کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ تینوں واقعات علی الترتیب حضرت نوح علیہ السلام کے ہی عہد اول یعنی پیدائش اور طوفان کے درمیان وقوع پذیر ہوئے۔ اس فساد عظیم اور مکر کبار کے خاتمے کے لئے ربانی اقدامات کی ہی وہ روداد ہے جس کا ذکر قرآن نے متعدد مقامات پر اور بالخصوص سورہ نوح، سورہ الکہف اور سورہ ہود میں کیا ہے جس کی تطبیق کرنے میں بیشتر مفسرین متقدمین و متاخرین ناکام رہے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ حضرت نوح کے ذریعہ دعوت دیئے جانے کو جب ایک عرصہ گزر گیا تو سب سے پہلے اقدام کے بطور اللہ تعالیٰ نے باغی ملائکہ اور ماوراء ارضی نئی مخلوقات کے خلاف کارروائی کا آغاز کیا۔ ان اقدامات سے قبل اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو آگاہ کر دیا کہ وہ کیا اقدامات کرنے جا رہا ہے ظاہر ہے کہ امر کی ایسی اطلاع کسی نبی کو اپنی امت کے تعلق سے کس قدر پریشان اور مضطرب کرنے والی ہوگی۔ حضرت نوح کا یہی اضطراب ان کے قول و عمل کے ہر مقام پر جھلکتا ہے۔

باغی ملائکہ اور ماوراء ارضی نئی مخلوقات کے خلاف اقدام کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت میکال، حضرت جبرئیل اور چند دوسرے ملائکہ کو حکم جاری فرمایا۔ چنانچہ ان ملائکہ نے ان باغی ملائکہ کے خلاف کارروائی کا آغاز کیا۔ باغی ملائکہ اس کارروائی کو دیکھ کر بھاگے۔ تو ان ملائکہ نے

ان کا پیچھا کیا اور انہیں گرفتار کر لیا۔ ان باغی ملائکہ کے متعلق انہیں حکم دیا گیا کہ انہیں عذاب نار میں ڈال دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس کے بعد حضرت میکال و حضرت جبریل نے ان تمام ماوراء ارضی نئی مخلوقات کو قابو میں کرنے کے اقدامات کئے چنانچہ یہ مخلوقات تین قسموں کے انجام سے دوچار ہوئیں:

(۱) ان مخلوقات میں سے بیشتر حضرت میکال و جبریل کے ہاتھوں ماردی گئیں۔

(۲) ان میں سے بعض گرفتار ہو کر کائنات میں مختلف مقامات پر قیامت کے قریب ایک مدت خاص تک کے لئے مقید کر دی گئیں۔

(۳) بعض کائنات کے دور دراز علاقوں میں جا کر پوشیدہ ہونے میں کامیاب ہو گئیں چنانچہ ان کے دائرہ ارضی میں داخل ہونے پر ایک مدت خاص تک کے لئے پابندی لگادی گئی۔ یہی وہ اقدامات ہیں جن کا ذکر قرآن نے اس طرح فرمایا ہے:

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَا الْهَيْكَمَ وَلَا تَذَرُنَا وَدَا وَلَا سِوَاكَ وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا
وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَالًا. مِمَّا خَطَبْتَهُمْ أَغْرَقُوا فَأَدْخَلُوا نَارًا.
فَلَمْ يَجِدْ وَالْهَمُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْصَارًا (نوح ۲۵-۲۳)

ترجمہ: اور بولے ہرگز نہ چھوڑیو اپنے آٹھوں کو اور نہ چھوڑیو دود کو اور نہ سواع کو اور نہ یغوث کو اور یعوق اور نسر کو اور بہکا دیا بہتوں کو اور تو نہ زیادہ کرنا ظالموں کو مگر بھٹکنا۔ جو کچھ خطا کی تھی اس کے سبب وہ پیچھا کر کے گرفتار کر لئے گئے اور ڈال دیئے گئے نار میں پھر نہ پائے اپنے واسطے انہوں نے اللہ کے سوا کوئی مددگار۔

مفسرین کرام عام طور پر دو امور کے سمجھنے سے قاصر رہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے بعد جس طرح نفد علم ہوا ہے اس صورتحال میں ایسا ہونا بعید از قیاس نہیں۔ چنانچہ ان دو امور کے نہ سمجھنے کی حالت نے بیشتر مفسرین کو بالآخر ”مِمَّا خَطَبْتَهُمْ أَغْرَقُوا فَأَدْخَلُوا نَارًا“ کی لا طائل اور لایعنی تاویلات کرنے پر مجبور کیا۔ لہذا ان لایعنی تاویلات نے آگے چل کر قرآن کے نظم سے متعلق مزید پیچیدگیاں پیدا کر دیں جن کا حل کرنا مزید توڑ مروڑ کرنے کا باعث ہوا۔ نظم کی یہ پیچیدگی اس لئے پیدا ہوئی کہ قرآن اس کے بعد ذکر کرتا ہے:

وقال نوح رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا (نوح ۲۶)

ترجمہ: اور پکارا نوح نے اے رب! مت چھوڑ زمین پر کافروں میں سے ایک بستی
وہ دو امور جن کا نہ سمجھ پاتا ان ساری لایعنی تاویلات کے وضع کرنے کا باعث ہوا درج
ذیل ہیں:

(۱) آلہ، ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کا اور انہیں نہ چھوڑنے کا مفہوم۔

(۲) اغرقوا کا مفہوم۔

آلہ، ود، سواع وغیرہم سے متعلق عام طور پر اس خیال کا اظہار کیا جاتا ہے کہ یہ پہلے
زمانے کے کچھ بزرگ لوگ تھے۔ ان بزرگوں کی وفات کے بعد شیطان کے اغوا سے لوگوں نے
ان کی تصویریں بطور یادگار بنا کر کھڑی کر لیں پھر ان کی تعظیم میں غلو ہوا بالآخر ان کی پرستش ہونے
لگی اور وہ دیوتا اور معبود بنائے گئے یہاں تک کہ بعض روایات کے مطابق عہد جاہلیت میں عرب
بھی انہیں معبودوں کی طرح پرستش کرنے لگے ۱۵

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ان باتوں کا حضرت نوح علیہ السلام کے عہد سے متعلق مذکور ان
آیات سے دور دور کا کوئی تعلق نہیں۔ مفسرین نے جن تفصیلات کو درج کیا ہے وہ یقیناً واقع ہوئیں
ہوئیں لیکن اس وقت نہیں جن کا ذکر ان آیات میں ہے بلکہ بعد میں۔ یہاں جن امور کا تذکرہ
قرآن کر رہا ہے وہ اس سے الگ ہیں۔ جس وقت حضرت نوح اللہ تعالیٰ کو پکار رہے تھے اور جن پر
قرآن کی یہ آیات شاہد ہیں اس وقت تھوڑے ہی عرصہ قبل تک یہ وہاں سواع ان کے درمیان زندہ
تھے اور انہیں اور اہل باطل کے دست و بازو تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کی زندہ موجودگی اور بعد ان کی معبودوں کی طرح پرستش
کے درمیان کئی ہزار سالوں کا وقفہ ہے اور اس دوران کئی مرحلے گزرے ہیں جن کا تعلق ان آیات
سے نہیں۔ یہ مرحلے درج ذیل ہیں:

(۱) عہد وراثت یا پستی پرستی کا عہد

(۲) عہد صنمیت یا تصور و تصویر و علامات پرستی کا عہد

(۳) عہد نسبت یا عقیدت، تعلق، اور نسبت کا عہد

(۴) عہد حیات یا حقیقتی وجود کا عہد

طوفان نوح کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال کے بعد آگ، ود وغیرہم عہد صمیمیت میں داخل ہوئے یعنی ان کی تعظیم کی جانے لگی اور بعض لوگوں نے ان کی یاد کو مستحکم بنانے کے لئے انہیں تصویروں کا روپ دیا جو مرجع تعظیم بنیں۔ جہاں تک ان کی بت تراشی اور بت پرستی کا سوال ہے تو وہ مزید کئی ہزار سالوں بعد کا واقعہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ نام دراصل ان ماوراء ارضی مخلوقات کے اسم جنس ہیں جنہیں حضرت یرد کے عہد سے ابلیس نے تدبیر عالم پر متعین بعض ملائکہ کے ساتھ تحالف کر کے اور نور، ظلمت (قرآن نور کے فقدان کو ظلمت قرار نہیں دیتا بلکہ ایک مستقل تخلیق قرار دیتا ہے)، نار اور ارض اور اسی طرح دیگر امور کے رموز حیات، افزائش، تربیب، تبدیلی اور موت کو اپنی مرضی کے مطابق اور ان میں جاری ربانی سنتوں کا رضاء ربانی کے خلاف استعمال کر کے عالم وجود میں لا دیا تھا اور جواب ان انسانوں اور دیگر مذکورہ مخلوقات کے ساتھ مل کر جو اسی طرح ابلیس کی ایمان خلیق کی گئی تھیں ابلیسی منصوبے کے تحت ارض و ماوراء ارض میں فساد برپا کر رہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ماوراء ارضی مخلوقات مثلاً اللہ، ود، وغیرہم اسی طرح کی دیگر فساد کی ارض و تحت ارضی مخلوقات کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور اور محیر العقول قوت کی مالک، غیر معمولی اور فوق البشری کاموں کو سرانجام دینے کی اہل اور سب سے اہم بات یہ کہ عام انسانی قوت اور اس کی دسترس سے کلیتہاً باہر اور آزاد اور ارض و ماوراء ارض کے علاقوں میں بے روک ٹوک آنے جانے پر قادر تھیں۔ چنانچہ ابلیس ان پر نازل تھا اور ابلیسی افراد و طبقات بالخصوص ابلیسی انسان ان کی مدد کے سہارے بے پناہ قوت کے مالک ہو چکے تھے۔ جس اقتدار کے سامنے حضرت نوح علیہ السلام نے ابتداء اعلیٰ کلمہ حق کیا وہ اقتدار انہیں مخلوقات کے سہارے اس قوت قاہرہ کا حامل ہو چکا تھا جس کو چیلنج کرنا کسی انسان کے بس سے باہر تھا۔ چنانچہ ان کے بل بوتے پر برے افراد کے سامنے اچھے افراد بالکل بے بس اور مجبور محض بنا کر رکھ دیئے گئے تھے جنہیں وہ کبھی سفیہ اور کبھی ارذل کہہ کر پکارتے تھے۔

بالآخر پہلے مرحلے میں اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو ان باغی ملائکہ کو زیر کر دیا اور دوسری طرف ان ماوراء ارضی مخلوقات کی تیغ کشی کی۔ اور یہ دونوں ہی کام ان ملائکہ کے ذریعہ سرانجام دیئے گئے جن کی سربراہی حضرات میکال و جبریل علیہما السلام کر رہے تھے۔ اس طرح ابلیس اور

ابلیسی لوگوں کا ایک بڑا اور طاقت ور بازو ٹوٹ کر رہ گیا۔ ان میں باغی ملائکہ تو عذابِ نار کے حوالے کر دیئے گئے اس لئے کہ وہ اس درجہ تکلیف اور اختیار کے مالک نہیں تھے جس درجہ میں جن وانس ہوتے ہیں۔ لہذا غالباً ان کے لئے یوم الحساب کا وہ نظم نہیں ہے جو جن وانس کے لئے ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ راست عذابِ نار کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ یہی وہ بات ہے جس کا ذکر فادخلوا نار میں کیا گیا ہے۔

دوسرا مشکل لفظ ”اغرقوا“ ہے جس کے معنی نہ سمجھنے کے سبب مزید پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ ”عربی مبین“ میں ”غرق“ کے معانی صرف ڈوبنا اور ڈوبنا نہیں۔ بلکہ پیچھا کرنا، گرفتار کرنا، اور مقید کر دینا بھی ہیں۔ اور یہ تینوں ہی معانی یہاں مراد ہیں۔ یعنی جب حضرات میکال و جبریل نے ان باغی ملائکہ اور ان ماوراء ارضی مخلوقات کے خلاف کارروائی شروع کی تو وہ بھاگ بھڑکی ہوئیں چنانچہ مقرب ملائکہ نے کائنات کی پہنائیوں میں ان کا پیچھا کی اور انہیں پکڑ کر باندھ لائے اور قید کر دیا اور جب ابلیسی انسانوں کو اپنے ان حلیفوں اور رفیقوں اور زبردست قوت رکھنے والے مددگاروں کے انجام کا علم ہوا تو وہ لرز اٹھے۔ اس وقت ابلیس نے انہیں دلاسا دیا کہ وہ دل گیر نہ ہوں ان کے یہ حلیف مارے نہیں گئے ہیں بلکہ زندہ ہیں اور مصلحتاً کہیں چھپ گئے ہیں یا چلے گئے ہیں اور یہ کہ ان سے ناامید نہ ہوا جائے اور یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اب وہ مدد نہیں کر سکتے۔ لہذا ایسا لگتا ہے کہ یہ کارروائی Damage Management کے بطور کی گئی جس کا ذکر قرآن نے یوں کیا ہے:

لَا تَذَرْنِ الْهَتَكُمْ وَلَا تَذَرْنِ وُدَّ _____ یعنی ان کے تعلق سے مایوس اور دل برداشتہ ہو کر انہیں چھوڑ دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ اب بھی موجود اور صاحبِ قوت ہیں اور اپنے حلیفوں کی مدد پر قادر۔ اور یہ کہ ملائکہ کا یہ کہنا درست نہیں کہ اب ان کا قلع قمع کر دیا گیا ہے یا انہیں قید کر لیا گیا ہے اور یہ کہ جو ان میں زندہ ہیں وہ بے بس محض ہیں اور اب ملکوت کے انتظام و انصرام میں ان کا کوئی زور نہیں چلتا۔

واضح رہے کہ ”اغرقوا“ میں ایک اور معنی کا انطباق ہو سکتا ہے۔ یعنی یہ بات کہ ارض (وسیع تناظر میں) کے کسی حصے میں نہایت گہرائی میں ان باغی ملائکہ کو قید کر کے عذاب دیا جا رہا ہے۔ اس طرح اللہ سے مراد باغی ملائکہ اور دوسرا، یغوث، یعوق اور نسر سے مراد ان

باغی ملائکہ کے علاوہ دیگر ماوراء ارضی مخلوقات ہیں۔ ایک ہی آیت میں تذرین کا دوبار استعمال غالباً اسی جانب اشارہ کر رہا ہے۔

چنانچہ یہ بات حقیقت ہے کہ عہد نوح کے ابتدائی حصے میں یعنی مقرب ملائکہ کے ذریعہ ان کے قلع قمع سے قبل ان باغی ملائکہ اور ماوراء ارضی مخلوقات کا اس روئے ارضی پر فی الواقع وجود تھا اور وہ ابلیسی انسانوں کے ساتھ رہتے یا ان سے ملتے جلتے اور ان کے معین و انصار تھے۔ چنانچہ یہی ان کا حقیقی عہد تھا۔ جب پہلے اقدامات کے بطور مقرب ملائکہ نے ان کا خاتمہ کر دیا اور ان کے حوالے سے ابلیس نے اپنے لوگوں کو طرح طرح کی طفل تسلیمیاں دیں اور ان سے نسبت و عقیدت اسی طرح استوار رکھنے کی تلقین کی جیسی ان کی موجودگی میں تھی تو یہ عہد دوسرا عہد قرار پایا یعنی طوفان سے قبل کا عہد۔ یہی وہ عہد ہے جس کا ذکر اس آیت میں کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ صنمیت و وثنیت کے امور سے ان کا کوئی تعلق نہیں جیسا کہ مفسرین نے ذکر کیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نذیر مبین بنا کر بھیجا تھا۔ چنانچہ قرآن نے ذکر فرمایا: انا ارسلنا نوحا بالیٰ قومه ان انذر قومک من قبل ان یاتیہم عذاب الیم۔ قال یقوم انی لکم نذیر مبین (نوح ۲-۱)

ترجمہ: ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف کہ ڈرائے اپنی قوم کو اس سے پہلے کہ پہنچے ان پر عذاب دردناک بولا اے قوم میری بے شک میں تم سمجھوں کی طرف نذیر مبین ہوں۔ آیات قرآنی کے استقصاء سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابلیس نے حضرت ید کے بعد سے ہی ملکوت السموات والارض میں غیر معمولی فساد برپا کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ فساد اتنا ہمہ گیر ہو گیا کہ بالآخر اللہ تعالیٰ نے حضرت انس کو ذوالکفل بنا کر ان کے دست برد سے بچا لیا اور حضرت لایح کے عہد کے آتے آتے پوری روئے ارض اور ماوراء ارض اس فساد ملکوت سے کراہنے لگی۔ چنانچہ حضرت نوح کی بعثت ہی نذیر مبین کی حیثیت سے ہوئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان اقدامات کا فیصلہ حضرت نوح کے مبعوث ہونے سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ چونکہ اللہ اپنی سنت کے مطابق اس وقت تک عذاب نہیں لاتا جب تک کہ حجت پوری نہ ہو جائے اور لوگ اچھی طرح خبردار نہ کر دئے جائیں۔ چنانچہ حضرت نوح کے ذریعہ ڈرائے جانے کے بعد سب سے پہلے باغی ملائکہ اور ماوراء ارضی مخلوقات کے خلاف کارروائی کی گئی۔ ظاہر ہے یہ ملکوت کا فساد تھا لہذا اللہ تعالیٰ اس

کے لئے تکوینی راستہ اور تدابیر اختیار کرتا ہی سبب ہے کہ اس تعلق سے حضرات میkal و جبریل نے کارروائیاں کیں۔

ایسا لگتا ہے کہ ان باغی ملائکہ کے گرفتار ہونے اور عذاب میں ڈال دیئے جانے کا فوری اثر یہ برآمد ہوا کہ تدبیر عالم کے اندر حیات، افزائش، تربیب، تبدیلی اور موت کے رموز کے تعلق سے جو فساد برپا کیا جا رہا تھا وہ یکسر نہیں تو بہت حد تک کھتم گیا۔ لہذا ان فساد انگیزیوں کے نتیجے میں جو نئی نئی مخلوقات آئے دن پیدا ہو رہی تھیں یا پیدا شدہ مخلوقات میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں ان کا سلسلہ اپنے منبع سے ہی یک قلم موقوف ہو گیا۔ بہت ممکن ہے کہ اس کے نتیجے میں ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر جیسی مخلوقات کی افزائش میں زبردست کمی آگئی ہو۔ ان ملائکہ کے مقید ہونے کے بعد یا تو ان کی افزائش یکسر رک گئی ہو یا انحطاط کی طرف مائل ہو گئی ہو۔

ممکن ہے کہ اس عمل کے بعد پھر حضرت نوح کے ڈرانے کا سلسلہ مزید سو سالوں تک جاری رہا ہو تب کہیں جا کر دوسرے اقدامات کی تعمیل ہوئی ہو۔

کارروائی کا دوسرا مرحلہ تھاروئے ارض پر موجود ان مفسدوں کا خاتمہ جو اس فساد و ملکوت کے سبب زمین پر موجود اور باعث فساد تھے۔ یہ مفسدان ابلیسی انسانوں کے علاوہ تھے اور ان میں ارضی و فضائی اور تحت ارضی و طبقات ارضی مخلوقات شامل تھیں جن میں جبار، نفل، نفر، عفریت، دابہ، نملة اور یا جوج ماجوج اہم ہیں۔ چونکہ یہ مخلوقات بھی فساد و ملکوت کا ہی نتیجہ تھیں لہذا ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کے بھیجنے کا فیصلہ فرمایا۔ (ذوالقرنین کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں دجال جلد اول صفحات ۳۴۰-۲۹۳) چنانچہ روئے ارض پر حضرت انس بن یزید جواب اور یس تھے ذوالقرنین بن کر تشریف لائے۔ اور انہوں نے دوئے ارض کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ان مفسدوں کا خاتمہ کر دیا۔ یہ وہی امور ہیں جن کا ذکر سورۃ الکہف میں بالتفصیل کیا گیا ہے۔

قرآن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ارضی و فضائی اور تحت ارضی مخلوقات میں یا جوج ماجوج اپنی قوت اور خطرناکی میں مخصوص نوعیت کے تھے اس لئے ان کا ذکر ان مخصوص اقدامات کے حوالے سے منفرد طور پر کیا گیا ہے۔ احادیث اور خود قرآن کے داخلی شواہد اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ روئے ارضی پر حضرت ذوالقرنین کی کارروائیاں اور بطور خاص یا جوج ماجوج

کے خلاف کارروائیاں اور طوفان میں دنوں، ہفتوں، مہینوں یا صرف ایک یا دو سال کا فرق ہو۔ چنانچہ اس طرح اللہ تعالیٰ نے فساد ملکوت کے دو بڑے حصوں کا قلع قمع فرما دیا اب جو طبقہ بچ رہا تھا وہ ان انسانوں کا تھا جو ابلیس کے ہم رکاب تھا اور یہی طبقہ پوری انسانی آبادی پر مقتدر اعلیٰ کی حیثیت سے چلا آرہا تھا۔ حضرت نوح پر یہ بات ان دور بانی اقدامات کے بعد پوری طرح منکشف ہو چکی تھی کہ اب انسانوں پر عذاب کے اتر آنے کی باری ہے۔ اس احساس نے حضرت نوح کو بے حد مضطرب کر دیا اور انہوں نے اس فساد کو روکنے اور نوع آدم کو بچانے اور اسے منصب خلافت کی حقیقی راہ پر آگے بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ابلیس کے پھیلانے ہوئے مکر کبار کے سامنے بظاہر ساری کوششیں رایگاں گئیں۔ فساد اس قدر ہمہ گیر اور متسلسل تھا کہ سوائے چند نفوس قدسیہ کے تقریباً تمام نسل آدم حتیٰ کہ ان سے قریب رہنے والی حیوانات اور نباتات دنیا تک پوری طرح فساد آلود ہو چکی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ اصلاح حال کی ساری امیدیں جاتی رہی ہیں۔ کسی ایسے ابلیسی فساد میں نسل آدم کا اس قدر خود بڑھ چڑھ کر ملوث ہو جانا جس کا اصلی کام منصب خلافت کی حفاظت کرنا تھا کیا نتائج پیدا کر سکتا تھا اور اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے کیسی ہولناک سزا دی جانے والی تھی ان باتوں سے حضرت نوح نے لوگوں کو کھول کھول کر آگاہ کیا۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

ابلاغکم رسالت ربی وانصح لکم واعلم من اللہ مالا تعلمون (الاعراف

(۶۲)

ترجمہ: میں پہنچاتا ہوں تم کو پیغام اپنے رب کے اور نصیحت کرتا ہوں تم کو اور جانتا ہوں اللہ کی طرف سے وہ بات جو تم نہیں جانتے واعلم من اللہ مالا تعلمون (اور جانتا ہوں اللہ کی طرف سے وہ بات جو تم نہیں جانتے) کی سنگینی اور اس پر حضرت نوح کا نوع آدم کو زیادہ سے زیادہ بچانے کی کوشش کرنا وہ باتیں تھیں جنہیں بلاغ مبین، صبح مبین اور انداز مبین کہا گیا۔ قرآن کا ارشاد ہے:

ثم انی دعوتہم جہارا۔ ثم انی اعلنت لہم واسررت لہم اسراراً (نوح

(۸-۹)

ترجمہ: پھر میں نے ان کو پکارا با آواز بلند، پھر میں نے ان کو کھول کھول کر کہا اور چپکے چپکے بھی۔

بیشتر انسانوں کی بدبختی یہ تھی کہ لوگ جس قدر فساد سے روکے جاتے وہ اسی قدر بھاگ بھاگ کر اور لپک لپک کر اس میں مزید ملوث ہوتے جاتے۔ جب آپ علیہ السلام نے حق کی دعوت دینے، خیر خواہی اور نصیحت کرنے اور لوگوں کو بدترین انجام سے ڈرانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ارشاد فرمایا:

واوحی الی نوح انه لن یومن من قومک الامن قدامن فلابتئس بما کانوا
یفعلون . اصنع الفلک باعیننا ووحینا ولا تخاطبنی فی الذین ظلموا انہم
مغرقون (ہود ۳۷-۳۶)

ترجمہ: اور حکم ہوا نوح کو کہ اب ایمان نہ لائے گا تیری قوم میں مگر جو ایمان لا چکا سو غمگین نہ رہ ان کاموں پر جو وہ کر رہے ہیں اور بنا کشتی رو برو ہمارے اور ہمارے حکم سے اور نہ بات کر مجھ سے ظالموں کے حق میں یہ بے شک غرق ہو جانے والے ہیں۔

چونکہ حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خود آگاہ کر دیا کہ ”اب ایمان نہ لائے گا تیری قوم میں مگر جو ایمان لا چکا سو غمگین نہ رہ ان کاموں پر جو وہ کر رہے ہیں“ اور یہ کہ ”یہ بیشک غرق ہونے والے ہیں“۔ چنانچہ حضرت نوح نے اللہ رب العزت کا منشا و فیصلہ سمجھ لیا کہ اب مفسدین کے غرق کئے جانے اور جاہ کئے جانے کا عذاب آنے ہی والا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعا کو جو سورہ نوح میں آئی ہے بعض احادیث کے پیش نظر ایسا سمجھنا کہ حضرت نوح نے گویا عذاب سیلاب کی دعا کی تھی درست نہیں۔ بات بالکل برعکس ہے۔ اصل صورت واقعہ یہ ہے کہ جو غم انہیں کھائے جارہا تھا اس کی دو جہتیں تھیں۔ پہلی جہت یہ تھی کہ وہ لوگوں کی روش اور ہٹ دھرمی کو دیکھ کر سمجھ رہے تھے کہ عذاب اب کسی لمحے بھی آیا چاہتا ہے۔ ان کا اضطراب لوگوں کی روش کو دیکھ کر اور سواہر ہوا تھا کہ آخر لوگ اس تباہی سے بچنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے ہیں؟ یہ وہی اضطراب و کرب شدید ہے جو ہر نبی کو بنی نوع انسان کے تعلق سے ہوتا ہے۔ دوسری جہت یہ تھی کہ وہ اس اندیشے میں مبتلا تھے کہ عذاب جو بس آیا ہی چاہتا ہے کہیں کلی عذاب کی صورت میں نہ آ جائے کہ سارے کے سارے لوگ جن میں مومنین بھی شامل ہیں سب غرق کر دیے جائیں۔

پہلی جہت کے تعلق سے انہیں آگاہ کیا گیا کہ عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے اور اب وہ ٹل نہیں سکتا۔ اب عذاب آ کر رہے گا اور یہ سارے لوگ غرق کر دیے جائیں گے۔ یہی وہ بات ہے

جو سورہ ہود آیات ۳۶ اور ۳۷ میں ”فلا تبئسن“ کہہ کر بیان کی گئی ہے۔ سورہ نوح آیات ۲۶ تا ۲۸ دراصل دوسری جہت سے متعلق ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی یہ دعائیہ الفاظ اس تناظر میں تھی کہ یارب العلمین! اگر عذاب مقدر ہی ہے تو ایسا عذاب نہ لا جو روئے ارض پر سارے نفوس جن میں مومنین بھی شامل ہیں سب کا خاتمہ کر دے۔ اگر عذاب کا آنا مقدر ہی ہو چکا ہے تو وہ صرف کافرین پر آئے اور اہل ایمان محفوظ رکھے جائیں۔ یہاں فطری طور پر نبی کی وہ خواہش کہ زیادہ سے زیادہ لوگ محفوظ رہیں اپنے جوش پر آئی ہوئی صاف معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ علیہ السلام نے محفوظ رکھے جانے والے لوگوں کے دائرے کو وسیع تر کرنا چاہا۔ آپ نے فرمایا:

رب اغفر لی ولوالدی وللمومنین والمومنات (نوح ۲۸)

ترجمہ: اے رب معاف کر مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور جو آئے میرے گھر میں ایمان دار اور سب ایمان والے مردوں کو اور عورتوں کو۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کے اندر بنی آدم کے تعلق سے کسی نبی کے اندر پائے جانے والے جذبہ خیر خواہی کا کیسا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اس کا اندازہ ان الفاظ پر غور کرنے سے ہی ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ حضرت کی یہ دعا اتنی وسیع و ہمہ گیر ہے کہ صرف اس عہد کا ہی احاطہ نہیں کرتی بلکہ قیامت تک نوح آدم کی خیر خواہی کی طلب گار ہے چنانچہ آپ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اس وسیع تناظر میں بچانے کا وعدہ لیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی کی دعا قبول فرمائی جس نے اس کے خلیفہ و کھیتا تباہ ہونے سے بچانے اور ابلیس کو کامیاب ہونے نہ دینے کے لئے چھ سو سال کی ایسی ان تھک محنت کی جس کی نظیر نہیں مل سکتی بطور خاص اس صورت میں کہ اس کے لئے اس طویل مدت میں لوگوں کی طرف سے سوائے رسوائی اور خواری کے کچھ بھی نہ ملا ہو لیکن وہ اپنے کام میں مسلسل لگا رہا تا کہ اس کے رب کا فیصلہ کہ آدم ہی لائق خلافت ہے۔ جھوٹا ثابت نہ ہو.... چنانچہ آنے والا عذاب صرف کفار تک محدود رہا اور نہ صرف یہ کہ نسل آدم بچالی گئی بلکہ اہل کشتی کی نسل کو ایسی برکت ملی جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ یہی وہ بات ہے جو وعدہ کی شکل میں حضرت نوح کی زبان مبارک پر جاری ہوا۔ آپ نے فرمایا:

فقال رب ان ابنی من اہلی وان وعدک الحق (ہود ۴۵)

ترجمہ: کہا اے رب میرا بیٹا ہے میرے گھر والوں میں اور بے شک تیرا وعدہ سچا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے اس چھ سو سال کے ان تھک بلاغ مبین، نصیح مبین اور انذار مبین کا وہ لاثانی عمل ہے جس نے آدم کو تیسری عظیم جست (The Third Quantum Jump) سے نوازا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تیسری بار آدم کی حیثیت کو بحالی کی ترقی سے نوازا۔ انہیں بشارت عظمیٰ اور ضمانت وحی کی خبر دی گئی۔

قیل ینوح اھبط بسلم منا وبرکت علیک وعلی امم ممن معک (ہود ۴۸)
ترجمہ: حکم ہوا: اے نوح اتر جا، ہماری طرف سے سلامتی اور برکتیں ہیں تجھ پر اور ان گروہوں پر جو تیرے ساتھ ہیں۔

بہت دقت نظر سے غور کیا جائے تو وہ راز پنہاں آشکارا ہو جائے گا کہ یہ حکم حیثیت آدم کی بحالی کا کون سا مقام ہے۔ وہ آدم جو الجنہ سے اپنی حیثیت کے مجروح ہونے کے سبب گناہ کے معاف کئے جانے کے باوجود منتقل کیا گیا تھا کس مقام پر فائز تھا اور اس سے آگے کیا توقعات تھیں اور اس کے برعکس خلاف ورزی کی صورت میں وہ کس مقام پر چلا آیا تھا۔ اسے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان حیثیات کی تعیین کر لی جائے۔

(ملاحظہ فرمائیں نقشہ اول بر صفحہ ۱۵۰)

چنانچہ طوفان کے بعد حکم الہی ”اھبط“ (اتر جا) (سورہ ہود ۴۸) دراصل روحانی طور پر ماقبل کے ”اھبطوا“ (تم لوگ اتر جاؤ) (البقرہ ۳۶ اور ۴۸) کی معکوسی صورت تھا۔ گویا حضرت نوح علیہ السلام کی چھ سو سال کی انتھک محنت اور غیر متزلزل عزیمت نے آدم کی حیثیت کو جسے ان سے قبل حضرت ہابیل اور ان سے قبل خود حضرات آدم و حوا نے بحال کیا تھا مزید بحال کر کے اس مقام پر پہنچا دیا جسے مقام الجنہ کی حیثیت کہتے ہیں۔ لیکن سورہ ہود آیت ۴۸ کے آخری کلمات اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ پوری بحالی نہیں تھی۔ قرآن نے ارشاد فرمایا:

وامم سمتعہم ثم یمسہم منا عذاب الیم (ہود ۴۸)

ترجمہ: اور دوسرے گروہ ہیں کہ ہم فائدہ دیں گے ان کو پھر پہنچے گا ان کو ہماری طرف سے عذاب دردناک۔

یعنی اب بھی الجنہ کے مقام تک بحالی میں ایک کسر باقی رہ گئی ہے۔ چنانچہ یہ بحالی دراصل اس روحانی حالت کی بحالی تھی جو حضرات آدم و حوا کی توبہ اور ہبوط کے مابین حیثیت آدم

حیثیت خلیفہ (بوقت عرض)

مقام آدم (المسجور)

مقام آدم قدیم

توبہ آدم

مرحلہ ترقی حیثیت آدم برز میں

مقام آدم و حوا الجنت میں (قبل گناہ)

مرحلہ بحالی حیثیت آدم برز میں

مرحلہ بحالی الجنت میں

انحرطت و زوال حیثیت

(۶) ترقی دوم مقام آدم (المسجور) =

اجازت اقامت سنت صلوٰۃ
= اجازت تکمیل اقامت صلوٰۃ (حجۃ
الوداع)ترقی دوم
(جہاد محمد)

تخصیص آدم (دوم)

(۵) ترقی اول مقام آدم و حوا تخصیص

آدم بر مقام آدم قدیم = اجازت
اقامت سنت نکاح = اجازت تکمیل
اقامت حاجتترقی اول
(جہاد محمد)

تخصیص آدم (اول)

(۴) مزید بحالی شدہ مقام آدم و حوا =

مقام آدم و حوا الجنت میں (قبل گناہ) =
اتمام کلمات = اجازت اقامت
سنت نختہ، انعام امانت ناسچوتھی بحالی
(جہاد ابراہیم)(۳) مزید بحالی شدہ مقام آدم و حوا
برز میںتیسری بحالی
انحرطت

تخصیص آدم (ثالث)

(۲) مزید بحالی شدہ مقام آدم و حوا برز میں

دوسری بحالی
قدیم بائیل

(۱) مقام آدم و حوا الجنت میں (بعد توبہ و

قبولیت) = مقام آدم و حوا برز میں

پہلی بحالی
(توبہ آدم و حوا)

دھوا تھی۔ یہاں ایک خفیف اشارہ اس امکان کی طرف بھی ملتا ہے کہ حضرات آدم و حوا نے توبہ تو
 الجنہ میں کی لیکن انہیں باضابطہ توبہ کے قبول ہونے کی اطلاع روئے زمین پر دی گئی تھی۔ ممکن ہے
 باضابطہ اطلاع اس وقت دی گئی ہو جب حضرت حوا کا وضع حمل ہو گیا ہو اور حضرت حوا کا جسم قانیل
 کے جسم سے الگ ہو کر پاک ہو گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی حاملہ مطلقہ ہو اور اس کی عدت
 تین ماہ یا چار ماہ کچھ دن نہ ہو کر سات ماہ تک یعنی وضع حمل تک برقرار رہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مطلقہ
 وضع حمل کے بعد ہی نکاح ثانی کر سکتی ہے یا کوئی خاتون ہو جس سے غلطی سے بیوی سمجھ کو کسی نے
 صحبت کر لی ہو اور اس کو حمل رہ گیا ہو تو وہ وضع حمل کے بعد ہی اپنے شوہر کی طرف لوٹ سکتی ہے۔

www.bookstube.net
 www.urdutube.net
 prepared by M. Aamir Mehmood
 www.urdumovies.net
 www.asraralam.net

منہج سوم: فساد ملکوت حکمی

فساد ملکوت اپنے منہج کے اعتبار سے بنیادی طور پر ابلیس کی کوشش کا وہ حصہ تھا جہاں اس کے غالب شریک کار باغی ملائکہ تھے۔ جن اور انسان بہر حال اس میں طبقہ ثانی و ثالث تھے اور محض آلہ کار یا معمول کی طرح کام کرنے والے تھے۔ طوفان اور اس سے قبل حضرت ذوالقرنین اور حضرات میکال و جبریل کی کارروائیوں نے ان طبقات کا کلیتہاً خاتمہ کر دیا۔ باغی ملائکہ گرفتار کر لئے گئے، بعض جن اور مخلوط طور پر بنائی گئی مخلوقات یا تو ماری گئیں یا مقید کر دی گئیں یا زمین بدر کر دی گئیں۔

ابلیس نے پوری طرح اندازہ لگالیا کہ اس کا یہ منہج جس پر اس نے حضرت پر علیہ السلام کے عہد میں معرکہ خلافت کی بنیاد ڈالی تھی وہ کلی طور پر منہدم ہو گیا ہے۔ اور صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ بری طرح ناکام ہوا بلکہ اس منہج کے غالب شریک کار سارے کے سارے مارے گئے یا اب وہ ان کی مستقبل قریب میں مدد نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس نے ایک نئے منہج کے آغاز کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ابلیس کے نئے منہج کی تفصیلات پر نظر ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ چند اہم امور کی توضیح کر دی جائے:

- (۱) منہج: یہاں منہج سے مراد ابلیس کا منہج ہے۔ منہج اس طریقے کو کہتے ہیں جسے ابلیس معرکہ خلافت میں حق کو شکست دینے اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اختیار کرتا ہے۔ اس میں نصب العین، طریقہ جنگ، طریقہ وصولت تحالف وغیرہ کا ایک پورا نظام شامل ہوتا ہے۔
- (۲) تبدیلی منہج: تبدیلی منہج سے مراد یہ ہے کہ جب ابلیس اپنے سابقہ منہج پر چلتے ہوئے حق اور اہل حق کو شکست دینے میں ناکام ہو جاتا ہے یا اسے حصول مقصد کی راہ مسدود نظر آتی ہے تو وہ اس منہج کو چھوڑ کر دوسرا منہج اختیار کرتا ہے۔ اس کا یہ فیصلہ انتہائی خفیہ اور غیر محسوس ہوتا ہے۔ انسانوں کے لئے یہ بات تقریباً محال ہوتی ہے کہ وہ ابلیس کے منہج کی تبدیلی کو ابتداً محسوس کر سکے یا اس کا اندازہ کر سکے۔ یہی وہ صورت حال ہے جب اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ ہدی (البقرہ ۳۸)

کے تحت بنی آدم کی آیہ خاص صورت سے مدد کرتا ہے۔ اور وہ صورت ہے روئے ارض پر رسول کی بعثت۔ چنانچہ جب بھی ابلیس کے منہج میں تبدیلی ہوئی ہے اللہ تعالیٰ نے روئے ارض پر رسول مبعوث فرمائے ہیں۔ یہ رسول ابلیس کے منہج سے بفضلہ تعالیٰ واقف ہوتے ہیں چنانچہ وہ روئے ارض پر اظہار کی ذمہ داریاں پوری فرماتے ہیں۔

(۳) میثاق: میثاق دو فریق کے مابین عہد کو کہتے ہیں۔ یہاں میثاق سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ اور بنی آدم کے مابین ہوتا ہے۔ لیکن قرآن میں یہ عہد اللہ تعالیٰ اور کسی عام فرد یا گروہ کے مابین ہونا مراد نہیں ہے۔ بلکہ اس میں اجتماعیت کا پہلو بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کسی فرد یا قوم کو اس کے فوری یا ماقبل کے عمل خیر کے نتیجے میں اپنے کام کے لئے منتخب کرتا ہے۔ یہ ایک عہد ہوتا ہے کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کسی فرد یا قوم کو اس زمانے میں یا ماضی بعید میں غیر معمولی عمل خیر کے صلے میں اپنے کسی اگلی مہم یا کام کے لئے منتخب کرنا۔ گویا یہ ایک عہد بھی ہوتا ہے اور انعام بھی۔

اگر یہ انتخاب کسی ماقبل کے عمل خیر کے بجائے محض استحقاق اور اہلیت کی بنیاد پر ہو تو اسے قرآن نے 'امانة' قرار دیا ہے۔

چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

وَإِذَا أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ ابْنِ مَرْيَمَ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا (الاحزاب ۷)

ترجمہ: اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) یاد رکھو اس عہد و پیمان کو جو ہم نے نبیوں سے لیا ہے اور تم سے بھی اور نوح سے اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی۔ ان سب سے ہم پختہ عہد لے چکے ہیں۔

یہ آیت نہایت بلیغ ہے اور نہ صرف یہ کہ تاریخ بنی آدم کا پورا نقشہ پیش کرتی ہے بلکہ اس کے اندر جاری معرکہ خیز و شرکی بھی۔ اگرچہ بیشتر مترجمین و مفسرین نے "من النبیین" اور "أخذنا" منہم" سے صراحتاً یا بغیر صراحت کے تمام انبیاء مراد لیا ہے یہ ایک لحاظ سے درست بھی ہے لیکن اس عاجز کے نزدیک یہاں جس میثاق کا ذکر ہو رہا ہے اس میں تبعاً تو سارے ہی انبیاء بلکہ سارے مومنین آجاتے ہیں لیکن فی الواقع وہ دراصل رسولوں سے لئے گئے عہد ہیں جو اظہار کے

لئے ہدی لیکر آتے ہیں اور سنت قائم فرماتے ہیں۔ اس طرح اس آیت میں اس کا بھی اشارہ موجود ہے کہ روئے ارض پر سب سے پہلا میثاق حضرت نوح علیہ السلام سے لیا گیا۔ اور سب سے آخری خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ علماء یہود و نصاریٰ اگرچہ حضرت نوح سے قبل بھی دو میثاق تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن فی الواقع وہ میثاق سے زیادہ امانہ تھے۔

(۴) تفویض: تفویض سے مراد ذمہ داری کا دینا ہے۔ ہر چند کہ اس لفظ کا مفہوم میثاق میں داخل ہے لیکن مزید وضاحت کے لئے اسے الگ بیان کیا جانا ضروری ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کو مجتبیٰ قرار دیکر اس سے میثاق لیتا ہے اور وہ اسے قبول کر لیتا ہے تو اس پر اس کی اگلی ذمہ داریوں کے تعلق سے نہ صرف یہ کہ ذمہ داریوں اور نصب العین کی تعیین واضح کی جاتی ہے بلکہ انہیں امور سے متعلق انعام کا بھی اعلان کیا جاتا ہے۔ اس اعلان و اظہار انعام کو تفویض کہا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت نوح کے ساتھ جو میثاق ہوا اسکی تفویض میں اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کا ذکر فرمایا:

پہلی سلامتی

دوسری : برکت

یعنی اب نسل نوح قیامت تک کلی طور پر ختم نہیں کی جائے گی اور یہ کہ انہیں چند افراد کی نسل میں اتنی برکت ہوگی کہ پوری روئے زمین ان سے بھر جائے گی۔ اور یہ برکت صرف تعداد میں نہیں بلکہ صلاحیت، اہلیت اور سعادت میں بھی ظاہر ہوگی۔

اسی طرح حضرت ابراہیم سے فرمایا گیا: اے ابراہیم! میں نے تم کو انسانوں کا امام بنا

دیا ہے۔

(۵) ابتلاء کلمہ: ابتلاء کلمہ یا ابتلاء آخر سے مراد ہے اس شخص یا گروہ کا یا اس کے متبعین، متوسلین اور قبعین کا جس سے اللہ تعالیٰ نے میثاق کیا ہے جہد تام کرنا تا کہ وہ میثاق پورا ہو جائے۔

چنانچہ قرآن نے ارشاد فرمایا ہے:

واذا بتلی ابراہیم ربه بكلمات (البقرہ ۱۲۴)

ترجمہ: اور جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے کئی کلموں میں

(۶) اتمام: اتمام سے مراد ہے میثاق کے تحت ابتلاء کلمہ ہونے اور اس میں جہد

تمام کے ذریعہ بالآخر اس کلمہ کو یعنی میثاق کو پورا کر دینا۔ میثاق کے پورا کرنے سے مراد ہے ابلیس کے قائم کردہ نصب العین کو منہدم کر دینا یا ابلیس کے بالمقابل حق کا نصب العین نہ صرف قائم کر دینا بلکہ اس کا اظہار و غلبہ کر دینا یا ابلیس کو شکست دیکر اسے اپنے نصب العین اور منہج کو ترک کرنے پر مجبور کر دینا۔

اتمام کے چار درجے ہیں۔

(۱) پہلا درجہ۔ یہ وہ اتمام ہے جس کے بعد ابلیس بالکل شکست کھا جاتا ہے اور تبدیلی منہج بھی نہیں کر سکتا اسے اتمام اعظم کہا جاتا ہے۔

(۲) دوسرا درجہ: یہ وہ اتمام ہے جس کے بعد ابلیس تبدیلی منہج کے معرکہ جاری رکھتا ہے اسے اتمام عظیم کہتے ہیں۔

(۳) تیسرا درجہ: یہ وہ اتمام ہے جو اس درجہ قوی نہیں ہوتا کہ ابلیس کو تبدیلی منہج کرنے پر مجبور کر دے ہاں اس اتمام سے حق کو تقویت ملتی ہے جسے تقویت بالحق کہتے ہیں۔

(۴) چوتھا درجہ: یہ اتمام کا وہ درجہ ہے جو تیسرے درجے سے بھی کم قوی ہوتا ہے اور اس میں صرف تجدید میثاق ہوتی ہے۔ اس کا فائدہ بس اس قدر ہوتا ہے کہ ذمہ دار قوم معزول ہونے سے بچ جاتی ہے۔

منہج فساد ملکوت حکمی یا فساد فی توحید اللہ یعنی فساد شرک سے مراد ہے وہ ایمانی و عملی فساد جس کی بنیاد اس پر قائم ہوتی ہے کہ:

”ملک کا مالک ملکوت کا بھی مالک ہے۔“

یہاں ملک سے مراد روئے ارض پر زمینی اقتدار اور حکومت کا مالک ہونا ہے۔ چنانچہ اس فساد کی بنیاد اس پر قائم کی گئی اور ابلیس نے یہی بات روئے ارض پر پھیلائی کہ جو ملک کا مالک ہوتا ہے وہ ملکوت السموات الارض کا بھی مالک ہو جاتا ہے یا اسے اس طرح بھی اصول کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ملک کا مالک ملکوت کا مالک ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ ابلیس کے ذریعہ اپنے منہج کی یہ تبدیلی نہایت معنی خیز تھی۔ ہم نے دیکھا کہ تین ربانی اقدامات کے ذریعہ کس طرح روئے زمین ہر فساد سے خالی کر دی گئی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ ابلیس کا پورا نظام اس کے شریک و سہم، اس کے آگے کار اور اس کی فوج و رہم

برہم ہی نہیں بلکہ بیشتر ختم کر دی گئی۔ اور اس طرح طبعی اور روحانی طور پر پوری روئے زمین کی صفائی اور دھلائی ہو گئی۔ اور اب روئے زمین پر صرف اہل کشتی دوبارا آباد کئے گئے اور ان میں اللہ نے برکت اتاری چنانچہ وہ زمین پر پھیل گئے۔ ابلیس ان حالات میں مجبور ہو گیا کہ اپنا اگلا منہج ان حالات و کوائف کو سامنے رکھ کر تشکیل دے جو مستقبل میں حقیقی صورتحال (Ground Realities) ہو سکتی تھی۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ آدم کی ہرجست نے اس کو قوی تر اور ابلیس کو کمزور تر بنایا ہے۔ یعنی ہرجست کے بعد آدم اپنی حیثیت کے اعتبار سے مضبوط و ارفع تر ہوتا گیا اور ابلیس اپنے دعوے اور اس کی وسعت کے اعتبار سے کمزور اور تنگ تر۔ لیکن اس جگہ اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ ابلیس کی تباہ کاریاں اور معرکہ خیز و شرکی ہولناکی اس کے مایوس تر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کی بے دریغ شکست اور اس کی فوجوں کی تباہی اسے زیادہ خوفناک بناتی جا رہی ہے۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ الجحیم میں سرزد ہونے والے گناہ اور ہبوط آدم سے قبل معرکہ خیز و شر میں ابلیس کا موقف مجرد طور پر منصب خلافت کا 'استحقاق' رہا۔ ہبوط آدم اور زمین پر بسائے جانے کے بعد اور بالخصوص حضرت ہانیل کی شہادت کے بعد اس کے موقف میں محاذ، دائرہ جنگ اور حقیقی زمینی صورتحال (Actual Ground Realities) کے اعتبار سے کمزوری واقع ہو گئی۔ ابلیس کے موقف میں واقع ہونے والی کمزوری دراصل حیثیت آدم کی بحالی کی رفتار و سطح کے تناسب (Proportional) میں تھی۔ حیثیت آدم جس قدر بحال ہوئی ابلیس کا موقف اور اس کی زمینی صورتحال اسی قدر کمزور تر ہوتی گئی۔ چنانچہ حضرت ہانیل کے بعد اپنی حقیقت کے اعتبار سے ہر چند کہ ابلیس کا دعویٰ بظاہر منصب خلافت ہی رہا لیکن اس کی حقیقی اور اصلی صورتحال محض 'خلافت ارضی' کے استحقاق کی باقی رہ گئی۔ بظاہر اس کا دعویٰ حسب سابق رہا لیکن وہ اس سے تقریباً مایوس ہوتا گیا کہ اب کبھی وہ کلی منصب خلافت کا اہل ہو سکے گا۔ حضرت ہانیل کی شہادت کے بعد کی ناکامی نے اسے منہج بدلنے پر مجبور کیا اور اس نے کوشش کی کہ ملکوت میں فساد برپا کر کے ارض پر ہر طرف عام خونریزی کا بازار گرم کر کے نسل آدم کو ہی ختم کر دیا جائے۔ اب حضرت نوح کی بعثت اور حجت پوری ہونے کے بعد کئے گئے ربانی اقدامات نے ابلیس کو پھر شکست فاش سے دوچار کر دیا تھا۔ لہذا اسکے دعوے اور معرکے کی سطح

مزید نیچے آئی۔ اب اس کے منہج کی بنیاد تھی ”جو ملک کا مالک ہے وہ ملکوت کا مالک ہے۔“
 طوفان ابلیسی قوتوں کی آخری ٹکڑی کا خاتمہ تھا۔ وہ اس سے قبل کئی سو سالوں سے
 اپنے احزاب کا خاتمہ دیکھتا آرہا تھا۔ عین ممکن ہے کہ ابلیس نے اپنے نئے منہج کی تیاریاں طوفان
 سے قبل ہی شروع کر دی ہوں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے طوفان کے ختم ہوتے ہی حضرت نوح علیہ السلام
 سے میثاق لیا اور انہیں اگلے معرکے کی ذمہ داریوں کی تفویض فرمائی۔ صحیح مسلم باب شفاعت میں
 حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو روایت ہے اس سے اسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ روایت میں کہا
 گیا: یا نوح انت اول الرسل الی الارض (اے نوح تم زمین پر پہلے رسول بنا کر بھیجے
 گئے ہو)

اسی میثاق کا ذکر سورۃ الاحزاب آیت ۷ میں بھی آیا ہے۔

چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی سے اترنے کے بعد جس عظیم الشان مہم کا آغاز
 فرمایا وہ ابلیس کے منہج فساد ملکوت حکمی یا فساد فی توحید اللہ یا فساد شرک کے خلاف کارروائی تھی۔ ہم
 اس سے قبل ملاحظہ کر چکے ہیں کہ اس کے بعد ابلیس نے روئے زمین پر اسی فساد ملکوت حکمی کی بنیاد
 پر بڑی بڑی تہذیبوں کو لا کھڑا کیا۔ ۱۲ قوم عاد، قوم ثمود، قوم شعیب اور قوم لوط و قوم ابراہیم ایسی
 ہی بڑی عظیم الشان نظام مای عالم (World Orders) تھیں جن کی بنیاد ہی اس پر قائم کی گئی
 تھی کہ چونکہ وہ روئے ارض پر ملک کے مالک ہیں اس لئے کائنات میں ملکوت کے بھی مالک
 ہیں۔

اس فساد شرک کے خلاف حضرت نوح نے ’اظہار‘ کی بنیاد ڈالی اور بڑے بڑے جلیل
 القدر انبیاء _____ حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام
 اور حضرت لوط علیہ السلام نے اس اظہار کو جاری رکھا۔ فساد شرک کے خلاف یہ وہی ’اتمام‘ اور
 ’اظہار‘ ہیں جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نقطہ ’کمال‘ تک پہنچا دیا۔

حصہ اول

دور اول: حضرت ابراہیم علیہ السلام

توراة کی صراحت کے مطابق حضرت ابراہیم کا نام ”ابرام“ (Abram) تھا جس کے معنی ہیں ”معظم باپ“۔ توراة ہی کی صراحت ہے کہ وہ بعد میں ”ابراہام“ (Abraham) کے لقب سے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا تھا پکارے جانے لگے جس کے معنی ہیں ”گروہ کثیر کے باپ“۔ قرآن نے اس کی صراحت تو نہیں کی ہے کہ ان کا نام کیا تھا ہاں اس کے طرز بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابراہیم ان کا لقب تھا جو مشہور ہو گیا تھا۔ عین ممکن ہے کہ یہ لقب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت فرمایا گیا ہو۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

قَالُوا سَمِعْنَا فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهُ اِبْرَاهِيمُ (الانبیاء: ۶۹)

ترجمہ: وہ بولے ہم نے سنا ہے ایک جوان بتوں کو کچھ کہتا ہے، اس کو کہتے ہیں ابراہیم۔ یہ عاجز مفسرین توراة کی ان دونوں رایوں سے جو جوہ اتفاق نہیں رکھتا یعنی یہ کہ ابراہیم کے معنی ”معظم باپ“ اور ابراہام کے معنی ”گروہ کثیر کے باپ“ ہیں۔ اس عاجز کے مطابق ابراہیم ’اب‘ = باپ اور ’رام‘ = معظم سے اور ابراہام ’اب‘ = باپ اور ’ہامون‘ = گروہ کثیر سے نہیں بنے بلکہ ابراہیم ’اب‘ = بمعنی مضبوط، بہادر، صاحب استقلال، ثابت قدم سے اور ابراہیم دراصل ’اپ‘ رو’ح پ رو’یا’خ پ رو’ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں: برادری باہر، غیر قانونی، قانون شکن، مہاجر، قومی مذہب سے پھرا ہوا، مجاہد، مجاہد فی سبیل اللہ۔ واضح رہے کہ یہی وہ ارامی لفظ ہے جس سے ’عبری‘ یعنی (Hebrew) بھی مشتق ہے۔

توراة کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش جنوبی عراق کے شہر ’ار‘ (Ur) میں ہوئی تھی۔ انکے والد کا نام ’ترح‘ (ترج)، دادا کا نام نحر (نحر) اور ایک جد کا نام بچ (پ لہج) تھا۔ حضرت ابراہیم کے دیگر دو بھائیوں کے نام نحر اور حرن تھے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ابلیس نے حضرت نوح علیہ السلام کی وفات اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت کے مابین یعنی 5200 قبل مسیح سے لیکر 1800 قبل مسیح تک روئے ارض پر سینکڑوں سرکش مملکتیں اور کم از کم تین مہیب و غیر معمولی قوت قاہرہ کے حامل نظام عالم (World Orders) برپا کئے۔ ان تین نظام عالم میں سب سے پہلا قوم عاد کا دوسرا قوم ثمود کا اور تیسرا قوم شعیب کا نظام عالم تھا۔

ابلیس نے ان تمام مملکتوں اور نظام عالم کے زمام کار رکھنے والوں، جن کی مسند اعلیٰ پر ان کے بادشاہ بیٹھے تھے، یہ باور کرایا تھا کہ وہ اس روئے زمین کے مالک ہیں۔ یہاں ان کی بادشاہت چلتی ہے اس لئے یہ ان کا ملک ہے۔ اور چونکہ وہ ملک کے مالک ہیں اس لئے وہ ملکوت کے بھی مالک ہیں یعنی خدا ہیں یا خدا کے بیٹے یا خدا کے گھرانے والے ہیں۔ وہ دیوتا ہیں اور ان کی پرستش کی جانی چاہئے۔ انہیں وہی عزت اور وقار ملنا چاہئے جو خدا کی عزت اور خدا کا وقار ہے ان سے وہی صفات منسوب کی جانی چاہئیں جو خدا کی صفات ہیں۔ پھر اسی اصول پر ابلیس کی ہدایت کے مطابق پورے کے پورے نظام مملکت، نظام معاشرت، نظام معیشت، نظام عبادت اور نظام اخلاق وضع اور نافذ کئے گئے۔

کتنے ہی انبیاء ان قوموں کی طرف اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمائے جنہوں نے ان قوموں کے مابین انہیں خطوط پر جن پر نئے میثاق کے تحت حضرت نوح 'اظہار' کر چکے تھے لوگوں کو حق کی طرف دعوت دی اور ابلیس سے معرکہ آرائی کی۔ ابلیس یقیناً اپنی اس حکمت عملی میں بے حد کامیاب تھا۔ اقتدار کا نشہ انسان کو پاگل بنا دیتا ہے۔ اس میں عقل رخصت یا کم از کم معطل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ابلیس کے متبعین پھر کامیاب ہونے لگے۔ ان سینکڑوں مملکتوں میں کم از کم تین نے فساد شرک کا وہ مازار گرم کیا کہ الامان والحفیظ۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنی انسانی حیثیت کو قطعاً بھلا دیا اور واقعی خدا بن بیٹھنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان تینوں نظام عالم کو تلیپٹ کر دیا۔

ان تینوں نظام عالم کے خاتمے کے بعد چوتھا نظام عالم (World Order) برپا ہوا وہ ان سب کا نقطہ کمال تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ نظام عالم گویا اب تک برپا تمام نظام عالم کا مجموعہ تھا۔ اس میں بابلی (Babylonian)، اسیریائی (Assyrian)، میتانی (Mittanian)،

ہتی (Hittite) اور مصری (Egyptian) تمام ہی مملکتوں کا انسجام تھا گویا یہ ایک واحد قومی نظام عالم (One Nation-Dominated World Order) نہ ہو کر کثیر الاقوامی عالمی نظام (Multinational Global Order) کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ جن میں نمرود بھی تھے اور فرعون بھی۔ گویا یہ اس دور کا آغاز ہے جب ابلیس سابق کے تین مہیب نظام عالم کی تباہی کے بعد ایک ایسے عالمی نظام کے وضع کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جو وسیع الاطراف اور ہمہ جہت اور شمولیت کے اعتبار سے پہلا عالمی نظام (Global Order) تھا۔ اس طرح یہ وہ کامیابی تھی جس کے بعد ابلیس نے محسوس کیا کہ اس کا منہج شرک اب کامیاب ہو جائے گا۔ روئے ارض پر کوئی فرد شاید ہی ایسا منہج گیا تھا جو اس بات کا قائل نہ ہو گیا ہو کہ یہ بادشاہ ہی خدا ہیں۔ ملکوت ان کے ہی ہاتھوں میں ہے اور انکی نسبت خداؤں سے ہے۔ یہ خدا کے کاموں میں شریک اور ان کے یہاں قابل عزت و احترام ہیں۔

ٹھیک اسی وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ انہوں نے ایک سو پچھتر سال کی عمر پائی۔ ان کی یہ زندگی معرکہ خیز و شر میں جہاد عظیم کی وہ داستان ہے جس کی نظیر روئے ارض پر پائی نہیں جاتی۔ قرآن کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں لڑکپن میں ہی رشد کی عظیم نعمتوں سے نوازا شروع کر دیا تھا اور ایسا لگتا ہے کہ وہ بالکل ابتداء شباب یعنی گویا پندرہ سولہ سالوں کی عمر میں ہی نبوت سے سرفراز فرما دیئے گئے تھے۔ ان کا قلب عرش معلیٰ کی طرح تھا اور ان کا جسم ایمان کا آتش فشاں۔ ایک سو پچھتر سالہ زندگی ان تھک جدوجہد کی ایک ایسی داستان ہے جہاں ترنزل، ٹہراؤ، غفلت، اور جلی یا خفی تعطل کا نام و نشان تک نہیں۔

اقامت ایمان

ابلیس کے منہج فساد ملکوت حکمی یا فساد شرک کو نہایت گہرائی سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت کے عہد تک آتے آتے ابلیس نے اس منہج پر ایک عظیم عالمی نظام برپا کر لیا تھا۔ جب ہم نظریہ کا نام لیتے ہیں تو عام طور پر یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ گویا وہ کوئی فلسفیانہ خیال ہوگا جسے چند دانش ور اور اہل علم علمی طور پر سمجھتے اور زیر بحث لاتے ہوں گے۔

حالانکہ اگر غور کیا جائے تو بالکل دوسری حقیقت سامنے آتی ہے۔ جب کوئی نظر یہ انسانوں کے مابین رسوخ حاصل کر لیتا ہے یہاں تک کہ اس پر ایک عالمی نظام برپا ہو جائے تو جان لیجئے کہ گویا وہ نظر یہ اس عہد کی انسانی زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کر گیا ہے۔ جب ایسی صورتحال ہوتی ہے تو زندگی کا کوئی شعبہ ایسا باقی نہیں رہ جاتا جس کی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اس نظریے پر استوار نہ ہو جائے۔ یا اس کے مطابق چلائی نہ جانے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی صورت میں زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اس نظریے پر قائم اور اسی روح کے ذریعہ چلائی جانے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ اس نظریے سے الگ کسی نظریے پر قائم کسی معاشرہ حتیٰ کہ فرد کا باقی رہنا محال ہو جاتا ہے۔ ایسا معاشرہ یا فرد اگر پایا بھی جائے تو وہ کلیہ حاشیے پر کھڑے ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

پلیس کے ذریعہ قائم یہ عالمی نظام جو فساد ملکوت حکمی یا فساد شرک پر قائم تھا اور جس کی روح یہ تھی کہ ”جو ملک کا مالک ہے وہ ملکوت کا مالک ہے“۔ اس وقت روئے ارض پر قائم انسانی معاشرے پر کلی طور پر محیط ہو چکا تھا۔ زندگی کا ایک ایک گوشہ اسی شرک پر قائم ہو چکا تھا۔ وہ لوگ جو اللہ کے ہونے اور اس کے احد و واحد ہونے کے قائل تھے یا تو کلیہ مفقود ہو چکے تھے یا معاشرہ میں بالکل حاشیہ (Marginalised) پر دھکیل دیئے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی معاشرہ اس شرک فی ملکوت یا شرک فی الذات والصفات پر قائم ہو چکا ہو تو وہ مجرد حالت میں پایا نہیں جاتا ہوگا کہ لوگ صرف یہ خیال ہی تصور رکھتے ہوں گے۔ بلکہ اس کے حقیقی اور تصوراتی مظاہر بھی مستحکم ہو چکے ہوں گے۔ یعنی علانیہ، تصورات، تصویریں، اصنام اور بت جو الگ الگ اعتبار سے ملکوت میں حصہ دار قرار دیئے جاتے ہوں گے۔ پھر ان علامتوں سے خصوصی نسبت رکھنے والے افراد ہوں گے جو دراصل عمائد نظام کی طرح پورے نظام کو تھامے ہوئے ہوں گے اور ان سب میں سب سے بڑا خود بادشاہ معظم ہوگا جو ملکوت کے مالک الملک کا بیٹا، اوتار یا نمائندہ قرار دیا گیا ہوگا۔ اور گویا ان نسبتوں پر قائم ہو کر خود کو ملکوت کا مالک کہلاتا ہوگا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان بنیادوں پر عقائد اور عقیدتیں راسخ ہو چکی ہوں گی۔ اور ان عقیدتوں پر معاشرے اور معاشرتی و اخلاقی آداب و اطوار، رسوم، عبادات اور قیود اور قوانین و ضوابط نے لوگوں کو پوری سختی سے جکڑ لیا ہوگا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس وقت اس طرح اس نظام پلیس کے گرد اگر دین مضبوط و مستحکم قلعہ بندیاں تھیں جن کا توڑنا کسی کے لئے ممکن نہ تھا۔ یہ قلعہ بندیاں دراصل شرک کے اقتدار اعلیٰ کی قلعہ بندیاں

تھیں جنہیں ذیل میں اس طرح درج کیا جاسکتا ہے:

- (۱) اقتدار اول : انتظام نظام کی قلعہ بندی
- (۲) اقتدار دوم : انتظام معاشرت، رسوم و قیود کی قلعہ بندی
- (۳) اقتدار سوم : انتظام عقیدہ، عقیدت، عبادات کی قلعہ بندی
- (۴) اقتدار چہارم : منصب بادشاہ کی قلعہ بندی

اقتدار کی ان چار دفاعی قلعہ بندیوں میں محفوظ و مستحکم فساد شرک کا عالمی نظام کس قدر ناقابل تسخیر ہوگا اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بادشاہ کو قتل کیا جاسکتا ہے، عقیدہ و عقیدت سے بغاوت کی جاسکتی ہے، معاشرہ اور معاشرتی رسوم و قیود کے خلاف اعلان جنگ کیا جاسکتا ہے۔ دنیا کے انتظامی امور سے صرف نظر کیا جاسکتا ہے لیکن جب کوئی نظام ایسا مستحکم ہو جس کی یہ چار قلعہ بندیاں ہوں اس کو ہلایا تک نہیں جاسکتا اس لئے کہ ایک ستون یا قلعہ بندی کے گرتے ہی بقیہ ستون اور قلعہ بندیاں اس کا ازالہ کر دیتی ہیں یا اسے تھام لیتی ہیں اور دیکھتے دیکھتے وہ پہلی صورت بحال ہو جاتی ہے۔ میرے علم کی حد تک تاریخ انسانی میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کارنامے کے علاوہ کوئی دوسری مثال نہیں ملتی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس کارنامے کی نظیر ہو۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کوشش خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے میثاق کی اگلی کڑی ہے اس لئے گویا وہ ایک ہی کوشش ہے۔

ایک ایسے ناقابل تسخیر نظام کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا اور اسے زمین بوس کر دینا تو دور کی بات ہے محض اس کا انکار کر دینا بھی ایک ایسے ایمان کا تقاضا کرتا ہے جو پہاڑ کی طرح مستحکم ہو۔ حضرت ابراہیم اس فساد عظیم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہاں اسی ایمانی سفر کو اقامت ایمان سے موسوم کیا گیا ہے جس کے دو شعبے ہیں پہلا شعبہ ”اظہار ایمان“ اور دوسرا شعبہ ”تقویت ایمان“۔ اظہار ایمان کا تعلق حضرت ابراہیم کے اپنے ایمان اور اس کے تقاضے کی تکمیل سے ہے جبکہ تقویت ایمان کا تعلق اللہ تعالیٰ کی اس مدد سے ہے جو اس نے ان نازک موقعوں پر حضرت ابراہیم کی تقویت کے لئے عطا فرمائی،

- (۱) پہلا اظہار ایمان: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلا اظہار ایمان، انکار غیر اللہ اور اعلان انکار غیر اللہ سے کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس اظہار کے صلے میں ان کی تقویت ایمان کا

سامان فرمایا: قرآن کا ارشاد ہے:

ولقد آتينا ابراهيم رشده من قبل و كنا به علمين (الانبياء ۵۱)

ترجمہ: اور آگے دی ہم نے ابراہیم کو اس کی نیک راہ اور ہم رکھتے ہیں اس کی خبر۔

(۲) دوسرا اظہار ایمان: حضرت ابراہیم نے دوسرا اظہار ایمان، انہدام مظاہر غیر اللہ اور

دعوت انکار غیر اللہ سے کیا۔ یوں تو پہلا اظہار ایمان ہی پورے نظام کو چیلنج دینے کے مترادف تھا

دوسرا اظہار ایمان اس پورے نظام کے خلاف گویا عملی طور پر آغاز جنگ کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

چنانچہ یہ مرحلہ بے حد جانکاہ تھا جو غیر معمولی ایمانی قوت کا تقاضا کرتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم

نے اللہ تعالیٰ سے اس ایمان کی دعا فرمائی آپ نے فرمایا:

رب ارنی کیف تحى الموتى (البقرہ ۲۶۰)

ترجمہ: اے رب مجھے دکھلا کیسے تو مردہ کو زندگی دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پوچھا:

اولم تؤمن (البقرہ ۲۶۰)

ترجمہ: کیا تجھ کو یقین نہیں آتا۔

حضرت ابراہیم نے جواب دیا:

بلى ولكن ليطمئن قلبي (البقرہ ۲۶۰)

ترجمہ: کیوں نہیں لیکن اس واسطے چاہتا ہوں کہ تسکین ہو جائے میرے دل کو۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو حیات و موت کے تعلق سے اپنے ملکوت کا مشاہدہ کرایا:

قال فخذ اربعة من الطير فصرهن اليك ثم اجعل على كل جبل منهن جزاء

ادعهن يا تينك سعيا واعلم ان الله عزيز حكيم (البقرہ ۲۶۰)

ترجمہ: فرمایا: تو چار لے چار جانور اڑنے والے پھر ان کو بلا لے اپنے ساتھ پھر رکھ دے ہر پہاڑ

پر ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا پھر ان کو بلا چلے آویں گے تیرے پاس دوڑتے۔ اور جان لے کہ

بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا۔

(۳) تیسرا اظہار ایمان: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تیسرا اظہار ایمان اعلان کلی براۃ

عن غیر اللہ یعنی شرک کے ہر مدعی کے خلاف کلی اعلان جنگ سے کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی

حیات طیبہ کا یہ سب سے سنگین مرحلہ تھا جہاں آپ یک دہا پوری کائنات غیر اللہ کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ یہ اظہار ایمان دنیا کے سارے بادشاہوں، ساری حکومتوں، ان کی ساری قوت بلکہ سارے نظام کے خلاف حضرت ابراہیم کا تنہا اٹھ کھڑا ہونا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس سنگین ترین مرحلے میں آپ کی تقویت کا سامان کیا اور آپ کو پورے ملکوت السموات والارض کا مشاہدہ کروایا۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَكَذَلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونُ مِنَ الْمَوْقِنِينَ. فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَى كَوْكَبًا قَالَ هَذَا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْإِفْلَاقَ. فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هَذَا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَيْسَ إِلَهِي بِيَدْنِي رَبِّي لَا يَكُونُ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ. فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هَذَا رَبِّي هَذَا الْكَبِيرُ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ يَقُومُ آنِي بِرِي مِمَّا تَشْرِكُونَ (الانعام ۷۸-۷۵)

ترجمہ:

اور اس طرح ہم نے دکھایا ابراہیم کو ملکوت السموات والارض۔ اور یہ اس لئے دکھایا کہ وہ صاحب (علم) یقین ہو جائے۔ پھر جب اندھیرا کر لیا اس پر رات نے اس نے ایک ستارہ دیکھا۔ اس نے (اپنے آپ سے) کہا: کون ہے ہمارا رب؟ پس (ابھی اس نے یہ سوال پوچھا ہی تھا کہ) وہ غائب ہو گیا۔ ابراہیم نے کہا میں غائب ہو جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پھر اس نے چاند کو روشن ہوتے دیکھا۔ اس نے (اپنے آپ سے) کہا: کون ہے ہمارا رب؟ پس وہ غائب ہو گیا تو کبر ابراہیم نے کہا اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ دے رہا ہوتا تو میں بے شک بھٹک جانے والوں میں سے ہو جاتا۔ پھر اس نے سورج کو چمکتے ہوئے دیکھا۔ اس نے (اپنے آپ سے) کہا: کون ہے ہمارا رب؟ کون بڑا ہے؟ پھر وہ غائب ہو گیا۔ تو ابراہیم نے پکار کر کہا اے میری قوم! (تم کچھ کر لو) یہ ناممکن ہے کہ میں اللہ کی ذات میں انہیں شریک کروں جن کو تم شریک ٹہراتے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اس اقامت ایمان باللہ کو قرآن میں ”توجیہ للہ“ کے نام سے پکارا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

إِنِّي وَجْهَتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ

(الانعام ۲۹)

ترجمہ: میں پورا کا پورا یکسو ہو گیا ہوں اس کے لئے جس نے سموات اور ارض کو پیدا کیا ہے اور میں شریک کرنے والوں میں نہیں ہو سکتا۔

اقامت اعلاء کلمۃ حق

اقامت اعلاء کلمۃ حق سے مراد عام طور پر تبلیغ و دعوت لی جاتی ہے۔ جو پوری طرح درست نہیں بلکہ کسی قدر گمراہ کن ہے۔ تبلیغ و دعوت اس اقامت کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہوا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رسول بنیادی طور پر ہدئی کے ساتھ اظہار کے لئے مبعوث ہوتے ہیں اور وہ اس ہدئی کی روشنی میں اظہار کی سنت قائم فرماتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اعلاء کلمۃ حق کی اقامت فرمائی۔

اقامت ایمان کے ذیل میں یہ بات گزر چکی ہے کہ فساد ملکوت حکمی یعنی فساد شرک ایک عالمی نظام (World Order) کی صورت میں اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ قائم تھا جس کی چار مضبوط و مستحکم قلعہ بندیاں تھیں۔ اس نظام کا انہدام ان قلعہ بندیوں کے ٹوٹ جانے کے بعد ہی ممکن تھا۔ ایک ہمہ گیر اعلاء کلمۃ حق کے بغیر ان قلعہ بندیوں کا خاتمہ ناممکن تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس اعلاء کلمۃ حق کے لئے ایک ہمہ گیر نقشہ تیار کیا جس کے تین مدرج تھے اور ہر مدرج میں کم از کم دو بڑے شعبے نمایاں تھے۔ واضح رہے کہ حضرت ابراہیم کے سامنے اعلاء کلمۃ حق کے چار مخاطب ہو سکتے تھے۔ (۱) اہل خاندان (۲) عوام (۳) ملاء و عمائد نظام اور چھوٹے بادشاہ (۴) اس عالمی نظام کا سب سے بڑا بادشاہ۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان میں سے ہر ایک طبقے کے سامنے اعلاء کلمۃ حق کی حجۃ پوری فرمائی۔

(۱) اقامت اعلاء کلمۃ حق اول: اعلاء کلمۃ حق کا یہ پہلا مدرج ہے۔ حضرت ابراہیم نے اس مدرج میں دو عظیم الشان کام انجام دیئے جو اس مدرج کے دو شعبے شمار ہوئے جو درج ذیل ہیں:

(الف) اعلان نبوت: آپ نے لوگوں کو بتایا کہ اللہ رب العزت نے آپ کو نبی اور رسول بنا کر بھیجا ہے اور یہ بنی نوع انسان اس میثاق کے ماننے اور اسے پورا کرنے کا پابند ہے جو اللہ اور

حضرت نوح کے مابین ہوا تھا۔ آپ نے اپنے والد کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

یا ایت انی قد جاءنی من العلم مالم یا تک فاتبعنی اهدک صراطا

سویا (مریم ۲۳)

ترجمہ: اے باپ میرے مجھ کو آئی ہے خبر ایک چیز کی جو تجھ کو نہیں آئی سو میری راہ چل دکھلا دوں تجھ کو راہ سیدھی۔

آپ نے سمجھوں کو حضرت نوح سے کئے میثاق کو یاد دلایا اور اسے پورا کرنے اور ابلیس کے اتباع سے باز رہنے کی تلقین کی۔ آپ نے اس عذاب سے بھی ڈرایا جس کا خوف حضرت نوح کو دلایا گیا تھا (سورہ ہود ۴۸)۔ آپ نے فرمایا:

یا بت لاتعبد الشیطن ان الشیطن کان للرحمن عصیا۔ یا بت انی اخاف ان یمسک عذاب من الرحمن فتکون للشیطن ولیا (مریم ۴۳-۴۴)

ترجمہ: اے باپ میرے مت پوج شیطان کو بے شک شیطان ہے رحمن کا نافرمان۔ اے باپ میرے میں ڈرتا ہوں کہیں آگے تجھ کو ایک آفت رحمن سے پھر تو ہو جائے شیطان کا ساتھی۔

(ب) دعوت توحید: آپ نے لوگوں کو حجت اور دلیل کے ساتھ سمجھایا کہ اللہ رب العزت صرف ایک ہے وہی خالق ارض و سماء ہے۔ ساری کائنات پر اس کا حکم چلتا ہے۔ اس کے سوا کوئی نفع پہنچانے والا ہے نہ نقصان لگنے والے کہ ملکوت السموات والارض کا صرف وہی مالک ہے۔ اور اس کے سوا کوئی مالک نہیں۔ آپ نے فرمایا:

قال بل ربکم رب السموات والارض الذی فطرہن وانا علی ذلکم من الشہدین (الانبیاء ۵۶)

ترجمہ: بولا نہیں رب تمہارا وہی ہے رب آسمانوں اور زمین کا جس نے ان کو بنایا اور میں اسی بات کی گواہی دیتا ہوں۔

آپ نے لوگوں کو ان کے اعتقادات کے کھوکھلے پن کی طرف متوجہ کیا اور انہیں جھنجھوڑتے ہوئے ان سے کہا کہ خدا کے سوا اور کو اس کے ملکوت میں ذیل اور شریک ماننا کتنا کھوکھلا عمل ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ انہیں صنم اور بت بنا کر پوجنا اور انہیں نفع اور نقصان کا مالک سمجھنا تو اور بھی بڑے عقلی دیوالیہ پن کی دلیل ہے۔ آپ نے فرمایا:

قال هل يسمعونكم اذ تدعون. او ينفعونكم او يضرون (الشعراء ۳-۷۲)

ترجمہ: کہا کچھ سنتے ہیں تمہارا کہا جب تم پکارتے ہو یا کچھ بھلا کرتے ہیں تمہارا یا برا اس سے آگے جا کر آپ نے لوگوں کو اپنی مثال دی اور صاف صاف کہا کہ میں صرف اللہ واحد کو مانتا ہوں اور وہی اس کا مستحق ہے۔ اس کے علاوہ نہ کوئی ملکوت کا مالک ہے نہ اس کی کائنات میں زرہ برابر بھی اختیار رکھتا ہے نہ کسی کے نفع اور نقصان پر قدرت رکھتا ہے۔ میں اللہ کے سوا ہر کسی کو رد کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا:

فانهم عدولى الارب العلمين. الذى خلقنى فهو يهدين والذى هو يطعمنى ويسقئ واذا مرضت فهو يشفين والذى يميتنى ثم يحيين والذى اطمع ان يغفرلى خطيئتي يوم الدين (الشعراء ۸۲-۷۷)

ترجمہ: سو وہ میرے دشمن ہیں مگر سارے جہانوں کا رب۔ جس نے مجھ کو بنایا سو وہی مجھ کو راہ دکھلاتا ہے اور جو مجھ کو کھلاتا ہے اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوں تو وہی شفا دیتا ہے اور جو مجھ کو مارے گا پھر زندہ کرے گا اور وہ جو مجھ کو توقع ہے کہ بخشے میری تقصیر حساب کے دن۔

(۲) اقامت اعلاء کلمۃ حق دوم: اعلاء کلمۃ حق کا یہ دوسرا مدرج تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مدرج میں پہلے مدرج سے بھی زیادہ عزیمت کا ثبوت دیتے ہوئے دو غیر معمولی کام انجام دیئے۔ اس کام کی باریکی اور نزاکت اعلاء کلمۃ حق کی راہ کی نازک ترین منزل ہے۔ فساد شرک پر مبنی نظام لوگوں کے جسم و جان میں اس طرح پیوست تھا کہ صرف ایسا نہیں کہ لوگ شرک کے ماحول میں رہتے تھے اور صرف مشرکانہ رسوم، عبادات، قوانین اور معاشرت سے گھرے ہوئے تھے بلکہ یہ مشرکانہ امور ان کی زندگیوں میں ہی نہیں بلکہ دل و دماغ میں عقیدہ اور عقیدت کے اعتبار سے راسخ تھے۔ کلیتاً بے حقیقت چیز بھی عقیدہ اور عقیدت کی زمین پر پہاڑ کی طرح مستحکم ہو جاتی ہے۔ لوگ ان مشرکانہ باتوں اور عقائد کے بارے میں دل سے ایسا سمجھتے ہیں کہ وہ حقیقت ہیں۔ ایسے میں اصل ضرورت کس بات کی ہوتی ہے؟ کیا کسی کے مشرکانہ عقاید پر اس لئے ضرب لگائی جائے کہ اس سے اس کے جذبات بجروح ہوں یا اس لئے کہ اس پر منکشف ہو جائے کہ اس کے عقاید بے حقیقت ہیں۔ پہلی ضرب اعلاء کلمۃ حق کو روکنے والی اور نقصان پہنچانے والی ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسلام نے دوسروں کے معبودوں کو برا کہنے سے روکا ہے

تاکہ جذبات کے مجروح ہونے کے بعد کوئی اللہ کو محض اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے برانہ کہہ دے۔ حضرت ابراہیم نے وہ راہ اختیار کی جو اصل مقصود تک پہنچانے والی، اظہار کو یقینی بنانے والی اور ماسوا اللہ کے ملکوت میں قدرت رکھنے کے عقیدے کے کھوکھلے پن کو ظاہر کرنے والی تھی۔ حضرت ابراہیم نے اس تعلق سے دو عظیم کام کئے جو قوی نہیں بلکہ عملی تھے۔

(الف) معبود غیر اللہ کے بے حقیقت ہونے کو ثابت کرنا:

معبود بنائے جانے اور عبادت کئے جانے سے قبل کوئی تصور یا وجود لوگوں کی عقیدت کا حصہ بن جاتا ہے لوگوں کے قلوب اور ان کے دل و دماغ اس وجود کی عقیدت سے بھر چکے ہوتے ہیں۔ لوگ خواہ غلط اور بے حقیقت اشیاء اور وجود کی ہی کیوں نہ پرستش کر رہے ہوں لیکن وہ منافقانہ طور پر ایسا نہیں کرتے بلکہ دل کی گہرائیوں سے ایسا کرتے ہیں۔ صحیح یا غلط اس سے بحث نہیں لیکن وہ چیزیں لوگوں کے دل و دماغ میں جاگزیں ہوتی ہیں تب جا کر کہیں کسی کی پرستش ہوتی ہے۔ لہذا حضرت ابراہیم نے دعوت توحید کے عام ہونے کے بعد ایک ایسا عملی مظاہرہ کیا جو کسی انتقام کے جذبے سے کیا گیا تھا نہ کسی کی بے حرمتی کے ارادے سے بلکہ آپ نے بہت سوچ سمجھ کر اور پورے اہتمام کے ساتھ یہ عمل کیا۔ اس کا یہ عمل بجائے خود مقصود نہیں تھا بلکہ دعوت عام کے بعد اس طرح کا عمل اس ذہنی اور قلبی کیفیت کے پیدا کرنے کے لئے تھا جس میں انہیں حجت کی وہ آخری بات کہنی تھی جو اس وقت تک نہیں کہی جاسکتی تھی جب تک کہ لوگوں کے دل و دماغ اس حجت کو دیکھنے، اس پر غور کرنے اور نتیجہ اخذ کرنے کی کیفیت میں نہ آچکے ہوں۔

ایسا لگتا ہے کہ اس کے لئے خصوصی اہتمام کئی پہلو سے تھا۔ آپ نے پہلا اہتمام یہ کیا کہ اس کام کے لئے پورے نظام کے سب سے مرکزی مقام کو منتخب فرمایا جہاں اس نظام فساد ملکوت کی عقیدت کی اعلیٰ ترین صورت پائی جاتی تھی۔ آپ نے دوسرا اہتمام یہ فرمایا کہ اس کام کے لئے ایک ایسے وقت کا انتخاب کیا جس میں پوری قوم اور اس کے کہہ و مہ سب ہی وہاں موجود ہوں۔ آپ نے تیسرا اہتمام یہ فرمایا کہ یہ سارا کام آپ نے جس حجت کے پورا کرنے کے لئے کیا تھا اس کے لئے آپ کا وہاں بنفس نفیس موجود ہونا ضروری تھا لہذا آپ نے لوگوں کے اس سیلاب بے پناہ میں جو آپ کے خلاف اس عمل کے نتیجے میں امنڈ آیا تھا اپنے آپ کو پہاڑ کی طرح

مستحکم اور موجود رکھا۔ چنانچہ قرآن اس عظیم الشان حجت ابراہیمی کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے:

(۱) **وَقَالَ لِلَّهِ لَا كَيْدُنَ اصْنَامُكُمْ بَعْدَ اَنْ تَوَلَّوْا مَدْبِرِينَ (الانبياء ۵۷)**

ترجمہ: اور قسم اللہ کی میں علاج کردوں گا تمہارے بتوں کا جب تم جا چکو گے پیٹھ پھیر کر۔

(۲) **فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُومِ فَقَالَ اِنِّى سَقِيمٌ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مَدْبِرِينَ (الصافات ۸۸-۹۰)**

ترجمہ: پھر نگاہ کی ایک بارتاروں کی طرف پھر کہا میں جلدی بیدار ہو گیا۔ پس جب وہ لوگ پیٹھ پھیر کر جا چکے۔

(۳) **فَرَاغَ اِلَى آلِهَتِكُمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ مَالَكُمْ لَا تَنْطَقُوْنَ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِينِ (الصافات ۹۱-۹۳)**

ترجمہ: تو پھر وہ ان کے بتوں کے پاس جا گھسا۔ بولا تم لوگ کیوں نہیں کھاتے۔ تم آخر بولتے کیوں نہیں۔ پھر گھسا ان پر مارتے ہوئے داہنے ہاتھ سے۔

(۴) **فَجَعَلَهُمْ جَذًا اِلَّا كَبِيرًا لَهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ. قَالُوا مِنْ فَعَلَ هَذَا بِالْهَتَّا اِنَّهُمْ الظَّالِمِينَ. قَالُوا سَمِعْنَا فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهُ اِبْرَاهِيْمُ. قَالُوا فَاتُوا بِهِ عَلَى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ (الانبياء ۶۱-۵۸)**

ترجمہ: پھر کر ڈالا ان کو ٹکڑے ٹکڑے مگر ایک بڑا ان کا کہ شاید اسکی طرف رجوع کریں۔ کہنے لگے کس نے کیا یہ کام ہمارے معبودوں کے ساتھ۔ وہ تو کوئی ظالم ہے۔ وہ بولے ہم نے سنا ہے ایک جوان بتوں کو کچھ کہا کرتا ہے اس کو کہتے ہیں ابراہیم وہ بولے اس کو لے آؤ۔ لوگوں کے سامنے۔ شاید وہ دیکھیں۔

(۵) **فَاَقْبَلُوْا اِلَيْهِ يَزِفُوْنَ (الصافات ۹۴)**

ترجمہ: پھر لوگ آئے اس پر دوڑ کر گھبراتے ہوئے۔

(۶) **قَالُوا اَنْتَ فَعَلْتَ هَذَا بِالْهَتَّا يَا اِبْرَاهِيْمُ قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَذَا**

فَسَنَلُوهُمْ اِنْ كَانُوا يَنْطَقُوْنَ. فَرَجَعُوا اِلَى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوا اَنْتُمْ الظَّالِمُوْنَ. ثُمَّ

نَكَسُوْا اَعْلٰى رُءُوسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا هٰؤُلَاءِ يَنْطَقُوْنَ (الانبياء ۶۵-۶۴)

ترجمہ: بولے کیا تو نے کیا ہے۔ یہ ہمارے معبودوں کے ساتھ اے ابراہیم۔ بولا نہیں پر یہ کیا ہے

ان کے اس بڑے نے سوان سے پوچھ لو۔ اگر وہ بولتے ہیں۔ پھر سوچے اپنے جی میں پھر بولے
لوگو تم ہی ظالم ہو۔ پھر اوندھے ہو گئے سر جھکا کر تو تو جانتا ہے جیسا یہ بولتے ہیں۔

(۷) قال اتعبدون ما ننحتون واللہ خلقکم وما تعملون (الصافات ۹۶-۹۵)
ترجمہ: بولا کیوں پوجتے ہو جب آپ تراشتے ہو۔ اور اللہ نے بنایا تم کو اور جو تم بناتے ہو۔

(۸) قال اتعبدون من دون اللہ مالا ینفعکم شئاً ولا یضرکم اف لکمما
ولما تعبدون من دون اللہ افلا تعقلون (الانبیاء ۶۷-۶۶)

ترجمہ: بولا کیا پھر تم پوجتے ہو اللہ کے سوا ایسے کو جو تمہارا کچھ بھلا کرے نہ برا۔ بیزار ہوں میں تم
سے اور جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا۔ کیا تم کو سمجھ نہیں۔

ان آیات کو دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ عزیمت عظمیٰ کا یہ کام حضرت ابراہیم
نے آخر کیوں کیا؟ وہ کیا چاہتے تھے جسے انہوں نے بخوبی سرا انجام دیا؟ یہ کام نہ جذباتی عمل تھا نہ
خفیہ کارروائی۔ حتیٰ کہ نظام وقت کے سب سے بڑے معبد میں جن کو اس دن توڑنا اور سب سے
بڑے بت کو چھوڑ دینا جس دن ساری قوم جس میں عام زائرین سے لیکر مذہبی، سیاسی، معاشرتی
عمائد حتیٰ کہ بادشاہ وقت سب ہی موجود ہوں یہ سب اس لئے کیا گیا تھا تا کہ وہ بات کہی جاسکے
جس کے لئے یہ سب کچھ کیا گیا تھا۔ اس کے لئے بنفس نفیس آپ کا وہاں موجود ہونا اور بلائے
جانے پر نظام کے سارے منتخب لوگوں کے سامنے جرات مندانہ طور پر اپنے آپ کو پیش کرنا اور ان
سب کے سامنے پوری جرات اور دیانت کیساتھ حق بات کہنا اور اس کی حجت کو پوری کرنا حضرت
ابراہیم جیسے اولوالعزم رسول سے ہی ممکن تھا۔

دراصل آپ تمام لوگوں کے سامنے دو باتیں عملاً ثابت کرنا چاہتے تھے۔ پہلی بات تو
وہی ہے جس کا عنوان قائم کیا گیا ہے یعنی آپ پوری قوم اس کے تمام اہل علم، اہل مذہب اور
عمائد نظام حتیٰ کہ بادشاہ کے سامنے عملاً ثابت کرنا چاہتے تھے کہ یہ معبودان غیر اللہ جس سے لوگوں
نے فی الواقع عقیدت کی نسبت بنا رکھی ہے، جس کے بارے میں وہ صدق دل سے سمجھتے ہیں کہ یہ
ملکوت میں تصرف رکھتے ہیں اور واقعی لوگوں کی عقیدت اور پرستش کے مستحق ہیں اس لئے کہ ان
کے قبضہ قدرت میں ملکوت ہے، وہ لوگوں کو نفع اور نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ سو لوگ اپنی آنکھوں
سے دیکھ لیں کہ یہ سب بے حقیقت ہے۔ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ ملکوت میں تصرف رکھنا تو دور

کی بات ہے ان متصور معبودان غیر اللہ کی، جن کی عقیدت میں لوگ ان کے اصاب اور بت بنا کر انہیں پوجتے ہیں، انہیں ملکوت السموات والارض میں کوئی تصرف اور قدرت حاصل نہیں۔ بلکہ وہ تو اتنے بے حقیقت اور بے قوت ہیں کہ وہ خود اپنے بتوں اور مجسموں کو بھی بچانے کی حالت میں نہیں نہ اس کو کچھ نقصان پہنچانے کی حالت میں ہیں جس نے ان کے مجسموں اور بتوں کی یہ درگت بنائی ہے۔ آپ نے اس سے آگے جا کر پورے نظام پر یہ بات بھی باور کرانے کی عملی کوشش کی کہ ان معبودان باطل کی بات الگ رہی یہ بت جنہیں ان سے نسبت ہے یا جو ان کی علامتیں ہیں اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے محض لکڑی یا پتھر کے بت ہیں۔ جنہیں خود لوگ جانتے ہیں کہ ان کی کیا حقیقت ہے۔ جب ان معبودان غیر اللہ کی ہی کوئی حقیقت اور وجود نہیں تو ان بتوں کی کیا حیثیت جن کی تصوراتی شکلوں پر انہیں بنایا گیا ہے۔

(ب) معبودان غیر اللہ کے خوف سے لوگوں کو باہر نکالنا

عقیدت کا یہ پہلو پہلے حصے سے کم مستحکم نہیں ہوتا۔ ہر چند کہ لوگ آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے بتوں اور تصویروں کو پوجتے ہیں لیکن جو چیز انہیں عقیدت پر مجبور کرتی ہے وہ کاغذ کی تصویریں یا مٹی یا پتھر کے بت نہیں بلکہ یہ احساس کہ یہ فی الواقع معبود ہیں اور اس سے زیادہ اہم بات یہ کہ وہ دل سے ایسا سمجھتے ہیں کہ ان معبودان غیر اللہ کی رضا انہیں نفع اور ان کی ناراضگی نقصان پہنچا سکتی ہے چنانچہ یہ عقیدت دراصل ایک خوف کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ بہت سے لوگ انہیں پتھر کے بنائے ہوئے بت بھی سمجھتے ہیں لیکن پھر بھی ان کے تعلق سے ایک غیر معلوم اور انجانے خوف سے ڈرتے بھی ہیں۔

حضرت ابراہیم نے سکھوں کے سامنے لوگوں کو عملی طور پر دکھایا کہ کس طرح انہوں نے ان معبودان غیر اللہ کو مسہار کیا اور ان کا کچھ بھی نقصان نہیں ہوا۔ وہ ان کے سامنے کھڑے ہو کر سمجھا رہے تھے کہ ان بتوں اور ان سے منسوب اصلی معبودان غیر اللہ کو کوئی طاقت و قدرت حاصل نہیں بلکہ وہ بے حقیقت ہیں۔ وہ جب اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے نہ اپنے توڑنے والوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں نہ توڑنے والے کو نقصان پہنچا سکتے ہیں پھر انہیں ملکوت میں مقدر سمجھنا کیسی نادانی

اور بے وقوفی کا کام۔ حضرت ابراہیم کا یہ عمل قولی اور ادعائی نہیں تھا بلکہ عملی تھا۔ ہزاروں لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ واقعی یہ معبودان غیر اللہ کس طرح ٹوٹے اور بکھرے پڑے تھے اور یہ کہ ان کی کیا حقیقت ہے؟

(۳) اقامت اعلاء کلمہ حق سوم: یہ اقامت اعلاء کلمہ حق کا تیسرا مدرج ہے۔ غور کرنے والوں کے لئے اس کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں کہ دوسرا مدرج ہی اس پورے عالمی نظام کو چیلنج دینے کے مترادف تھا چاہے کہ یہ تیسرا مدرج۔ اس تیسرے مدرج کا مطلب ہے فساد ملکوت حکمی یا فساد شرک کی آخری اور اعلیٰ ترین قوتوں کے سامنے کلمہ حق کا عملی اظہار۔ دوسرے مدرج کا اختتام وہیں ہوتا ہے جہاں سے تیسرے مدرج کا آغاز ہوا۔ یہ بات بڑی واضح ہے کہ دوسرے مدرج میں اقامت اعلاء کلمہ حق سے ہی حضرت ابراہیم اذراں کے ساتھیوں کا جو چند بلکہ مٹھی بھر افراد ہو گئے اور نظام وقت کا جو ایک عالمی نظام تھا بالکل سیدھا اور براہ راست تصادم ہو گیا ہوگا۔ ان دونوں طبقوں کا یہ تصادم اتفاقی نہیں تھا نہ ہی حق کے مقابلے میں باطل کی شبہ زوریوں اور دیدہ دلیریوں سے ہونے والا تصادم تھا بلکہ یہ تصادم پورے شعور کے ساتھ ہوا اور باطل کی نہیں بلکہ حق کی مرضی اور کوشش سے ہوا۔ درست بات یہ ہے کہ حق نے باطل کو اس مقام پر پوری قوت سے کھینچ کر لادیا جہاں حق اور باطل کے مابین سیدھے سیدھے تصادم کے علاوہ کوئی اور راہ نہیں بچ گئی تھی۔ حضرت ابراہیم نے باطل کو اپنے دلائل اور اولوالعزمی سے مجبور کر دیا کہ وہ مندرجہ ذیل دو باتوں میں سے کوئی ایک بات قبول کر لے:

(۱) یا تو حضرت ابراہیم کی بات مان کر پورا نظام فساد ملکوت حکمی سے تائب ہو جائے اور اللہ کو ملکوت السموات والارض کا اکیلا مالک مان لے۔
(۲) یا اپنے تمام معبودان غیر اللہ کی مدد سے انہیں اس اظہار حق سے روک لے۔

ظاہر ہے اپنی طاقت، قوت اور جبروت کے ایسے نشے میں جسے لانے میں فساد ملکوت حکمی کی اعتقادی شراب کو دخل ہو پہلی بات کب قبول ہوگی۔ چنانچہ نظام وقت کا جبروت بے قابو ہو گیا اور اس نے وہی فیصلہ کیا جو اس طرح کی طاقت کرنے کی عادی ہوتی ہے۔ یہی وہ بات ہے جسے ابھی کہا گیا کہ یہ تصادم اتفاقی طور پر نہیں ہوا نہ باطل کی شبہ زوریوں سے ہوا بلکہ حق نے پورے شعور کے ساتھ باطل کو مجبور کیا کہ وہ فیصلہ کے اس مقام پر آجائے اور چونکہ یہ بات بالکل یقینی تھی اور

حضرت ابراہیم خوب جانتے تھے کہ یہ نظام پہلا راستہ قطعاً اختیار نہیں کر سکتا اس لئے اہل حق اور نظام وقت کا ٹکراؤ بالکل سیدھا اور براہ راست تصادم کی شکل اختیار کرے گا۔

ادھر حضرت ابراہیم کی حالت یہ تھی کہ وہ بھاگے ہوئے تھے نہ کسی خفیہ مقام سے ایسی کارروائی کر رہے تھے بلکہ وہ خود لاکھوں لوگوں کے جم غفیر میں نظام کے منتخب لوگوں کے درمیان کھڑے تھے۔ اس صورتحال میں پہلی بات کے قبول کرنے کا یوں بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے اقامت اعلاء کلمہ حق کا تیسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔

ظاہر ہے لوگوں نے آپ کو گرفتار کر لیا ہوگا اور نظام کے بادشاہ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا ہوگا۔ اس تیسرے درج میں حضرت ابراہیم نے دو مزید عظیم الشان عزیمتوں کا ثبوت دیا۔ جس نے اعلاء کلمہ حق کے اظہار کو درجہ کمال پر پہنچا دیا۔ یہ دو عزیمتیں درج ذیل ہیں:

(الف) ظاہری منبع فساد ملکوت حکمی کو عملاً بے حقیقت ثابت کر دینا:

حضرت ابراہیم گرفتار کر لئے گئے اور نظام کی سب سے بڑی عدالت یعنی بادشاہ نظام کے سامنے پیش کئے گئے۔ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ حضرت ابراہیم وہاں بری ہونے کے لئے کوشاں نہیں تھے نہ اس بات کے خواہش مند کہ آپ یہ ثابت کریں کہ لوگوں نے خواہ مخواہ ایک بے گناہ کو پکڑ لیا ہے اور یہ کہ آپ کو چھوڑ دیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ نے اقامت اعلاء کلمہ حق کے درج دوم پر کھڑے ہی اس لئے ہوئے تھے کہ آپ اس جہت کو پوری کر سکیں جس کے بعد ابلیس کے فساد ملکوت حکمی پر قائم نظام کے پاس شکست تسلیم کرنے کے سوا کوئی اور راہ باقی نہ رہ جائے۔ ابلیس کے نظام فساد ملکوت حکمی نے آپ کو نظام کی سب سے بڑی عدالت میں پیش ہونے کے لئے مجبور نہیں کیا بلکہ حضرت ابراہیم نے نظام فساد ملکوت حکمی کو مجبور کر دیا کہ وہ ان کو اپنی سب سے بڑی عدالت میں پیش کرے۔ نظام وقت کی سب سے بڑی اور اونچی مسند پر بیٹھا بادشاہ دراصل نظام فساد ملکوت حکمی کا وہ منبع شر تھا جو خود کو رب کہتا تھا۔ ابلیس نے اسے باور کرایا تھا کہ وہ رب العالمین ہے اس لئے کہ وہ ملک کا مالک ہے۔ اور چونکہ وہ ملک کا مالک ہے اس لئے ملکوت کا بھی مالک ہے۔ ابلیس نے اس کے لئے پورے نظام کو برپا کیا تھا جس کی ہر شے اسے ہمہ وقت شہادت دیتی تھی کہ وہ فی الواقع ملکوت کا مالک اور رب العالمین ہے۔

جب حضرت ابراہیم کا اس خود ساختہ رب العالمین سے سامنا ہوا تو ظاہر ہے آپ نے

جو کچھ بھی کہا ہوگا وہ یہی ہوگا کہ تم رب العالمین نہیں ہو۔ اگر تم رب العالمین ہو تو ثابت کرو۔ یہی وہ مقام ہے جو دراصل حق کو مطلوب تھا۔ اس طرح حضرت ابراہیم نے حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ابلیس کے ذریعہ پھیلائے اس مکر کبار کی سب سے بڑی مملکت کے سب سے بڑی مقتدر شخصیت کو اس مقام پر لا دیا کہ وہ یا تو ثابت کرے کہ فی الواقع وہ ملکوت کا مالک ہے اس لئے کہ اس کے پاس ملک ہے۔ جیسا کہ اس کا دعویٰ ہے۔ یا پھر اس سارے نظام پر یہ بات کھل کر واضح ہو جائے کہ یہ سب ابلیس کے مکر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ روئے ارض پر منعقد ہونے والی اس عظیم اور عظیم النظیر معرکہ آرائی کو قرآن نے غیر معمولی طریقے سے یوں پیش کیا ہے:

(۱) قالوا احرقوه وانصروا الهتکم ان کنتم فعلین (الانبیاء ۶۸)

ترجمہ: بولے اس کو جلا ڈالو اور مدد کرو اپنے معبودوں کی اگر کچھ کرنا ہو۔

تصور کیجئے کہ ہزاروں یا لاکھوں لوگوں کا جم غفیر ہے جن کے مابین حضرت ابراہیم نے ان باتوں کو توڑنے کی بات بالواسطہ قبول کی تھی اور ان بے حقیقت باتوں کو پوجنے پر لوگوں کو سخت ملامت کی تھی۔ ہر چند کہ لوگ ان دلیلوں کے سامنے جو حضرت ابراہیم نے پیش کئے گئے ہو چکے تھے، اور ان کے دل قبول کر رہے تھے کہ کتنی پختہ اور درست بات کہی جا رہی ہے لیکن ابلیس نے انہیں اور بالخصوص ملائکہ کو اکسایا کہ وہ ان دلیلوں کو پس پشت ڈالیں اور عصبيت کی بنیاد پر اس بات کا فیصلہ کریں۔ چنانچہ ملائکہ پکار اٹھے اور بادشاہ وقت سے مطالبہ کیا کہ وہ اس شخص کے زندہ جلا دیئے جانے کا فیصلہ صادر کرے تاکہ ان کے معبودوں کی بے عزتی کا بدلہ لیا جاسکے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم نظام وقت کے سب سے بڑے بادشاہ کے سامنے پیش کئے گئے۔ بھرے دربار میں آپ نے نہ صرف یہ کہ پیش آمدہ باتوں کی تصدیق کی بلکہ اس کے سامنے اللہ کی توحید کا پیغام پیش کیا اور کہا کہ اللہ واحد رب العالمین ہے۔ اس کے سوا کوئی رب نہیں۔ چنانچہ اس شہادت حق کا رد عمل وہی ہونا تھا جو پیش آیا۔ دنیا کے سب سے بڑے نظام کا مطلق العنان بادشاہ جو فی الواقع خود کو ملکوت کا مالک سمجھتا تھا اس نے کہا کہ میں رب العالمین ہوں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

(۲) اٰلہم تر الٰہی الذی حاج ابراہیم فی ربہ (البقرہ ۲۵۷)

ترجمہ: کیا نہ دیکھا تو نے اس شخص کو جس نے جھگڑا کیا ابراہیم سے اس کے رب کی بابت۔

بادشاہ نے اپنے کو اس لئے رب کہا کہ اسے ابلیس نے یہی باور کرایا تھا کہ وہ رب ہے اس لئے کہ

اس کے پاس ملک ہے۔ اور ملک کا مالک ملکوت کا مالک ہوتا ہے۔

(۳) ان آتہ اللہ الملک (البقرہ ۲۵۷)

ترجمہ: اسی وجہ سے کہ دی تھی اللہ نے اس کو ملک

(۴) اذ قال ابراهيم ربی الذی یحیی ویمیت قال انا حی و امیت۔ (البقرہ

۲۵۷)

ترجمہ: جب کہا ابراہیم نے: میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے تو اس بادشاہ نے کہا کہ میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔

(۵) قال ابراهيم فان اللہ یاتنی بالشمس من المشرق فان بها من المغرب

(البقرہ ۲۵۷)

ترجمہ: کہا ابراہیم نے کہ بے شک اللہ تو لاتا ہے سورج کو مشرق سے اب تو لے آؤں گا مغرب سے۔

(۶) فبہت الذی کفر واللہ لا یہدی القوم الظالمین (البقرہ ۲۵۷)

ترجمہ: تب حیران رہ گیا وہ کافر اور اللہ سیدھی راہ نہیں دکھاتا ظالموں کو۔

اس صورت واقعہ اور اس کی غیر معمولی کیفیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ طوفان نوح کے بعد نئے منہج

کے مطابق پھیلے سب سے بڑے نظام ابلیس کا سب سے بڑا بادشاہ خود اپنے دعوے کے تعلق

سے وہاں پہنچا دیا گیا جہاں وہ بہت ہو کر رہ گیا۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی راہ نہیں بچ

گئی تھی کہ وہ قبول کر لے کہ وہ جو کچھ سمجھتا اور دعویٰ کرتا رہا ہے اور جس پر ابلیس نے سارا نظام

برپا کر رکھا ہے کہ ملک کا مالک ملکوت کا مالک ہوتا ہے، غلط ہے۔ ملک کا مالک ملکوت کا مالک نہیں

ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔ اگر وہ ملکوت کا مالک ہوتا تو سورج کو مغرب سے نکالنے پر قدرت رکھتا۔

لیکن حجت ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ یہ وہ بات نہیں تھی جس کے لئے حضرت ابراہیم نے یہ سب

کچھ کیا تھا۔ بادشاہ نظام وقت خوب سمجھ چکا تھا کہ پورے نظام اور اس کی اساس کی عزت اب داؤ

پر لگ چکی ہے۔ اس صورتحال میں کسی نظام کے مقتدر اعلیٰ سے اسی رد عمل کی توقع کی جاسکتی تھی

جس کا فیصلہ بالآخر بادشاہ نے کر دیا۔ بلاشبہ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہاں ایک اور کھلی شکست اس

کا انتظار کر رہی ہے۔ چنانچہ غصے میں آکر اور اپنے لرزاں جبروت کو ثابت کرنے کے لئے بادشاہ

نے وہی فیصلہ دے دیا جس کا مطالبہ اس کے تمام عمائد کر رہے تھے۔ قرآن نے فرمایا:

قالوا ابنوا بنا فاقوه فی الجحیم (الصافات ۹۷)

ترجمہ: بولے بناؤ اس کے واسطے ایک عمارت پھر ڈالو اس کو آگ کے ڈھیر میں۔

چنانچہ ایک عظیم و مہیب فرنس (Furnace) تیار کیا گیا اور ہزاروں لوگوں کی آنکھوں کے سامنے حضرت ابراہیم کو اس کی دھکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا گیا۔ ہزاروں لوگوں اور بادشاہ نے دیکھا کہ اس کے فوجیوں نے حضرت ابراہیم کو ایک مہیب بھٹی میں پھینک دیا ہے۔ ایک ایسی بھٹی جس کی دھکتی ہوئی آگ پل بھر میں بڑی سے بڑی چیز کو رکھ کر سکتی ہے۔ بادشاہ بے حد خوش ہوا کہ اس نے بالآخر ثابت کر دکھایا کہ وہ ملکوت کا بھی مالک ہے۔ سارے لوگوں نے بھی دیکھا کہ نظام سے ٹکراتا کتنا ہلکا پڑتا ہے۔ سارے نظام اور بادشاہ نے اطمینان کا سانس لیا اور خوش خوش گھر لوٹ گئے کہ نظام وقت کے اتنے بڑے دشمن کو ان لوگوں نے کفر کردار تک پہنچا دیا تھا۔ جو تھوڑے اہل ایمان تھے ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے انجام نے سمجھوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

ادھر جب بادشاہ کے حکم سے حضرت ابراہیم دھکتی ہوئی آگ میں پھینکے جا رہے تھے تو حضرت ابراہیم نے لوگوں سے اور بالخصوص بادشاہ سے فرمایا:

قرآن کا ارشاد ہے:

وقال انما اتخذتم من دون الله اوثانا مودة بینکم فی الحیوة الدنیاء
یوم القیامة یکفر بعضکم ببعض ویلعن بعضکم بعضا وما وکم النار وما لکم من
نصرین (العنکبوت ۲۵)

ترجمہ: اور ابراہیم بولا جو ٹھہرائے ہیں تم نے اللہ کے سوا بتوں کے آستانے سودوستی کر کر آپس میں دنیا کی زندگانی میں پھر دن قیامت کے منکر ہو جاؤ گے ایک سے ایک اور لعنت کرو گے ایک کو ایک اور ٹھکانا تمہارا آگ ہے اور کوئی نہیں تمہارا مددگار۔

ظاہر ہے یہ حجت کے آخری کلمات تھے۔ ہر چند کہ حضرت ابراہیم خوب سمجھ رہے تھے کہ وہ حق پر ہیں اور جس بات پر وہ اس عظیم و ہیبتناک سزا کے مستحق قرار دیئے گئے ہیں صرف وہی حق اور یہ سزا دینے والے برسر غلط ہیں لیکن ان کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں اور دل سمجھ رہا تھا کہ چند ہی ثانیے بعد

جب وہ اس آگ میں پھینکے جائیں گے تو وہ آگ پل بھر میں انہیں راکھ بنا دے گی۔ لیکن وہ حق پر قائم رہے اور اللہ کی رضا پر راضی ہو گئے کہ اگر اس کلمہ حق کے اظہار پر انہیں یہ سزا دی جا رہی ہے تو وہ اسے بطیب خاطر قبول کرتے ہیں۔ ہاں انہوں نے بادشاہ اور پورے نظام کو آگاہ کیا کہ وہ اس کی پاداش میں اس سزا سے نہیں بچ سکیں گے جو آخرت میں ان کا انتظار کر رہی ہے اور یہی لوگ جو آج ملکوت کے مالک بنے بیٹھے ہیں اور وہ دیوتا جن کا یہ نام لیتے ہیں اور ابلیس آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے اور ایک دوسرے پر لعنت کر رہے ہو گئے۔

یہاں تک کہ فوجیوں نے حضرت ابراہیم کو آگ میں پھینک دیا تو اللہ نے ملکوت میں حکم جاری فرمایا: قرآن کا ارشاد ہے:

قلنا ینار کونی بردا وسلاما علی ابراہیم (الانبیاء ۶۹)

ترجمہ: ہم نے کہا ہے آگ ٹھنڈک ہو جا اور سلام ابراہیم پر ابھی آپ کو آگ کی لپٹ چھو بھی نہ سکی تھی کہ اس کی سنت بدل گئی۔ ظاہر میں سمجھوں نے دیکھا کہ ابراہیم خاکستر ہو گئے لیکن وہاں ابراہیم پوری طرح محفوظ و مامون تھے۔ اے دن گزر گیا۔ سارا نظام خوشیاں منارہا تھا۔ چند اہل ایمان یا وہ لوگ جو حضرت ابراہیم سے ہمدردی رکھتے تھے اس بھیاںک انجام کے بعد سکتے میں پڑے ہوئے تھے کہ رات کی تاریکی میں اچانک حضرت ابراہیم علیہ السلام نمودار ہوئے اور تنہائی میں حضرت لوط سے جو ان کے بھتیجے اور ان کے سب سے قریب تھے ان کے آپ نے فرمایا کہ اللہ نے آپ کو محفوظ رکھا ہے اور یہ کہ اب وہ اللہ کے حکم سے ہجرت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حضرت ابراہیم نے پوچھا کہ کیا لوط ان کا ساتھ دیں گے؟ حضرت لوط نے کہا کہ وہ ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔ پوچھا کہ آپ کہاں جائیں گے اور کیا کریں گے؟ چنانچہ حضرت ابراہیم نے جواب دیا:

(۱) وقال انی مهاجر الی ربی انہ ہو العزیز الحکیم (العنکبوت ۲۶)

ترجمہ: اور وہ بولا: بے شک میں تو مهاجر ہوتا ہوں اپنے رب کی طرف بے شک وہی ہے زبردست حکمت والا۔

(۲) وقال انی ذاہب الی ربی سیہدین (الصافات ۹۹)

ترجمہ: اور بولا: بے شک میں جاتا ہوں اپنے رب کی طرف وہ مجھ کو راہ دکھائے گا

حضرت ابراہیم نے جواب دیا کہ انہیں نہیں معلوم کہ کہاں جانا ہے۔ وہ امید کرتے ہیں کہ ان کا رب ان کو درست جگہ لے جائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ کنعان چلے جائیں اور اسے دارالہجرت قرار دیکر مرکز اظہار بنالیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَنَجِّنْهُ وَلَوْ طَالَى الْأَرْضُ الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ (الانبیاء ۷۱)

ترجمہ: اور بچاؤ نکالا ہم نے اس کو اور لوٹ کو اس زمین کی طرف جس میں برکت رکھی ہم نے جہانوں کے واسطے (اقامت اعلاء کلمہ حق سوم کی تکمیل بعد میں ملاحظہ فرمائیں)

اقامت ہجرت

ہجرت اظہار کی راہ کی ایک جانکاہ مگر عظیم الشان منزل ہے۔ ہجرت سے مراد ہے صرف اللہ کی رضا کے لئے دنیا کی ہر شے کو چھوڑ دینا جو اللہ رب العزت کی رضا کی تکمیل میں حارج یا اس سے متصادم ہو۔ حضرت ابراہیم وہ پہلے رسول ہیں جنہوں نے اس مفہوم میں اللہ کی راہ میں ہجرت کی۔ آپ سلطنت بابل چھوڑ کر شام میں کنعان چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے لئے دارالہجرت قرار دے دیا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں حادثات کے وقوع کا یہ تسلسل بے حد تیز اور بے حد طویل تھا؟ اس کا فہم دراصل اس بات کو واضح کرتا ہے آپ نے اظہار کے لئے کتنی طویل اور جانگداز جدوجہد فرمائی ہے اور اس راہ میں کیسی جگرسوزی اور جاں کاہی کے مراحل سے گزرے ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

قَالُوا اسْمَعْنا فتنیٰ بذکرہم یقال لہ ابراہیم (الانبیاء ۶۰)

ترجمہ: وہ بولے ہم نے سنا ہے ایک جوان جنوں کو کچھ کہتا رہتا ہے۔ اس کو کہتے ہیں ابراہیم۔

چنانچہ حضرت ابراہیم کو جب آگ کی بھٹی میں پھینک دیے جانے کا واقعہ پیش آیا اس وقت آپ نو جوانی کی عمر میں تھے اگر تحقیری انداز بیان کی رعایت کی جائے مثلاً تحقیراً بعض سن رسیدہ لوگ اپنے سے کم عمر لوگوں کو حتیٰ کہ تیس پینتیس سال تک کے لوگوں کو بھی 'لوٹا' کہہ دیتے ہیں تو اس رعایت کے ساتھ جب اس وقت آپ کی عمر ۲۰ اور تیس سال کے مابین رہی ہوگی لوگوں کا قول 'فتی' یہی مفہوم رکھتا ہے۔ یہاں سے ایک طویل اور جاں کاہ سفر کا آغاز ہوتا ہے جس میں حضرت ابراہیم نے راہ خدا میں اس استقامت کا ثبوت دیا ہے جس کی دنیا میں نظیر نہیں مل سکتی۔ (یہاں

اس الجہاد سے صرف نظر کرنا طوالت سے بچنے کے لئے احسن ہے جو توراۃ کے بیان سے پیدا ہوتا ہے)

حضرت ابراہیم علیہ السلام وہ پہلے رسول ہیں جنہوں نے راہِ اظہار میں ہجرت کی۔ اسلام میں اس ہجرت کے علاوہ کوئی اور ہجرت نہیں۔ چنانچہ ہجرت کا صرف ایک قرآنی مفہوم ہے جس کے درج ذیل شرائط ہیں:

(۱) محض اللہ کی رضا کی تکمیل کے لئے ہر شے کو ترک کرنا حتیٰ کہ اپنے مسکن (وطن) کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جانا۔

(۲) کسی ایسی جگہ جانا جہاں چھوڑی ہوئی جگہ کے مقابلے میں رضاء الہی کی تکمیل کی نسبت زیادہ آزادی اور مواقع میسر ہوں۔

(۳) صرف اس لئے مسکن (وطن) سے دارالہجرۃ منتقل ہونا تاکہ ضروری تیاری کے ساتھ واپس پلٹ کر اس قوت کا خاتمہ کیا جائے اور چھوڑے ہوئے مقام کو وجہ اللہ و اگزار کرایا جائے۔

قرآنی ہجرت کے یہ تین بنیادی شرائط ہیں۔ جس نقل مکانی میں یہ تین باتیں نہ پائی جائیں وہ ہجرت نہیں۔ اس قرآنی ہجرت میں ایک اور شرط ہے لیکن چونکہ وہ خود ان تینوں شرائط کے اندر

مفہوم ہے اس لئے الگ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن اس وقت ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس مفہوم کو کھول کر بیان کر دیا جائے۔ چنانچہ چوتھی شرط یہ ہے کہ ہجرت اور اس کے

تحت عاید ہونے والی ذمہ داری اور تقاضے کو پورا کرنے کا اطلاق صرف ان لوگوں پر نہیں ہوتا جو براہ راست متاثرین یعنی ہجرت کرنے والے ہیں بلکہ یہ ذمہ داری علی الاطلاق اشتمالی ہوتی ہے۔

یعنی یہ ذمہ داری کل امت مومنہ پر عاید ہوتی ہے۔ اگر واضح طور پر کہا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہجرت اور جہاد لازم و ملزوم ہیں۔ بغیر ہجرت کے جہاد تو ممکن ہو سکتا ہے لیکن ایسی ہجرت جس کا

مقصد اولین و آخرین اقامت جہاد نہ ہو سرے سے ہجرت نہیں۔ ہجرت جہاد کا پیش خیمہ اور اسے لازم بنادینے والی ہے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ ہجرت دراصل اس طویل جدوجہد کا پیش خیمہ تھی جسے جہاد فی سبیل اللہ کہتے ہیں۔ اس ہجرت کے بعد جس وقت حضرت ابراہیم الفتح سے سرخرو

ہوئے اس وقت آپ کی عمر شریف پچاسی سال کی تھی۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ نے ہجرت

کے بعد جہاد کی کتنی طویل اور جان کاہ مراحل گزارے۔ ایک عام اندازے کے مطابق یہ مدت پچاس پچپن سال کی ہوتی ہے۔

اقامت مقام

اقامت مقام حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ غیر معمولی کارنامہ ہے جس پر پورا بنی نوع انسان ان کا ہمیشہ ممنون رہے گا اور ان کے اس عظیم احسان کے تلے دبا رہے گا۔ 'مقام' کا مفہوم ہے کھڑے ہونے کی جگہ۔ لیکن جب اس لفظ کا اطلاق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تناظر میں ہوتا ہے تو اس کی خاص اصطلاحی معنویت وحیثیت بن جاتی ہے۔ آج اس اصطلاحی معنویت کے کلیتاً محبوب ہو جانے کی صورت تو اس کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کا مفہوم کھول کر واضح کیا جائے لیکن اس عاجز کو خوف ہے کہ اگر اسے قابل لحاظ حد تک بھی زیر بحث لایا گیا تو یہ ذکر اتنا طویل ہو جائے گا کہ کہیں اس سلسلہ بحث پر ناقابل برداشت بوجھ نہ بن جائے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس کی صرف ضروری تفہیم کر کے سلسلہ بحث کو جاری رکھا جائے۔

قرآن کا ارشاد ہے:

واتخذوا من مقام ابراہیم (البقرہ ۱۲۵)

ترجمہ: اور بنا لو ابراہیم کے (مقاموں میں) سے (اس) مقام کو.....

ہمارے مفسرین کرام اس تعلق سے نہایت بے سرو پا بات کرتے رہے ہیں اور خود غور نہیں کرتے کہ وہ نقل کے نام پر کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ صورتحال متاخرین کے یہاں اور بھی دشتناک ہو گئی ہے۔ چنانچہ اگر کسی مشکل مقام کی تشریح صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے منقول بھی ہے تو کم ہی مفسرین متقدمین اسے سمجھ پائے خاص حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس کی باتوں کو اور مفسرین متقدمین کی باتوں کو کم ہی مفسرین متاخرین سمجھ پائے اور تحقیق کے فقدان اور نقل کے جبر نے الجھانے میں جو کسر رہ گئی تھی وہ پوری کر دی۔ چنانچہ دونوں کی مثالیں اس لفظ کے تعلق سے ملاحظہ فرمائیں:

مفسرین متاخرین: ”مقام ابراہیم وہ چھر ہے جس پر کھڑے ہو کر خانہ کعبہ کو تعمیر کیا گیا تھا۔ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کا نشان ہے اور اسی پتھر پر کھڑے ہو کر حج کی دعوت دی

تھی۔ اور وہ جنت سے لایا گیا تھا جیسے حجر اسود (موضح فرقان۔ تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی بر ترجمہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ)

غور کیا جائے کہ مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر آپ کھڑے ہو کر خانہ کعبہ بنا رہے تھے یا وہ جگہ ہے جہاں وہ پتھر رکھا گیا تھا۔ اگر پتھر ہے تو لازماً اسے کعبۃ اللہ کے بناتے وقت کعبہ کے چاروں طرف الگ الگ مقامات پر رکھا گیا ہوگا اس صورت میں اصل چیز پتھر ہے نہ کہ وہ مقام جہاں آج وہ پتھر ہے یا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں تھا۔ اس صورت میں حکم پتھر کی طرف ہونا چاہئے۔ اگر مقام ابراہیم سے مراد پتھر نہیں بلکہ وہ جگہ ہے جہاں آپ پتھر پر کھڑے ہو کر کعبۃ اللہ کی تعمیر کر رہے تھے تو کیا کسی ایک مقام پر پتھر پر کھڑے ہو کر کعبہ کی تعمیر ہو سکتی ہے؟ اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ آخر یہ تفصیلات معلوم کہاں سے ہوئیں؟

مفسرین متقدمین۔ ابن جریر طبری نے تقریباً دو صفحات پر مشتمل تفسیر درج کی ہے۔ جس کے چند قابل غور امور نیچے درج کئے جاتے ہیں:

- (۱) مقام ابراہیم سے مراد پورا کا پورا حج ہے۔
- (۲) عرفہ، مزدلفہ، الجحار سب مقام ابراہیم ہیں۔
- (۳) عرفہ، مزدلفہ، منیٰ اور جو کچھ اعمال حج ہیں سب مقام ابراہیم ہیں۔
- (۴) پورا مکہ مقام ابراہیم ہے۔
- (۵) مقام عرفہ مقام ابراہیم ہے۔
- (۶) حرم مقام ابراہیم ہے۔
- (۷) مسجد حرام مقام ابراہیم ہے۔

(۸) یہ پتھر کا وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم نے اپنے پاؤں رکھے تھے جسے حضرت اسمعیل کی زوجہ نے رکھا تھا اور اس پر آپ کے پاؤں کے نشان آگئے اور اللہ نے اسے شعار بنا دیا۔

یہ ساری باتیں ابن عباس، عطاء، مجاہد، سدی، شعبی کے حوالے سے کہی گئی ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام سے جو باتیں لوگوں تک پہنچیں وہ درست تھیں لیکن بہت سی باتوں کے نہ سمجھنے کے سبب بیان کرنے والوں نے اسے کچھ سے کچھ کر دیا۔ اور بعد میں وہ

باتیں مزید کچھ اور ہو گئیں۔

مختصر یہ کہ مقام ابراہیم دراصل وہ جگہ ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام خصوصی طور پر اللہ کی طرف متوجہ ہوئے اور اللہ کو پکارا اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کی پکار سنی اور اسی مقام پر انہیں ایک مخصوص بلکہ خاص الخاص فضل اور رویت سے نوازا جسے مخصوص قسم کی تجلی اور رویت کہی جاسکتی ہے جو اپنی کیفیت کے اعتبار سے حضرت موسیٰ پر ہونے والی تجلی اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سدرۃ المنتہی سے پرے ہونے والی رویت کے مابین ہے۔ یا بالفاظ دیگر چونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ رویت روئے ارض سے پرے ہوئی تھی اس اعتبار سے روئے ارض پر ہونے والی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر وہ تجلی اور رویت عالم انسانیت میں سب سے بڑی اور عظیم الشان رویت ہے۔ یہ ہے مخصوص اور اصلی مفہوم 'مقام' کا لیکن اس کا اطلاق ان جگہوں پر بھی ہوتا ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور اللہ کو پکارا اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ چنانچہ مفسرین متقدمین سے جو باتیں مروی ہیں وہ وسیع تناظر میں اسی مقام سے متعلق ہیں جو اپنی جگہ درست ہیں لیکن یہ تو وسیع دراصل اس مخصوص صورت پر مبنی ہے جو پہلے مذکور ہوئی۔ چنانچہ روئے ارض پر کم از کم دو ایسے مقامات معلوم ہیں جہاں حضرت ابراہیم نے اللہ تعالیٰ کی طرف اس مخصوص قسم کی توجہ کی اور پھر اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم پر اپنا فضل خاص الخاص کر کے ہونے والی اس رویت سے سرفراز فرمایا جس میں نہ صرف یہ کہ حضرت ابراہیم کی دعا قبول فرمائی بلکہ ان پر انعام خاص الخاص کی بارش فرمائی۔ قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے کہ کعبۃ اللہ سے متصل ایک مقام ابراہیم کے علاوہ بھی روئے ارض پر اور مقام ابراہیم ہیں۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

وَ اتَّخَذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ (البقرہ ۱۲۵)

ترجمہ: اور بنا لیا ابراہیم کے مقام میں سے

اس عاجز کے علم کی حد تک کعبۃ اللہ سے متصل مقام ابراہیم کے علاوہ دوسرا مقام ابراہیم شخم Shechem میں واقع ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مقام کی اقامت فرمائی اس سے دو باتیں مراد ہیں۔ حضرت ابراہیم سے قبل انبیاء اللہ تعالیٰ کو پکارتے تھے اور گویا دور سے انہیں جواب دیا جاتا تھا۔ حضرت

ابراہیم نے اللہ تعالیٰ کو پکارا اور انہیں نہ صرف یہ کہ قریب سے جواب دیا گیا بلکہ وہ بات یک گونہ رویت کے قریب تھی۔ گویا یہ اس کیفیت کی بحالی تھی جو الجنتہ میں آدم و حوا کی تھی۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہوئی کہ آپ کسی سے ملنا چاہیں اور ملاقات کی اجازت نہ ہو ہاں آپ تحریر بھیج سکتے ہیں اور جواب بھی تحریر میں مل جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ تحریر بھیجیں اور ہر چند کہ ملاقات نہ ہو لیکن مرسل الیہ آپ سے انٹرکام پر بات کر لے۔ اس سے آگے تو صرف وہی صورت باقی رہتی کہ وہ تخلیہ میں بالمشافہ آپ سے ملاقات کرے۔ چنانچہ اس اقامت سے پہلی بات یہ مراد ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سلسلہ کا آغاز فرمایا یا ان کے ذریعہ اس سلسلہ کا آغاز ہوا تا کہ بنی آدم الجنتہ سے قریب تر صورت میں اللہ تعالیٰ سے پھر ہمکلام ہو اور اللہ تعالیٰ نے حیثیت آدم کی تنزیلی کے سبب جس فضل کو روک دیا تھا اسے پھر جاری اور بحال کر دیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے روئے ارض پر اس بحالی کو قبول فرمالیا۔ اور حضرت ابراہیم اس سے نوازے گئے۔ دوسری صورت وہ ہے جس کا ذکر ان شاء اللہ عنقریب آئے گا۔

اقامت ذبح

اقامت ذبح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اگلی عظیم الشان عزیمت تھی۔ آپ نے اللہ رب العزت کے حضور جانوروں کی قربانی پیش کی۔ اور اللہ تعالیٰ کے سامنے گویا اس کا اظہار فرمایا کہ اے اللہ اب میں آپ کی راہ میں ہجرت کر چکا ہوں اور جہاد کا معرکہ درپیش ہے میں آپ کے حضور جانور کی جان کی قربانی اس امثال میں پیش کر رہا ہوں کہ میں آپ کے حضور اپنی جان بھی پیش کرنے کے لئے ہمہ وقت آمادہ ہوں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حیات الجنتہ اور حیات ارض کے مابین خون کی ایک دیوار ہے۔ انسان کے رگ و پے میں جو خون رواں ہے اس کی حقیقت سمجھے بغیر حضرات آدم و حوا کے زمین پر آنے کو سمجھنا ممکن نہیں۔ لیکن چونکہ یہ بحث ان شاء اللہ ذبح عظیم کے عنوان کے تحت زیر بحث آئے گی اس لئے سروسٹ ہم اسے یہیں ختم کرتے ہیں۔

اقامت جہاد

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قیادت میں قافلہ حق اس آخری تصادم کی طرف بڑھ رہا تھا جس کے لئے حضرت ابراہیم کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے اقامت اعلاء کلمہ حق کروائی پھر اقامت ہجرت پھر اقامت مقام اور پھر اقامت ذبح۔

حضرت ابراہیم اس آگ کی بھٹی سے جب نکلے تو وہ خامشی سے سلطنت بابل کی سرحدوں سے باہر تشریف لے آئے۔ نظام وقت نے چین کا سانس لیا۔ بلکہ کسی درجے میں اس پر فتح و تمرد کا نشہ طاری ہو گیا اس لئے کہ اس نظام کے سب سے بڑے دشمن کو انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے دھکتی ہوئی بھٹی میں ڈال دیا اور سب نے باور کر لیا کہ اس کا جسم ایسی راکھ میں بدل گیا ہوگا جس کا نشان ملنا بھی مشکل ہو۔ ملک کے مالک کی ملکوت پر عملداری کی اس سے زیادہ نمایاں مثال اور کیا ہو سکتی تھی۔ اس وقت ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ جس شخص کو انہوں نے اس دھکتی ہوئی بھٹی میں ڈالا تھا اور جس کا راکھ ہونا ہزاروں لوگوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا تھا وہ زندہ سلامت ہوگا۔

ادھر حضرت ابراہیم اس ملکوت پر قدرت کے دعویدار نظام کے خلاف جہاد کی تیاریاں کر رہے تھے۔ آپ نے پہلا مرکز شیم (Shechem) کو بنایا اور کام کا آغاز کیا۔ شیم ہی وہ جگہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے پہلی بار اقامت مقام کروائی۔ یہیں حضرت ابراہیم نے اقامت ذبح کی۔

آپ لوگوں کے مابین جاتے اور انہیں حق کی طرف دعوت دیتے اس طرح تقریباً پچاس سالوں تک آپ نے انصار و اعداؤں تیار کئے۔ جہاد کی یہ تیاری بڑی عجیب و غریب تھی۔ یہ جہاد پہلا جہاد تھا جو زمین پر قائم کیا جا رہا تھا۔ اس جہاد میں اور اس جہاد میں جس کی اقامت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے ایک جو ہری فرق ہے۔ ہر چند کہ اس کی تفصیل تو اس کے اپنے مقام پر آئے گی لیکن اس وقت صرف اتنا عرض کرنا کفایت کرے گا کہ اگرچہ یہ دونوں ہی جہاد حربیہ تھے یعنی دونوں میں ہتھیاروں اور اسلحوں سے جنگ ہوتی تھی اور خون کا بہنا تھا لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جہاد جہاد ملک تھا جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جہاد جہاد ملکوت۔ اگر

اس کی تفہیم کے لئے ایک مثال دی جائے تو بات سمجھ میں آ جائے گی اور وہ مثال ہے غزوہ بدر الکبریٰ کی۔ غزوہ بدر الکبریٰ اپنی اصلیت اور حقیقت کے لحاظ سے جہاد ملکوت زیادہ تھا اور جہاد ملک کم۔ چنانچہ حضرت ابراہیم جس جہاد عظیم کی تیاری فرما رہے تھے اور اقامت مقام و اقامت ذبح جس کی تیاریوں کے اہم منازل تھیں وہ جہاد دراصل جہاد ملکوت تھا۔ حضرت ابراہیم کا بادشاہ اور نظام کی بھڑکائی ہوئی آگ میں بے خوف کود جانا بادشاہ اور نظام کے سامنے صرف ایک بہادری یا استقامت کی مثال سمجھی جا رہی تھی لیکن اب تقریباً پچاس سالوں کے بعد وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ اسی شخص کی قیادت میں جس کو انہوں نے جلاؤ الا تھا اور جس کا جلنا ہزاروں لوگوں نے اسی طرح دیکھا تھا جس طرح اپنی ہتھیلی کود کھتے ہیں ایک فوج اس عظیم نظام کی فوجوں سے بنر آ رہی تھی۔ بدر میں تین سو تیرہ اصحاب رسول ﷺ ابلیس کی فوج کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ تین سو تیرہ افراد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پندرہ سالوں کی محنت شاقہ کا نتیجہ تھے۔ تاریخ عالم حیرت میں ہے کہ یہ تین سو تیرہ افراد آخر کیا تھے! روئے ارض اب ایسی جمعیت قیامت تک نہیں دیکھ سکتی۔ یہ کیسے لوگ تھے؟ ان کی کیا خاصیت تھی؟ ان کی حقیقت کیا تھی؟ انہوں نے کیا کیا تھا؟ کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور گواہی دی:

انه قد شهد بدرا وما يدريك لعل الله اطلع على اهل بدر فقال
اعملوا ما شئتم فقد وجبت لكم الجنة (متفق عليه)

ترجمہ: یہ غزوہ بدر میں شریک ہوئے ہیں اور تمہیں کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کے حالات پر مطلع ہوتے ہوئے فرمایا کہ جو چاہو کرو، تمہارے لئے جنت واجب ہو گئی۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ اس سے بھی آگے وہ گواہی جو حضرت جبریل نے دی:

عن رفاعہ بن رافع قال جاء جبرئیل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم
قال ماتعدون اهل بدر فیکم قال من افضل المسلمين کلمة نحوها قال وکذ
لک من شهد بدرا من الملائكة (رواه البخاری)

ترجمہ: حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر حضرت جبریل عرض گزار ہوئے: آپ اہل بدر کو اپنے میں کیسا شمار کرتے ہیں؟ فرمایا کہ مسلمانوں میں سب سے افضل یا اس کے مانند کلمہ۔ حضرت جبریل نے فرمایا کہ اسی طرح ہم

بدر میں شامل ہونے والے ملائکہ کو شمار کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی پچاس سالوں کی محنت شاقہ اور کنعان سے لیکر مصر تک تگ و دو کر کے تین سواٹھارہ لوگوں کی ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند جمعیت کھڑی کر لی۔ اصحاب بدر کے طرح یہ تین سواٹھارہ لوگ حضرت ابراہیم کے وہ اصحاب تھے جو فساد ملکوت حکمی کے خلاف اس جہاد و معرکہ عظیم میں حق کی گواہی دینے والے تھے۔

ایسا لگتا ہے کہ شدہ شدہ یہ بات مشہور ہو گئی کہ وہ شخص جس نے عمائد نظام کو لاکھوں لوگوں کے سامنے اور بادشاہ وقت کو بھرے دربار میں اپنی حجت سے قائل کر دیا تھا کہ ملکوت کا مالک صرف اللہ رب العزت ہے اور یہ معبودان باطل نہ ملکوت کے مالک ہیں نہ بادشاہ اور جسے محض ہٹ دھرمی میں ہزاروں لوگوں کے سامنے دھکتی ہوئی تہ گ کی بھٹی میں جھونک دیا گیا تھا اور جسے سب نے جلتے ہوئے دیکھا تھا وہ نہ صرف یہ کہ زندہ ہے بلکہ اس نظام کے خلاف لوگوں کو آمادہ پیکار کر رہا ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ کتنے ہی افراد اور حکومتیں درپردہ اس کی حلیف ہو چکی ہیں۔ اس اطلاع پر ان کے خوف کا کیا عالم ہوا ہوگا۔ اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ظاہری بات ہے کہ اس خبر نے اس نظام میں خوف کی لہر دوڑادی ہو گئی۔ چنانچہ اس کا رد عمل یہ ہوا کہ اس قوت سے لڑنے کے لئے اس نظام نے اپنے حلیفوں کو ایک وفاق کی صورت دے دی جس کی سربراہی ایلام کے بادشاہ کے ہاتھوں میں تھی۔ درج ذیل حکومتوں پر مشتمل یہ وفاق غالباً اس وقت دنیا کی سب سے بڑی قوت کی نمائندگی کرنے والا وفاق تھا:

(۱) مملکت شنار جس کا بادشاہ امرا فیل تھا۔

(۲) مملکت ایلسر جس کا بادشاہ اریوخ تھا۔

(۳) مملکت ایلام جس کا بادشاہ خضر لاؤم تھا۔

(۴) مملکت گوئی جس کا بادشاہ تمل تھا۔

وہ حکومتیں جن سے حضرت ابراہیم کا یا تو تحالف کا معاملہ تھا یا جو حضرت ابراہیم کی بات مان کر اسلام قبول کر چکی تھی یعنی یہ بات تسلیم کر چکی تھی کہ ملک کا مالک ملکوت کا مالک نہیں "ملک اور ملکوت دونوں کا مالک صرف اللہ رب العزت ہے" وہ درج ذیل ہیں:

(۱) مملکت مصر

- (۲) مملکت سدوم جس کا بادشاہ بیرا تھا
 (۳) مملکت گمورہ جس کا بادشاہ برشا تھا
 (۴) مملکت ادمہ جس کا بادشاہ شتاب تھا
 (۵) مملکت زبویم جس کا بادشاہ شمیر تھا
 (۶) مملکت زاؤر جس کا بادشاہ بیلا تھا

یہ بات حتمی طور پر کہی نہیں جاسکتی کہ کئی دیگر اقوام مثلاً (۱) رفائیم (۲) زوزیم (۳) ایمیم (۴) حورینین (۵) عمالقد (۶) عمورینین حضرت ابراہیم کی حلیف تھیں یا نہیں۔ ممکن ہے آپ کی دعوت ان ملکوں اور قوموں میں بھی پھیل چکی ہو۔

فتح مبین

بہر حال مملکت ایلام کے بادشاہ خضر لاؤمر کی سربراہی میں نظام باطل کا عظیم لشکر بالآخر مملکت سدوم، مملکت گمورہ، مملکت ادمہ، مملکت زبویم اور مملکت زاؤر پر حملہ آور ہوا جو حضرت ابراہیم کی حلیف حکومتیں تھیں جہاں حضرت ابراہیم نے اپنے نمائندہ حضرت لوط علیہ السلام کو مقرر کر رکھا تھا۔ شروع میں اس وفاق نے نہ صرف یہ کہ بے حد کشت و خون کیا بلکہ حضرت ابراہیم کی ان حلیف مملکتوں کو بری طرح کچل ڈالا اور حضرت لوط کو گرفتار کر کے لے جانے لگے۔ یہی وہ گھڑی ہے جب حضرت ابراہیم اس فوج قاہرہ سے ٹکرا جانے کو تیار ہو گئے۔ چنانچہ آپ اپنے تین سواٹھارہ اصحاب کی فوج کے ساتھ نکل پڑے۔ دمشق کے شمال میں مقام حوبہ میں ان کے ساتھ آنا سا مٹا ہوا۔

حالات و کوائف سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ گھڑی ویسی ہی تھی جیسی غزوہ بدر الکبریٰ کی۔ اللہ کے رسول حضرت ابراہیم اپنی تین سواٹھارہ اصحاب پر مشتمل فوج کے ساتھ وقت کے سب سے بڑے وفاق الممالک کی فوجوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ عجیب نظارہ ہوگا۔ ایک شخص جس کو ہزاروں افراد نے اپنی آنکھوں کے سامنے دھکتی ہوئی بھٹی میں جھونکے جاتے ہوئے اور جل کر مرتے ہوئے دیکھا تھا آج وہ زندہ سامنے کھڑا ایک فوج کی کمان کر رہا تھا۔ یقیناً غیر اللہ کے واہمہ میں مبتلا اس وفاق الممالک کی فوج نے یہی سوچا ہوگا کہ یہ کوئی مانوق

الفطرت وجود ہے جس سے لڑا نہیں جاسکتا۔ اس سے لڑنا موت کو دعوت دینا ہے۔ اس لئے کہ یہ تو مرنے سے رہا اور جو مارا نہیں جاسکتا اس کی ضرب سے بچا بھی نہیں جاسکتا۔ چنانچہ جنگ سے قبل ہی پوری فوج ہار چکی تھی۔ اور ان لوگوں نے سپر ڈال دئے۔ یہ ایک شکست فاش تھی۔ کوئی صلح نہیں۔ وفاق الممالک کی وہ پوری فوج قاہرہ سپر انداز ہو چکی تھی۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ حضرت لوط رہا ہو گئے بلکہ سدوم، گمورہ، ادمہ، زبویم اور زاور کے سارے قیدی اور مال و اسباب جو لوٹ لئے گئے تھے واکزار ہو گئے۔

چنانچہ یہ وہی منظر تھا جو فتح مکہ کے دن تھا۔ جو حضرت ابراہیم کو ملک سے نکالنے والے تھے، جو انہیں آگ کی بھٹی میں ڈالنے والے تھے آج وہی ان کے رحم و کرم پر تھے۔

غلبہ عام

قرآن عظیم نے اللہ تعالیٰ کی سنت بیان کرتے ہوئے اور خبر دیتے ہوئے فرمایا: کتب اللہ لا غلبن انا ورسلی (المجادلہ ۲۱)

ترجمہ: اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب ہوں گے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس عزیمت عظمیٰ کے بدلے فتح مبین سے نوازا۔ آپ کا جہاد نہ مملکت کی جنگ تھا نہ ملک کا جہاد۔ اس لئے آپ اور آپ کی فوج کی مثال فرشتوں کی اس فوج کی ہے جو زمین کے فساد کو ختم کرنے کے لئے اتری ہو اور فساد اور وجہ فساد کے قلع قمع کے بعد واپس چلی گئی۔ چنانچہ آپ کو نہ مال غنیمت سے مطلب تھا نہ کسی اور منفعت سے۔

اس فتح مبین نے پوری روئے ارض پر دراصل یہ ثابت کر دیا کہ ابلیس کے برپا کردہ فساد ملکوت حکمی کی کوئی حقیقت نہیں۔ ملک کا مالک ملکوت کا مالک نہیں ہوتا۔ بلکہ ملک اور ملکوت سب پر اللہ واحد وقہار کی حکمرانی ہے وہی موت اور حیات کا مالک ہے۔ اسی کے اشارے پر کائنات رواں اور دواں ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ کسی کو اسکی کائنات میں کوئی قوت اور قدرت حاصل نہیں الا یہ کہ خود اللہ نے کسی کو کوئی قوت دی ہو۔

حضرت ابراہیم نے آگ کی آزمائش پر پورا تر کر یہ ثابت کیا کہ ظاہری منبع فساد ملکوت

حکمی یعنی بادشاہ اور اس کا رب العالمین بن کر لوگوں کی موت و حیات کا مالک بننے کا دعویدار ہو جانا محض بے حقیقت اور لغو ہے۔ ملکوت پر حکم رانی کا دعویٰ کرنے والا بادشاہ اور اس کا نظام اپنی پوری قوت اور جبروت کا استعمال کر کے بھی ایک شخص کو آگ میں جلا نہیں سکا۔ اور آج وہی جلانے والے اور اس کے احوال و انصار اپنی پوری فوج کے ساتھ اس شخص کے رحم و کرم پر تھے۔

حضرت ابراہیم کا اگلا اقدام تھا باطنی منبع فساد ملکوت حکمی یعنی منبع شرک غیر اللہ کو عملاً بے حقیقت ثابت کرنا۔

اس معرکے کے نتیجے میں حضرت ابراہیم نے ان بادشاہوں اور حکمرانوں پر باور کرایا کہ انہیں ابلیس نے جن خام خیالیوں میں مبتلا کر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ بھی معبودان کا وجود ہے اور وہ اللہ کے ملکوت میں دخیل اور صاحب قوت ہیں۔ ان کی بات سنی اور مانی جاتی ہے۔ اور یہ کہ وہ بادشاہان کے بیٹے، نمائندے یا چہیتے ہیں۔ اج حضرت ابراہیم نے سمجھوں کی آنکھوں کے سامنے ان بادشاہوں پر واضح کر دیا کہ اللہ کے سوا کوئی قدرت رکھنے والا نہیں۔ کسی معبود غیر اللہ کا وجود نہیں۔ یہ محض دھوکا ہے۔ کسی کو اللہ کی ملکوت میں کوئی عمل دخل نہیں۔ اللہ ہی سب کا مالک ہے۔ اور ملکوت اسی کا ہے۔

یہ ہے وہ عظیم کارنامہ جو تاریخ انسانی کی چوتھی عظیم جست (The Fourth Quantum Jump) کہلاتا ہے۔

پندرہ سولہ سال کی عمر سے بچا اسی سال کی عمر تک فساد ملکوت حکمی کے لقمہ و دق اور بے سنگ میل صحرا میں یہ سفر اور اس میں ان تھک جھجھک کی یہ وہ داستان ہے جو آج اس مقام پر پہنچ گئی جہاں نوح علیہ السلام سے کئے گئے میثاق کو اس کے بیٹے ابراہیم نے پورا کر دیا۔ نسل آدم نے ایک عظیم جست (The Quantum Jump) لے لی تھی جس نے حیثیت آدم کو وہ جست دلادی جسے Space Barrier سے گزر جانا کہا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم نے آباد زمین کے کنارے سے اس کنارے تک اس ابلیسی فساد کا خاتمہ کر دیا تھا جسے فساد ملکوت حکمی یعنی فساد شرک کہا جاتا ہے۔

جست چہارم

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بالآخر ابلیس کے اس منہج فساد ملکوت حکمی یعنی فساد شرک

کو ہر اعتبار سے درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ یہ اس میثاق کی تکمیل تھی جسے اللہ نے حضرت نوح علیہ السلام سے کیا تھا۔ حیثیت آدم کی بحالی کی یہ چوتھی عظیم جست (The Fourth Quantum Jump) تھی۔ اس جست نے آدم کی حیثیت کو وہاں پہنچا دیا جہاں حضرت آدم و حوا الجنہ میں گناہ اور خطا سے قبل تھے۔ یعنی عملاً روئے زمین پر ہوتے ہوئے اپنی حالت کے اعتبار سے آدم کی پھر وہی حیثیت ہو گئی جو گناہ سے قبل تھی۔ (ملاحظہ فرمائیں نقشہ صبوط و ترقی آدم) گویا آدم و حوا ہر گناہ سے پاک و صاف اس حالت میں ہوں جسے یا آدم اسکن انت وزوجک الجنة و کلا منها رغدا حیث شئتما ولا تقربا هذه الشجرة فتکون من الطالمین (اے آدم جا کر رہ تو اور تیری زوجہ الجنہ میں اور کھا اس میں جو چاہو جہاں سے چاہو اور پاس مت کرنا اس شجرہ کو ورنہ تم دونوں ہو جاؤ گے ظالم) کی حالت کہتے ہیں۔ چنانچہ بیک وقت تین باتیں روئے ارض پر واقع ہو گئیں۔ پہلی تبدیلی منہج، دوسری میثاق نو اور تیسری انعام و تفویض:

(۱) تبدیلی منہج: چونکہ حضرت ابراہیم نے ابلیس کے اس منہج کو جسے اس نے طوفان نوح کے بعد اختیار کیا تھا شکست فاش دے دی تھی لہذا اب اس شکست کے بعد ابلیس نے نئے منہج کی بنیاد ڈالی۔

(۲) میثاق نو: ابلیس کے نئے منہج کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے نئی نوع انسان کی طرف سے نیا میثاق لیا۔ جسے حضرت ابراہیم نے قبول فرمایا۔

(۳) انعام و تفویض: ابلیس کے سابقہ منہج کو تباہی سے دو چار اور نئے میثاق کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو نئے انعامات اور تفویض سے نوازا۔ ان شاء اللہ ان سب امور کا ذکر عنقریب کیا جائے گا۔

منہج چہارم: فساد ملک ارض یا فساد ملک

دور اول

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ہر ناکامی اور شکست کے بعد ابلیس کا طریقہ کار رہا ہے کہ وہ سابقہ منہج کو تبدیل کر کے اور ایک نئے منہج کے ساتھ پھر معرکہ خیز دشر کے میدان میں جنگ کو آگے بڑھاتا ہے۔ دوسری جانب اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ ہر حثیت عظیم کے بعد آدم قوی تر ہوئے اور ابلیس کمزور تر۔ آدم کے قوی تر ہونے سے مراد ہے ان کی حیثیت کا حالت ارضی سے ترقی کرنا اور حالت الجنہ سے قریب تر ہونا جانا اور ابلیس کے کمزور تر ہونے سے مراد ہے اپنے دعوے کے اعتبار سے اس کی زمینی یا واقعاتی حقائق (Ground Realities) کا کمزور تر ہو جانا۔

طوفان نوح کے بعد ابلیس نے جو منہج اختیار کیا تھا وہ منہج فساد ملکوت حکمی، فساد فی توحید اللہ یا فساد شرک تھا جس کا مفہوم ہے:

’جو ملک کا مالک ہے وہ ملکوت کا مالک ہے‘

یہ منہج بالآخر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں تباہی کا شکار ہو کر درہم برہم ہو گیا۔ ابلیس کے منہج کی اسی تباہی نے دو نتائج برآمد کئے:

(۱) آدم کی حیثیت مزید بحال ہو گئی۔

(۲) ابلیس کی واقعاتی صورتحال مزید کمزور ہو گئی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے ہاتھوں اس وقت آدم کی حیثیت کی بحالی کی حقیقی صورتحال کیا تھی؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ بحالی انقلابی بحالی تھی جس کے درج ذیل عواقب اور مضمرات مرتب ہوئے۔

(۱) حضرت ابراہیم کی اس جست نے آدم کو روئے ارض سے ہمیشہ کے لئے نکال کر الجنہ کی اس حالت میں پہنچا دیا جہاں حضرات آدم و حوا گناہ سے قبل تھے یعنی روحانی اور طبعی ہر دو شعبوں کا قصور و فساد ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

(۲) اس جست سے بحالی حیثیت کا مرحلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا اور ترقی و ارتقاء کا وہ مرحلہ شروع ہوا جو اس وقت الجنہ میں جاری رہتا اگر آدم و حوا سے غلطی سرزد نہ ہوئی ہوتی۔ یعنی گناہ کے سبب جس طویل زمینی سفر کا آغاز ہوا تھا وہ ختم ہو گیا۔

اسی طرح ابلیس کی واقعاتی صورتحال میں مزید کمزوری اور انحطاط آ گیا۔ ہر چند کہ اس کی ہمتا کی اور شدت جنگ بڑھ گئی لیکن اب وہ پہلے کے مقابلے میں کمتر سطح پر اور کمتر امور کے لئے جنگ آزما ہو رہا تھا۔ یہ جدا بات ہے کہ اس کی یہ جنگ اسی عنوان کے تحت ہو رہی تھی اور زیادہ بھیاں طریقت سے ہو رہی تھی جسے 'معرکہ خلافت' کہا جاتا ہے۔ اس بات کی تشریح و توضیح ایک اور طریقے سے کی جاسکتی ہے۔ یہ ابلیس کا انتخاب اور Prerogative ہے کہ وہ 'معرکہ خیر و شر' یعنی 'معرکہ خلافت' کے لئے کسی جنگ چھیڑے، کن ہتھیاروں سے اور کن میدانوں میں جنگ کرے۔ چنانچہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ بنی آدم سے ابلیس کے اس منتخب کردہ یا اختیار کردہ منہج کو سامنے رکھ کر میثاق لیتا ہے اور میثاق کا پورا کرنا یہ ہے کہ ابلیس کے اسی اختیار کردہ طریقہ جنگ، زیر استعمال ہتھیاروں اور اسلحوں اور اس کے منتخب کردہ میدان میں اسے شکست دی جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں شکست کھانے اور منہج فساد ملکوت حکمی کی تباہی کے بعد ابلیس نے جو منہج اختیار کیا وہ تھا منہج فساد ملک جس کا مفہوم تھا:

'جو زمین کا مالک ہے وہ ملک کا مالک ہے'

یعنی یہ 'منہج فساد ملک' ماقبل کے 'منہج فساد ملکوت حکمی' کے مقابلے میں کمتر اور چلی سطح کا منہج تھا لیکن اپنی شدت، وسعت اور ہمہ گیر شمولیت کے اعتبار سے زیادہ خطرناک تھا۔ ابلیس کے اس نئے منہج کی حقیقت اور اس کی روح کیا تھی؟

غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ منہج فساد ملکوت حکمی کی تباہی سے اس 'معرکہ خیر و شر' کا عملاً خاتمہ ہو گیا جسے اپنی وسعت کے اعتبار سے کائناتی 'معرکہ' کہا جاسکتا ہے۔ ہر چند کہ ابلیس اب بھی وہی کائناتی لڑائی لڑ رہا تھا لیکن اب پوری کائنات میں اسکی فوج اور اس کی صفیں برہم ہو چکی تھیں۔

اور اس کی بچی کبھی لڑائی کا میدان لے دے کر بس روئے زمین کی ایک مخصوص صورتحال رہ گئی تھی۔ چنانچہ آدم کی اس چوتھی جست کے بعد اور حیثیت آدم کے ماقبل گناہ کی صورت میں الجھنے میں بحالی کے ساتھ ہی اس جنگ کا آغاز ہوا جسے آپ کئی ناموں سے پکار سکتے ہیں:

(۱) معرکہ فساد ملک: The Conflict of Perversion of Authority

(۲) معرکہ ملکیت زمین: The Conflict of Proprietorship of the Land

(۳) معرکہ حقیقت زمین: The conflict of Authority on Earth

(۴) معرکہ حقیقت برائے انسان: The Conflict of Authority on Man kind

اس نئے منہج کے ساتھ اب لڑائی، خلافت اللہ، کی نہیں بلکہ، ملکیت زمین، حقیقت زمین اور حاکمیت بر زمین، کی لڑائی یعنی خلافت اللہ کی نہیں بلکہ امامت ماس کی لڑائی بن گئی۔ ہر چند کہ ابلیس یہ لڑائی اپنے سابق دعویٰ خلافت کے عنوان سے ہی لڑ رہا تھا لیکن اس کی واقعی صورتحال (Ground Realities) بدل چکی تھی۔ اس منہج کی بنیاد یہ تھی کہ 'ملک' (Authority) کس کا ہے؟

ابلیس نے اس فساد کی نہاد اس پر رکھی کہ جو زمین کا مالک ہے یعنی جس کا زمین پر قبضہ ہے وہی ملک (Authority) کا مالک ہے۔ زمین اس کی ہے اور اس زمین اور اس کے اندر اور اسکی فضا میں پائی جانے والی ہر چیز پر اسی کا اختیار ہے یہاں تک کہ اس زمین پر بسنے والی انسانی آبادی کا وہی حاکم اور مالک ہے۔ چنانچہ قانون اسی کا چلنا چاہئے۔ مختصر ابلیس کے اس نئے منہج فساد کی روح اس میں مضمر تھی کہ جس کے قبضہ میں زمین ہے 'ملک' (Authority) اسی کا ہوتا ہے یعنی

'جو زمین کا مالک ہے وہی ملک کا مالک ہے'

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم کامیابی اور اس کے نتیجے میں ابلیس کے ذریعہ تبدیلی منہج کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی آدم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے توسط سے ایک نیا میثاق لیا۔

یہ میثاق بڑا معنی خیز تھا۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَإِذَا بَتُلَىٰ اِبْرٰهٖمَ رَبِّہٖ بِکَلِمٰتٍ فَاْتَمٰہَنۡ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا
(البقرہ ۱۲۴)

ترجمہ: اور جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے کلمات سے تو اس نے انہیں پورا کر دیا تو (اس کے رب نے) کہا کہ بے شک میں (اب) تم کو بناؤں گا انسانوں کا امام۔

یہی وہ میثاق ہے جس کا ذکر سورہ الاحزاب آیت ۷ میں کیا گیا ہے۔ اللہ رب العزت کو خوب معلوم تھا کہ ابلیس نے منہج فساد و ملکوت میں ناکامی کے بعد منہج فساد و ملکوت حکمی کا آغاز کیا تھا اور اب اس کی ناکامی کے بعد اس نے جس منہج کے رو بہ عمل لانے کا ارادہ کیا ہے اس کا مطلب کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ ابلیس اس کے تحت پوری روئے زمین پر لڑائی کی آگ بھڑکانے والا ہے۔ یہ لڑائی زمین پر قبضہ اور اس پر ملک یعنی اتھارٹی (Authority)، قوت حاکمہ اور قوت نافذہ کی لڑائی ہو جائے گی۔ اس لڑائی کے ذریعہ ابلیس کو یاسیہ ثابت کرنا چاہے گا کہ زمین کا اصلی خلیفہ وہی ہے۔ چنانچہ یہ لڑائی زمین کی لڑائی، زمین پر قبضہ کی لڑائی، زمین پر حکم چلانے کی لڑائی، زمین پر قانون نافذ کرنے کی لڑائی، ملک، ملک کے مرکز قوت، ملک کے حدود، ملک کی قوت نافذہ، ملک کے مالک اور ملک کے تناظر میں نافذ کردہ قانون سے انکار کرنے والوں کی لڑائی کی صورت اختیار کر لے گی۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے اسی تناظر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے توسط سے تمام بنی آدم سے میثاق لیا:

’ملک اللہ کا ہے۔ اور کوئی اس کا شریک نہیں۔‘

’الملك لله‘ ان الحمد والنعمة والملک لا شریک لک‘

حضرت ابراہیم علی بنینا الصلوٰۃ والسلام نے اس میثاق کو قبول فرمایا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس قبولیت کے بعد تفویض فرمائی:

انی جاعلک للناس اماما (البقرہ ۱۲۴)

ترجمہ: بے شک میں بنانے والا ہوں تجھ کو انسانوں کے لئے امام۔

حضرت ابراہیم نے اس عظیم ذمہ داری کے اٹھانے کے لئے ہمت، طاقت اور مدد کی دعا فرمائی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک عظیم بشارت سے سرفراز فرمایا:

فبشرنه بعلام حلیم (الصفات ۱۰۱)

ترجمہ: پھر خوش خبری دی ہم نے اس کو ایک نخل والے لڑکے کی۔

چنانچہ حضرت ابراہیم نے نئے میثاق کے تحت ابلیس کے منہج فساد ملک کی بیخ کنی کی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ اس وقت آپ کی عمر شریف پچاسی سال سے تجاوز کر گئی تھی۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہدیٰ کے مطابق آپ نے کام کا آغاز کیا۔ ابتداءً یہ کام دو روہ (Two - Pronged) تھا جو چند ہی سالوں میں سہ روہ (Three-Pronged) شکل اختیار کر گیا۔

اقامت ملک

جب حضرت اسمعیل علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر شریف چھیاسی سال ہو چکی تھی۔ آپ نئے میثاق کے تحت اس عمر میں اقامت ملک اللہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی پھر آزمائش کی۔ اس بار اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ حضرت ابراہیم معرکہ خیر و شر کے اس مرحلے کے مرکز خیر کی تعمیر کے لئے کمر بستہ ہو جائیں اور اس کے لئے ایک عظیم قربانی پیش فرمائیں۔ اور وہ قربانی تھی آئندہ معرکہ ملک کے مرکز کی تعمیر کے لئے اس اگلو تے بچے کو جسے حضرت ابراہیم نے چھیاسی سال کی عمر میں پایا تھا اللہ کے حوالے کر دینا۔ چنانچہ حکم ملتے ہی آپ حضرت ہاجرہ اور شیر خوار حضرت اسمعیل علیہما السلام کو لیکر الخلیل سے ہزاروں میل دور جنوب میں صحرائے عرب میں وہاں تشریف لے گئے جہاں آج کعبۃ اللہ ہے۔ اس وقت وہ علاقہ لاکھوں مربع کیلومیٹر پر ایک لقمہ و دق صحرا تھا جہاں انسانی آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔

تفویض الی اللہ تعین بیت اور تسکین ذریت

حضرت ابراہیم ملک شام سے سفر کر کے اس لقمہ و دق صحرا میں پہنچے اور زمین پر اقامت ملک اللہ کا آغاز فرمایا۔ آپ اپنی لونڈی حضرت ہاجرہ اور ان سے اپنے واحد لخت جگر حضرت اسمعیل علیہما السلام کو اس صحرا میں جہاں کسی انسان کا وجود نہ تھا اللہ کے حکم سے اللہ کے حوالے کر کے واپس ملک شام روانہ ہو گئے۔ عزیمت کے اس عدیم النظیر اور دل دہلا دینے والے واقعے کی جو تصویر کشی بخاری کی ایک حدیث میں ملتی ہے وہ قابل ذکر ہے:

فرمایا عبداللہ بن عباس نے: عورتوں میں سب سے پہلے حضرت ہاجرہ نے کمر پٹہ باندھا۔ ان کی غرض یہ تھی کہ حضرت سارہ ان کا سراغ نہ پائیں (کہ وہ حمل سے ہیں)۔ پھر حضرت ابراہیم حضرت ہاجرہ اور انکے بچے (اسمعیل) کو (صحرائے عرب میں اس مقام پر) لے آئے (جسے آج مکہ کہتے ہیں)۔ حضرت ہاجرہ حضرت اسمعیل کو دودھ پلاتی تھیں۔ حضرت ابراہیم نے ان دونوں کو ایک بڑے درخت کے تلے بٹھا دیا جو اس مقام پر تھا جہاں زمزم ہے مسجد کے بلند جانب میں۔ اس وقت مکہ میں آدمی کا نام و نشان نہ تھا۔ نہ وہاں پانی موجود تھا۔ حضرت ابراہیم نے دونوں کو وہاں بٹھا دیا اور انکے پاس ایک تھیلہ کھجور اور ایک مشکیزہ پانی کا رکھ دیا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ حضرت اسمعیل کی والدہ (حضرت ہاجرہ) ان کے پیچھے لپکیں اور پکارا اے ابراہیم! ہم دونوں کو اس وادی میں چھوڑ کر جہاں نہ آدم زاد ہے نہ کوئی چیز۔ تم کہاں جا رہے ہو؟ کئی بار حضرت ہاجرہ نے پکار پکار کر کہا لیکن حضرت ابراہیم نے (جواب دینا تو کجا) مڑ کر دیکھا تک نہیں۔ آخر حضرت ہاجرہ نے ان سے پکار کر پوچھا:

’کیا اللہ کا ایسا ہی حکم ہے؟‘

(تب) حضرت ابراہیم نے جواب دیا: ہاں!

تب حضرت ہاجرہ نے کہا پھر تو پروردگار ہمیں ہلاک نہیں کرنے کا۔ یہ کہہ کر حضرت ہاجرہ لوٹ آئیں۔ اور حضرت ابراہیم آگے بڑھ گئے۔ جب وہ اس پہاڑی پر پہنچے جہاں سے وہ دونوں دکھائی نہیں پڑتے تھے تو آپ نے ادھر رخ کیا جہاں لب کعبہ ہے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کی: اے پروردگار! میں نے اپنی ذریت کو ایک بے آب و گیاہ وادی میں تیرے محترم بیت کے پاس لایا ہے۔ پروردگار، یہ میں نے اس لئے کیا کہ یہ لوگ صلوٰۃ قائم کریں لہذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کو پھل دے شاید کہ یہ شکر گزار بنیں۔

(بخاری: کتاب بدء الخلق)

اس طرح حضرت ابراہیم نے اللہ کے حکم سے ابلیس کے منہج فساد ملک کے قلع قمع کے

لئے تین اقدامات فرمائے جو درج ذیل ہیں:

(۱) تفویض الی اللہ: چنانچہ حضرت ابراہیم نے اپنی واحد اولاد حضرت اسمعیل کو شیر خوارگی کی حالت میں اس لقمہ و دق صحرا میں اللہ کے حوالے کر دیا۔ حضرت اسمعیل کو شیر خوارگی کی

حالت میں لوق و دق صحرا میں چھوڑ دینا ایک قسم کا ذبح اور قربانی تھی۔ اسے اس طرح سمجھا جائے کہ اگر حضرت جبرئیل تشریف نہ لاتے اور زندگی کا سامان نہ کرتے تو گویا حضرت اسمعیل مر جاتے۔ اب اس صورت میں ان کی زندگی کا جو سامان ہوا اور اس سے قبل حیات کا جو فیضان ہوا وہ گویا ایک نئی زندگی تھی اس طرح دراصل حضرت اسمعیل کو ایک نئی زندگی ملی۔ اس زندگی کی سطح پہلی زندگی کی سطح نہیں تھی۔ بلکہ آپ عالم بشریت میں ہوتے ہوئے حیات کے اعتبار سے عالم عصر میں آ گئے۔ نوع آدم کی حیثیت میں یہ ایک عمودی چھلانگ (Vertical Jump) تھی ۱۸

(۲) تعین بیت محرم: وہ مقام جہاں حضرت ابراہیم نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمعیل کو صحرا کے بچوں کی طرح چھوڑا تھا اور جہاں آج کعبۃ اللہ ہے وہ مقام روئے ارض پر حضرت آدم و حوا کی آباد کاری کے وقت ہی بیت اللہ محرم بنادیا گیا تھا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں کے بعد میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسرئ اور پھر معراج ہوئی۔ یہ وہی جگہ ہے جو زمین پر سیدھی عرش کے نیچے ہے۔ حضرت ابراہیم نے فساد ملک کے قلع قمع کے لئے روئے ارض پر اس بیت محرم کو مرکز اور راجدھانی قرار دیا۔

(۳) تسکین ذریت: اس مرکز زمین کو معرکہ فساد ارض میں حق کی راجدھانی اور روئے ارض پر اللہ کے ملک کی علامت قرار دینے کے لئے حضرت ابراہیم نے اس کی تعمیر کا آغاز فرمایا اور اس کے پہلے اقدام کے بطور آپ نے اپنی ذریت کو وہاں بسا کر اللہ کے حوالے کر دیا۔

(۴) تلقین حرا: اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی اس عظیم قربانی اور عزیمت کو شرف قبول بخشا اور آپ کی چھوڑی ہوئی ذریت پر اس کے فضل عیم کا آغاز ہوا۔ یہ فضل عیم دراصل مرحلہ فساد ملک کی جنگ میں ابراہیم کی پیش کش کی قبولیت پر ظاہر ہونے والی ایک آیت باہرہ تھا جس کا ظہور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوا۔ اس آیت باہرہ کے ظہور کو تعین و تلقین حرا کہا جاتا ہے۔ 'حراء' روئے ارض پر اللہ تعالیٰ کا وہ فضل خاص ہے جو صرف حضرت ابراہیم اور حضرت ہاجرہ کی عزیمت اور خود سپردگی کے سبب پورے بنی آدم پر ہوا۔ اس کا مفہوم ہے وہ مقام جہاں اللہ اپنے بندے کو مستقل دیکھتا ہے اور اس کی زندگی کی اسے ضمانت دی جاتی ہے 'روئے ارض پر حرا' کا مقام اس فضل خاص سے بھی بڑھ کر ہے جو حضرت نوح علیہ السلام پر طوفان سے قبل نصرت خاص کی صورت میں ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

واصنع الفلک باعیننا ووحینا (ہود ۳۷)

ترجمہ: اور بنا کشتی میری نگاہوں کے سامنے اور میری وحی کے مطابق۔

اس فضل خاص کی منظر کشی کرتے ہوئے حدیث شریف میں آیا تھا:

’ادھر حضرت ہاجرہ کا یہ حال گزرا کہ وہ حضرت اسمعیل کو دودھ پلاتی اور مشک میں سے پانی پیتی رہیں۔ جب پانی ختم ہو گیا تو خود بھی پیاسی ہوئیں اور بچہ کو بھی پیاس لگی۔ بچہ کو دیکھا تو وہ پیاس کے مارے تلے اوپر ہو رہا تھا۔ (بچے کی یہ تڑپ) ان سے دیکھی نہیں گئی۔ قریب ہی صفا پہاڑ تھا وہ اس پر چڑھ گئیں شاید کوئی آدمی نظر آئے (تاکہ اس سے پانی مانگیں) لیکن کوئی دکھائی نہیں دیا۔ وہاں سے اتریں اور اپنا کرتہ سمیٹ کر دادی کے نشیب میں اس طرح دوڑیں جیسے کوئی مصیبت زدہ دوڑتا ہے۔ دادی کے پار جا کر مروہ پہاڑ پر چڑھیں وہاں بھی دیکھا کوئی آدمی نظر نہیں آیا۔ سات چکر انہوں نے اسی طرح مارے۔ ابن عباس نے کہا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی سبب سے لوگوں نے صفا مروہ کا پھیرا (حج میں) شروع کیا۔ جب (ساتویں پھیرے میں) مروہ پر چڑھیں تو انہوں نے ایک آواز سنی۔ اپنے آپ کہنے لگیں چپ رہ! پھر کان لگایا تو وہی آواز سنی۔ اس وقت پکار اٹھیں (خدا کے بندے) میں نے تیری آواز سنی تو کچھ ہماری مدد کر سکتا ہے تو کر۔ پھر دیکھا تو جہاں زمزم ہے وہاں ایک ملک (حضرت جبریل) کھڑا ہے۔ انہوں نے اپنی ایڑی یا پنکھہ مار کر زمین کھود ڈالی یہاں تک کہ پانی نکل آیا۔ حضرت ہاجرہ حوض کی طرح اس کو بنانے لگیں، ہاتھ سے اس کے گرد منڈیر کر کے لگیں اور پانی چلو سے لے لے کر مشک میں بھرتی جاتی تھیں۔ جوں جوں پانی بھرتی جاتی تھیں وہ چشمہ اور جوش مارتا۔ حضرت ابن عباس نے کہا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اسمعیل کی والدہ پر رحم کرے! اگر وہ زمزم کو اپنے حال پر چھوڑ دیتیں یا یوں فرمایا اگر وہ چلو بھر بھر کر (مشک میں پانی) نہ لیتیں تو زمزم ایک بہتا چشمہ رہتا۔ خیر حضرت ہاجرہ نے پانی پیا اور اپنے بچے کو بھی پلایا فرشتے (حضرت جبریل) نے ان سے کہا: لا تخافوا الضیعة فان ههنا بیت اللہ یبنی هذا الغلام وابوہ فان اللہ لایضیع اہلہ۔ (بخاری: کتاب بدء الخلق)

حضرت جبریل کا قول لا تخافوا الضیعة ہی تلقین حرا ہے۔ یہ فیضان صرف یہی نہیں کہ حضرت اسمعیل کے جان بچا لینے کی بشارت تھا بلکہ انہیں ایک نئی زندگی عطا کرنے کی بھی بشارت تھا۔

روح کے اعتبار سے حضرت اسمعیل کے جسم بشری میں جو روح تھی وہ مدرج اشیاء میں نفس تھی اور اب وہ اس عارض ہونے والی موت سے جس سے انہیں بچا لیا گیا تھا لوٹ کر مدرج عصر میں جسے عالم صورت بھی کہا جاتا ہے متمکن ہو گئی تھی ۱۹

اقامت ذبح عظیم

اقامت ذبح عظیم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ عظیم الشان عزیمت اور شہادت حق ہے اور بنی آدم پر ایسا احسان عظیم ہے جس کے بوجھ کو عالم انسانیت کبھی اتار نہیں سکتا۔
'ذبح عظیم' کیا تھا اور کس طرح اس کا ظہور ہوا؟ قرآن نے اس کی بڑی واضح تفصیل بتائی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَبْنٰى اُنٰى اَرٰى فِى الْمَنَامِ اُنٰى اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى. قَالَ يٰبٰتِ اَفْعَلْ مَا تَوْمَرُ سَتَجِدَنِىْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ. فَلَمَّا اَسْلَمَا وَتَلَّهٖ لِّلْجَبِيْنَ وَنَادٰىہٗ اَنْ يَّا بَرٰہِیْمُ قَدْ صَدَقْتَ الرَّءْیَا اَنَا کَذٰلَکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ. اِنْ هٰذَا لَهٗوَ السُّلُوْا الْمَبِیْنِ وَفَدِیْنِہٖ بِذَبْحٍ عَظِیْمٍ وَتَرَکْنَا عَلَیْہِ فِی الْاٰخِرِیْنَ سَلٰمٌ عَلٰى اِبْرٰہِیْمَ. کَذٰلَکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ اِنَّہٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ (الصافات ۱۱۱-۱۰۲)

ترجمہ: وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوز دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیم نے اس سے کہا: بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں اب تو بتا تیرا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا: ابا جان! جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالئے، آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔ آخر کو جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو ذبح کر دیا اور ہم نے ندادی کہ اے ابراہیم تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزاء دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔ اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دیکر اس بچے کو چھڑا لیا۔ اور اس کی تعریف و توحیف ہمیشہ کے لئے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی۔ سلام ہے ابراہیم پر۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزاء دیتے ہیں۔ یقیناً وہ ہمارے مؤمن بندوں میں سے تھا۔

اس 'ذبح عظیم' کو اس سے زیادہ بلیغ طور پر بیان نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے

کہ حضرت ابراہیم کو اللہ رب العزت نے خواب میں ذبح کی طرف کیوں متوجہ کیا؟ حضرت ابراہیم نے اسے پورا کیوں کر دیا؟ حضرت اسماعیل ذبح ہونے پر راضی کیوں ہو گئے؟ اس ذبح سے کائنات میں کیا ہوا؟ اور سب سے آخر میں یہ بات کہ یہ ذبح عظیم کیسے ہے؟

ان سارے سوالوں کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ ہم یہ بات جانیں کہ جب حضرات آدم و حوا گناہ سے قبل الجنہ میں تھے تو ان کا وجود دو چیزوں پر مشتمل تھا (۱) پہلی۔ روح اور دوسری (۲) جسم عنصری۔ وہاں حضرات آدم و حوا سے اللہ تعالیٰ کی یہی رضا تھی کہ وہ الجنہ سے ترقی کر کے مقام محمود تک پہنچیں۔ سوء اتفاق ان سے گناہ سرزد ہو گیا جس نے ان کی روح اور جسم دونوں کو مجروح کر دیا۔ یہ گناہ ایک ہم کی طرح تھا جس کے انجبار نے روح اور جسم کے پر خچے اڑا دیئے۔ بہت کچھ روح میں منہدم ہو گیا تو بہت کچھ جسم عنصری میں منہدم ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں دونوں جگہ بہت سی خرابیاں اور نقائص پیدا ہو گئے۔

ہم لوگوں نے اب تک اس کی کسی قدر تفصیل دیکھی ہے کہ کس طرح اس روز سے اس وقت تک آدم نے اپنی حیثیت کی بحالی کی جدوجہد کی ہے۔ حضرت ابراہیم نے اس بحالی اور ترقی کی رفتار میں انقلاب لا دیا۔ یہی وہ احسان عظیم ہے جس کے بوجھ سے نوع آدم بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اس گناہ کے سبب الجنہ میں حضرات آدم و حوا کے وجود میں انجبار ہوا تو ان کے الگ الگ نتائج برآمد ہوئے جو درج ذیل ہیں:

(۱) روح اور اس میں واقع ہونے والے انہدام:

(۱) الجنہ میں حضرات آدم و حوا کی روح عالم عصر میں تھی وہ گر کر اس زمین پر عالم اشیاء میں نفس کی پابند ہو گئی یعنی نفخ نفس میں بدل گئی۔

(۲) الجنہ میں گناہ سے قبل آدم و حوا کا روحانی سفر عالم عصر سے عالم بریہ کی

طرف تھا اور اسے مزید آگے جا کر عالم اصل یعنی مقعد صدق تک پہنچنا تھا۔ اب اس کی سطح مزید نیچے گر کر عالم اشیاء پر چلی آئی لہذا روئے ارض پر اس کا روحانی سفر دراصل عالم اشیاء سے عالم عصر کی طرف ہو گیا۔ اور چند لوگوں کو چھوڑ بقیہ لوگوں پر یہ سفر بھی دشوار تھا اس لئے کہ جسم پر روح کو حاوی کرنا اور اسے مزید اوپر لے جانا اس تو سب کے بعد سب کے لئے آسان نہیں رہ گیا تھا۔

(۳) نفخ کا مقام سر سے اتر کر ریڑھ کی ہڈی کے نچلے سرے پر آ کر ٹھہر گیا۔

(۲) جسم اور اس میں واقع ہونے والے انہدام:

(۱) جسم پر سب سے پہلا اثر یہ مرتب ہوا کہ جسم کی پوشش ختم ہو گئی۔

(۲) جسم کا بنیادی خلا اپنے دوسروں پر مخرج میں بدل گیا یعنی ایک طرف منہ،

ناک، کان اور آنکھیں اور دوسری طرف دونوں شرمگاہوں کے مقامات پھٹ کر کھل گئے اور باہر کی طرف نکل آئے یعنی (Protrude) ہو گئے اس طرح الجھنے کے سابقہ آدمی جسم میں جوارح پیدا ہو گئے۔

(۳) جسم کے اندر ایک اور انفجار ہوا اور ایک اور خلا پیدا ہو گیا جس میں ایک ایسی

جن (Anti-gen) داخل ہو گئی۔ یعنی خون کی رگیں اور شریان اور سب سے اہم دل، جگر اور پھیپھڑے اور ان کے اندر بہتا ہوا خون۔ الجھنے میں یہی خون وہ ایسی جن (Anti-gen) ہے جو ابلیس کے ذریعہ جسم آدم و حوا میں داخل کیا گیا۔ (اغلب گمان ہے کہ جب حضرت آدم سے حضرت حوا پیدا کی گئیں تو دونوں کے جسم متصل تھے لہذا کوئی ایک ہی جسم تھے۔ تھوڑے عرصے کے بعد یہ دونوں جسم کلیتہً الگ الگ ہو گئے۔)

یہی وہ انفجار تھا جس نے ایک طرف تو انسانی جسم کو دو ہم برہم کر کے رکھ دیا اور دوسری جانب اب الجھنے اس کو برداشت کرنے کی اہل باقی نہیں رہ گئی۔

چنانچہ اس روئے زمین پر روح کی بحالی سے مراد یہ بات تھی کہ روح عالم اشیاء سے الجھنے کے مقام عالم عصر میں منتقل ہو جائے اور مقام روح ریڑھ کے نچلے حصے سے سر (سر سے مراد وہ مقام ہے جہاں الجھنے میں موجود جسم آدم و حوا میں نفخ تھی) کے مقام پر منتقل ہو جائے۔ اور روح کی ترقی یہ ہے کہ بحال ہونے کے بعد وہ عالم عصر سے عالم بریہ اور اس سے آگے جا کر عالم اصل کی طرف عروج کرنے لگے۔

اسی طرح زمین پر رہتے ہوئے جسم کی بحالی یہ تھی کہ جسم آدم اسی ارض پر رہتے ہوئے ان تینوں نتائج کا ازالہ کر لے جو گناہ کے سبب برآمد ہو گئے تھے۔ یہ ازالہ ان کی ہیت، اعمال،

نتائج اور مضمرات کے راستے سے ممکن تھے اور ان سب کی اپنی اپنی علامتیں قرار پائیں۔

چنانچہ روحانی بحالی کی ایک روداد تو ہم نے حضرت ابراہیم سے قبل دیکھی۔ حضرت ابراہیم نے حضرت اسمعیل کو لوق و دق صحرا میں چھوڑ کر دراصل پہلی قربانی دیکر پہلی پاکی حاصل کر لی۔ یہ پاکی اسی طرح حاصل ہوئی جیسے گناہ کے بعد پاکی حاصل کی جاتی ہے۔ مثلاً الجنہ میں ہی اللہ تعالیٰ قابیل کے حمل کو ضائع کر دیتا اور اس طرح حضرت حوا اس سے پاک ہو جاتیں۔ یا اسی طرح الجنہ میں ہی حضرات آدم و حوا کے گناہ اور اس کے اثرات مٹا دیئے جاتے۔ یا پھر اس طرح کہ زمین پر آدم و حوا کی روح عالم عصر سے عالم اشیاء میں انحطاط پزیر ہو گئی تھی اس قربانی سے وہ عالم اشیاء سے اٹھ کر پھر عالم عصر میں حالت الجنہ میں بحال ہو گئی ہو۔ دونوں صورت حال کا انجام ایک ہی ہے۔

اس ذبح عظیم کے ذریعہ حضرت ابراہیم نے روح کی بحالی ہی نہیں کی بلکہ اس سے آگے جا کر اسکی ترقی کے سفر کا آغاز کیا اور اس ذبح کے ذریعہ عالم عصر میں بحال روح عالم بریہ میں متمکن ہو گئی۔

یہ ذبح عظیم جسم آدم کو بھی پہلے بحال اور پھر ارتقاء پزیر کر کے وہاں لے گیا جو الجنہ میں سفر کی اگلی منزل تھی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اس گناہ کے سبب جسم میں دو خلا پیدا ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک خلا اوپر اور نیچے منہ اور شرمگاہوں کے مابین ہے اور دوسرا خلا اسی سے مربوط خون کی رگوں کا خلا ہے جس میں خون بھر گیا ہے۔ جہاں تک اوپر اور نیچے کے مابین خلا کا تعلق ہے تو اس پر بحث ان شاء اللہ اقامت ختنہ کے ذیل ہوگی۔ ہم یہاں صرف خون کی رگوں والے خلا کو زیر بحث لائیں گے۔

یہاں دو باتوں کا ذکر غور و فکر کرنے والوں اور بطور خاص آفاق و انفس میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے مزید آسانی کا باعث ہوگا۔

(۱) پہلی بات: بالکل ابتداء میں عرض کیا گیا تھا کہ الجنہ میں آدم و حوا کو صرف تین احکام دیئے گئے تھے گویا تین کام۔ دو کرنے کے ایک نہ کرنے کا۔ جب انحطاط کے سبب نوع انسانی زمین پر بھیجی گئی تو یہی تین کام تین لاکھ کاموں کی شکل میں تو سمیع دے دیئے گئے۔ لیکن اس میں بھی اگر خوب غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شریعت کے سارے احکام آدم و حوا کے جسم میں ہونے

والے بنیادی طور پر انہیں تین انفجارات اور ان کے عواقب سے ہی متعلق ہیں۔ طہارت، صلوٰۃ، صوم، حج، زکوٰۃ، فرائض کسی سے متعلق احکامات پر غور کر لیا جائے۔ گویا اگر یہ انفجار نہ ہوتا تو شریعت کی یہ توسیع بھی نہ ہوتی۔ غور کیا جائے تو شریعت کے اوامر و نواہی اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ وہ اس انفجار کے عواقب کو Contain اور Regulate کرنے کے لئے ہیں۔

(۲) دوسری بات: الجھنے کے جسم میں جو چیز آدم و حوا کے عمل یعنی عملی خلاف ورزی کے علاوہ ہوئی وہ باہر سے کسی چیز کا داخل ہو جانا تھی اور داخل کردہ چیز وہ تھی جس نے آج خون کی شکل لی ہے۔

مزید غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شریعت میں مذکور باب المظالم یعنی جنایات کی بنیاد خون ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ غور کرنے والا امر یہ ہے کہ ہر خون خواہ حلال جانوروں کا ہی کیوں نہ ہو وہ حرام ہے۔ اسی طرح خون اور اس کا قریب ترین متبادل دودھ ہر دو حرمت کی بنیاد آخر اس کی کنہ کیا ہے؟ اس پر غور و فکر اس بحث کو مزید واضح کر دے گا ان شاء اللہ۔ اس ذبح عظیم کی حقیقت جاننے کے لئے ضروری ہے کہ اس زمین اور خون کی حقیقت اور ان کے مابین تعلق پر غور کیا جائے۔

شریعت کی نظر میں روئے ارض پر شرک کے علاوہ تین عظیم ترین گناہ ہیں: قتل نفس، یوں تو روئے ارض پر قتل نفس کی متعدد شکلیں پائی جاتی ہیں لیکن ان سب کی بنیاد دراصل قتل ہے جس کا براہ راست تعلق سفک دم یعنی خون بہانے سے ہے۔ سانس کا رشتہ کسی طرح منقطع ہو، جسم میں خون، اس کے اعمال اور اسکے عواقب کے اثرات کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔

(۲) زنا: روئے ارض پر اس کی جو بھی صورتیں ہوں عمل زنا میں خون یا اس کے By-Product کی ایک جسم سے دوسرے جسم میں ناجائز منتقلی کا عمل ہوتا ہے۔

(۳) غصب: غصب حصول کی ناجائز صورت کو کہتے ہیں۔ خواہ کسی صورت میں ہو لا علمی میں چوری ہو یا زبردستی چھین لیا یا اس کی کوئی اور صورت ہو۔ ہم طول بحث سے بچنے کے لئے غصب سے سر دست صرف نظر کرتے ہیں یا مان لیتے ہیں کہ اس کا تعلق حکمی ہے اور اس طرح عینی نہیں جیسا قتل نفس اور زنا کا ہے۔ اس صورت میں ہم باسانی دیکھ سکتے ہیں کہ شریعت میں جنایات کی بنیاد خون ہے۔ اور ان میں بھی سب سے بڑے جرم کی شکل میں اگر کوئی عمل ہے تو وہ

سفک دم یعنی قتل ہے۔ چنانچہ قرآن نے فرمایا:

من قتل نفسا بغير نفس اور فساد فی الارض فکا نما قتل الناس جميعا
(المائدہ ۳۲)

ترجمہ: جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلا عوض جان کے یا بغیر فساد کرنے کے زمین میں تو مگو یا قتل کر ڈالا اس نے سب لوگوں کو۔

یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ زمین پر سفک دم کے تعلق سے اللہ تعالیٰ کی رضا کیا ہے جس کی عملی صورت شریعت اسلامیہ پیش کرتی ہے؟

(۱) اسلام چاہتا ہے کہ روئے ارض پر انسانی خون ناجائز طور پر قطعاً نہ بہایا جائے۔ ناجائز طور پر خون بہانے سے مراد ہے 'بغیر نفس و فساد' کے علاوہ صورتوں سے خون کا بہانا۔ چنانچہ روئے ارض پر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ خون کا بہانا نقطہ صفر (Reduction to the Zero Level) پر لادیا جائے۔

غور کیا جائے تو روئے ارض پر خون کا بہانا عملیت کے اعتبار سے صرف تین راستوں سے نقطہ صفر پر لایا جاسکتا ہے۔

(۱) صرف فساد کے زیر کرنے کے لئے خون بہایا جائے۔

(۲) قصاص لینے کے لئے خون بہایا جائے۔

(۳) دیت کے ذریعہ اس کا کفارہ ادا کیا جائے۔

فساد کا زیر کرنا خالص اسلامی بیت حاکمہ میں محض ایک خارجی عمل ہے یعنی جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ فساد کا زیر کرنا جس میں مؤمنین اور ذمی شامل نہیں۔ ملک اللہ یا حکومت عادلہ میں خالص اندرونی عمل پورا کا پورا یا تو قصاص پر مشتمل ہے یا دیت پر۔ پوری انسانی تاریخ میں روئے ارض پر وہ معاشرہ جہاں ناجائز طور پر خون بہانے کو محض دعویٰ اور پروپیگنڈا کے بطور نہیں بلکہ حقیقی طور پر بالکل Mathematical Zero پر پہنچا دیا گیا ہو صرف عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ کا معاشرہ ہے۔ لہذا عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ کی ایک تعریف یہ بھی ہو سکتی ہے: 'وہ عہد جس میں روئے ارض پر سفک دم کو صفر پر پہنچا دیا گیا ہو۔ اب اللہ کی رضا کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ دو چیزیں پسند کرتا ہے۔ جو ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں:

(۱) روئے ارض پر نا جائز طور پر خون کا بہانا (سفک دم) کم ترین درجے تک یعنی صفر کے درجہ تک لا دیا جائے۔

(۲) روئے ارض پر تطوعاً خون کا بہانا (Voluntary Spilling of Blood) یعنی انسان محض اللہ کی رضا کے لئے خود اپنا وہ خون بہا کر جو الجحیم کے اینٹی جن کا مابقیہ ہے اور اپنی جان دیکر جو اللہ کی امانت ہے شہادت حاصل کرے۔ یعنی وہ جان حاصل کرے جو الجحیم کی اعلیٰ ترین جان اور حیات ہے۔ نفس سے بنی جان دے کر نفس مطمئنہ سے بنی جان حاصل کرنا ہے۔

یہ ایک ہی سکے کے دو ورخ ہیں۔ چنانچہ پہلے کی خلاف ورزی پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس نے ایک جان نا جائز طور پر لی اس نے گویا پوری انسانیت کا قتل کیا۔ اور دوسری طرف اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ کہلوا دیا کہ جس شخص میں شہادت کی موت کی تمنا نہ ہو وہ مومن نہیں۔

اس کے برعکس ایک اور منظر بھی ہے۔ روئے ارض پر انسان کے بسائے جانے کے بعد سے اب تک بلا فصل ابلیس کی یہ کوشش رہی ہے کہ:

(۱) روئے ارض پر نا جائز طور پر خون کا بہانا (سفک دم) بدترین حد تک بڑھا دیا جائے یعنی خون ریزی کو صد فی صد مقام پر لا دیا جائے۔ ابلیس کی اصلی خواہش یہ ہے کہ روئے ارض پر ہر طرف خون ہی خون ہے اور ہر جان خون ریزی کے ذریعہ ختم ہو۔

(۲) اسی طرح ابلیس کی دوسری خواہش یہ ہے کہ روئے ارض پر تطوعاً خون بہانے کو یعنی شہادت کی موت مرنے کو کم ترین سطح یعنی صفر پر لا دیا جائے۔ اس کی انتہا یہ ہے کہ بعض اوقات کفار ابلیس کی ہدایت کے مطابق کسی مومن کو موت کی سزا صرف اس لئے نہیں دیتے کہ کہیں وہ شہید نہ ہو جائے اور روئے ارض پر ایک ایسی جان کا اضافہ نہ ہو جو درجہ شہادت پا چکی ہو۔ آخر اس کا راز کیا ہے؟

سفک دم ہو یا خون کی نا جائز منتقلی یعنی زنا یہ ابلیس کے فساد کو بڑھاتی ہے اور آدم کے مقام کو نیچے گراتی ہے یا اوپر بحال ہو کر ترقی حاصل کرنے نہیں دیتی ہے۔ جب کہ اسی خون کو تطوعاً روئے ارض پر گرا دینا حیثیت آدم کو بلند کرنا ہے۔ خون کا تطوعاً گرانا اس لئے بلندی عطا کرتا ہے کہ انسان صرف اسی خون کا امانت دار ہوتا ہے جو اس کی اپنی رگوں میں بہہ رہا ہے۔

شہادت کی اصلی روح یہ نہیں ہے کہ ہیبت ناک سے ہیبت ناک اسلحوں سے جنگ کی جائے اور اللہ کے باغیوں کا مقابلہ اسلحوں کی برتری سے کیا جائے اور انہیں زیادہ سے زیادہ مارا جائے یا انہیں شکست فاش دی جائے۔ یہ سب باتیں شہادت کی بنیاد نہیں۔ شہادت کی بنیاد تو صرف اپنی رگوں میں بہتے ہوئے اس خون کو جو دراصل ابلیسی فساد کا ایک مابقہ ہے اور اس مومن کے جسم کو لاحق ہے صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے بہا دیا جائے۔ کفار کی شکست اور ان کا زیاں محض اللہ کے انعامات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء نے اسلحوں کی دوز کی روایت قائم نہیں کی بلکہ ساری دنیا کے سامنے قاہر سے قاہر فوج کے مقابلے میں صرف اللہ کی رضا کے لئے تطوعاً خون بہانے کو آمادہ افراد تیار کئے۔ وہ افراد جو اس راز کو جانتے ہیں کہ روئے ارض پر خود اپنی رگوں کا خون بہانا صرف اس انسان کو ہی نہیں جس نے اپنی رگوں کا خون شہادت بنا بہایا ہے بلکہ پورے نوع آدم کو بلند یوں کے گہن مقام عالی پر لے جاتا ہے۔ شہادت کے جذبے سے سرشار نفوس قدسیہ کو 'دہشت گرد' کہنا دراصل ابلیس کے اس پرو پگندے کا حصہ ہے جس کے تحت اس کی کوشش ہوتی ہے کہ روئے ارض پر ایک قطرہ خون بھی شہادت نہ بنے۔ اسی میں ابلیس کی فتح ہے۔ اسی طرح اس کی کوشش ہے کہ روئے ارض پر ناجائز خون جتنا بہایا جاسکے بہتر ہے۔ مثلاً قتل عام، رحم مادر میں جنین کا بڑے پیمانے پر خاتمہ اور دیگر طریقوں سے قتل عام۔ چنانچہ تاریخ میں **Weapon of Mass Destruction** کو ایجاد کرنے والے ہمیشہ روئے ارض پر وہی لوگ ہوئے جو ابلیس کے آگے کار تھے۔ اس مقام پر اگر اس نکتے کو سمجھ لیا جائے تو ترقی آدم کا اصلی راز سمجھ میں آجائے گا۔ چنانچہ دین اللہ کے اصول ملاحظہ فرمائیں:

- (۱) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنی اولادوں کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔۔۔
 - (۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خوب اولادیں پیدا کر دین چاہتا ہوں کہ میری امت زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہو۔ اور حشر کے میدان میں وہ سب سے کثیر تعداد پر مشتمل ہو۔
 - (۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص شہادت کی تمنا نہ کرے وہ مومن نہیں۔
- آخر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ان باتوں سے کیا مراد ہے؟ کیا درج ذیل کے علاوہ کوئی اور بات مراد ہو سکتی ہے؟

(۱) اللہ کے رسول چاہتے ہیں کہ پیدا ہونے والے مقدر افراد کی زیادہ سے

زیادہ تعداد مومن پیدا ہو یا کم از کم یہ کہ مومن پشت میں محفوظ کوئی اولاد روئے ارض پر پیدا ہونے سے نہ رہ جائے۔

(۲) صد فی صد مومن شہادت پائیں یا اگر ایسا ان کے مقدر میں نہیں تو ایسی نیت رکھنے کے سبب وہ شہیدوں میں شمار ہوں۔ یہ بات معلوم و مشہور ہے کہ انسان مرنے کے بعد انہیں لوگوں میں اٹھایا جائے گا جس کا اس کے اندر میلان ہوگا۔

اس کے برخلاف ابلیس یہ چاہتا ہے کہ روئے ارض پر یا تو اولاد آدم کم سے کم پیدا ہو یا جو پیدا ہو وہ مومن پیدا نہ ہو اور اس دنیا میں پیدا ہونے والے زیادہ سے زیادہ افراد ناجائز موت میں مارے جائیں اور اگر کوئی ناجائز موت سے نہ مرے تو کم از کم شہادت کی موت نہ مرے۔

یہ ہے وہ راز جس کے بعد اس ذبح عظیم کا سمجھنا کسی قدر آسان ہو جائیگا۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمعیل علیہما السلام ہر دو نے اپنی جانب سے تطوعاً اپنا خون بہایا۔ یہ خون اس روئے ارض پر بہایا گیا لیکن جو خون بہادہ عالم اشیاء کا خون نہیں تھا۔ حضرت اسمعیل اپنی پہلی موت (شیرخوارگی میں) میں عالم اشیاء سے عالم عصر میں منتقل ہو چکے تھے۔ چنانچہ ان کی روح ذبح کئے جانے کے وقت میں نفس کی حالت میں نہیں بلکہ نفخ کی حالت میں تھی۔ اور جب نفخ کی حالت میں وہ خون پیش کیا گیا تو لازماً حیثیت آدم عالم عصر سے عالم بریہ میں صعو و کبر گئی۔ یہ بحالی نہیں بلکہ پہلی عظیم ترقی تھی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اس عظیم قربانی کو قبول فرمایا اور حضرت اسمعیل کو فد یہ قرار دے دیا۔

اے کاش اس مقام پر اتنی گنجائش ہوتی کہ 'فد یہ کیا ہے؟' کی تشریح کی جاسکتی۔ لیکن اس سوال کو سب سے درست نظر انداز کرنا ہی احسن ہے۔ چنانچہ فد یہ قرار دینے کے بعد حضرت اسمعیل ہر چند کہ اس روئے زمین پر ایک انسان کی طرح زندہ رہے لیکن دراصل وہ الجنہ میں گناہ سے قبل کی حالت سے بھی مرتفع حالت میں اور وہ بھی عالم بریہ میں خیر البریہ کے مقام پر فائز ہو چکے تھے۔ یہی وہ راز ہے جس کی طرف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کیا تھا کہ میں دو ذبح کی نشانی ہوں۔ اور اس سے آگے بڑھکر یہی وہ ذبح ہے جس کے لئے خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو پیش فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے دن ۱۰ اونٹوں کی قربانی پیش فرمائی۔ سو (۱۰۰) اونٹ کسی جان کی سب سے قیمتی دیت ہے۔ اور فد یہ ہے۔ گویا خود آنحضور

صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے دن اسی طرح کی قربانی پیش فرمائی۔ کیا عجیب کہ اس دن آدم عالم بریہ سے ترقی کر کے عالم اصل میں مقعد صدق کے نزدیک پہنچ چکے ہوں۔ یعنی حجۃ الوداع کے اس دن خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات محمد اور روح محمد مقعد صدق میں داخل ہو چکی ہو۔ شہادت روح انسانی کو الجنہ کی حالت پر یا اس سے بھی آگے لے جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ احادیث میں آیا ہے کہ شہید بغیر حساب و کتاب کے جنت میں جائے گا یعنی شہید ایسا ہی ہے گویا اس پر روئے ارض کی تکلیف ساقط ہو جائے۔ گویا وہ الجنہ میں ہی تھا اب یا وہاں رہے یا اس سے بھی آگے جائے۔ اس لئے قرآن نے فرمایا ہے:

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ
(البقرہ ۱۵۴)

ترجمہ: اور نہ کہو ان کو جو قتل کئے گئے اللہ کی راہ میں کہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم کو خبر نہیں۔ موت تو نفس پر طاری ہوتی ہے جو عالم اشیاء کی صورت روح ہے۔ جب کوئی عالم اشیاء سے نکل گیا تو پھر اب اس کی روح پر موت طاری نہیں ہو سکتی۔ شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

اقامت ختنہ

اقامت ختنہ سے مراد اقامت ازالہ غرل یا اقامت ازالہ قلفہ کرنا ہے۔ اقامت ختنہ حضرت ابراہیم علی نبینا الصلوٰۃ والسلام کی وہ انکی عظیم الشان عزیت ہے جو اقامت ذبح عظیم کی طرح ہی حیثیت آدم کی بحالی میں ایک انقلاب ثابت ہوئی۔ غرل یا قلفہ سے نجات امتثالاً دراصل حیثیت آدم میں انقلابی بحالی ہے۔

اقامت ذبح عظیم کے ذیل میں عرض کیا گیا تھا کہ الجنہ میں گناہ کے سبب روح کی طرح آدم و حوا کے جسم میں بھی ایک انفجار ہوا تھا جس نے جسمانی نظام میں انہدام و فساد کی صورت اختیار کر لی تھی۔ جس کی کم از کم تین جہتیں تھیں

(۱) جسم کے اوپری غلاف کے تعلق سے۔

(۲) جسم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک واقع خلا (Tran-Corpus)

(Passage) کے دونوں سروں پر انہماج رفق (Rapture) اور باہر کی طرف ابھار (Protruding) کے تعلق سے۔

(۳) متوازی خلا کے بننے اور اس میں خون نامی مضاد جسم (Anti-gen) کے دخول کے تعلق سے۔

یہی انہدام اور فسادات روئے ارض پر بیشتر تکلیف یا تکلیفات شرعی کے باعث ہوئے۔ اس کا ذکر بھی کیا جا چکا ہے۔ اگر صرف یہ فرض کر لیا جائے کہ الجنہ میں یہ تینوں نتائج برآمد اور متعلقہ اثرات مرتب نہ ہوتے تو اس صورت میں روئے ارض میں بیشتر تکلیفات شرعی کا وجود نہ ہوتا۔ ان تمام تکلیفات شرعی طہارت، عبادات، زکوٰۃ، حج، فرائض اور جتنائیاں پر نظر ڈال لی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس صورت میں یا تو ان کا وجود نہ ہوتا یا یہ تکلیفات ہزاروں درجہ کم ہو جاتیں۔

اقامت ختنہ ایک اقامت بھی ہے اور ایک انعام بھی۔ انعام کی صورت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کی اللہ رب العزت کے سامنے کامل سپردگی کا ہی نتیجہ اور صلہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو اجازت مرحمت فرمائی کہ وہ اقامت ختنہ فرمائیں یعنی ان کے توسط سے اور ان کی عزیمتوں کے سبب بنی آدم کی حالت الجنہ قبل گناہ کو بحال کر دینے کا فیصلہ ہوا۔ ختن کا کیا مفہوم ہے؟

جسم کے ایک مخصوص عضو کے ایک حصے کو کاٹ کر الگ کر دینا اصطلاحی معنی ہے جس کی بذاتہ کوئی حیثیت نہیں تا وقتیکہ اس کے اصلی معنی کا تناظر نہ ہو۔ ختن کا اصلی مفہوم ہے:

(۱) کسی نو جوان کا بالغ ہونا

(۲) کسی نو جوان کا شادی کے لائق ہونا

(۳) کسی نو جوان کو داماد بنانا

اور اسی سے لڑکی کا باپ ختن اور خوشدا من ختنہ اور داماد ختن کہلاتے ہیں۔ قدیم زمانے میں اس عمل کو یوں کیا جاتا تھا کہ جب کوئی شخص اپنی لڑکی کی شادی کسی شادی کے لائق نو جوان سے کرنا چاہتا تو وہ اس نو جوان کا ختنہ کرتا تھا۔ یہی عمل دراصل شادی کا عمل قرار پاتا۔ چونکہ کسی نو جوان کو داماد یعنی اسی عمل کے ذریعہ بالغ، لائق شادی اور داماد بنایا جاتا تھا اور یہ عمل کرنے والا

لڑکی کا باپ ہوتا تھا اس لئے اس مخصوص حصے کو کاٹ کر الگ کر دینے کو ختنہ کہا گیا۔ بعد میں اصلی معنویت باقی نہیں رہی لہذا اب ختنہ صرف ایک عضو کے مخصوص حصے کو کاٹ ڈالنے کو ہی کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے دراصل الجنہ میں گناہ کے انجبار اور اس کے نتیجے میں واقع ہونے والے فسادات کے ازالے کی علامت کے بطور اس حصے کا انقطاع اور اس راستے سے خون کے بہانے کا حکم فرمایا۔ اس کی تفہیم اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ اس عمل کے ذریعہ عالم مثال میں آدم و حوا کے جسم کو عمل جراحی کے ذریعہ ان نقائص اور ابھار سے پاک کر دیا گیا ہے جو گناہ کے انجبار کے نتیجے میں ان میں پیدا ہو گئے تھے۔ جب آدم و حوا الجنہ میں گناہ سے قبل تھے تو

(۱) نہ ان کا لباس اترتا تھا

(۲) نہ ان کے جسم کے پتھوں بیچ موجود خلا کے دونوں سروں پر مخرج کا وجود تھا

اور نہ ان مخرجوں کے پاس ابھار تھا۔

(۳) نہ اس خلا کے متوازی کوئی اور خلا تھا نہ اس میں خون (دم) جیسی کوئی

Anti-gen باہر سے داخل ہوئی تھی۔

جب گناہ کے بعد الجنہ میں یہ صورتیں پیدا ہو گئیں اور ان کے نتائج برآمد ہونا شروع ہو گئے تو ان دونوں کو وہاں سے منتقل کر دیا گیا۔ اب جب کہ انہوں نے اپنی حیثیت بحال کر لی اور اس کے مستحق ہو گئے کہ انہیں الجنہ میں دوبارہ واپس لایا جائے تاکہ وہ اگلے سفر کو از سر نو جاری کریں تو ان آلائشوں اور نقائص کے ساتھ انہیں بحال نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ ان عزیزوں کے نتیجے میں آدم حیثیت سابق میں بحال ہونے کا مجاز مستحق ہو گیا تو حضرت ابراہیم کو حکم دیا گیا کہ وہ اس جسم پر ایسا عمل جراحی کریں تاکہ آدم کا جسم الجنہ میں ماقبل گناہ کی حالت میں بحال ہو جائے۔ تاریخ آدم میں یہی اقامت ختنہ ہے۔ اور یہ حضرت ابراہیم کی اتنی بڑی عزیمت کا نتیجہ ہے کہ اسے ان کی عظیم الشان سنتوں میں سے ایک سنت قرار دیا گیا۔

یہی راز ہے اس حدیث مبارک کا جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع کلم کا ایک غیر معمولی نمونہ ہے۔ یہ حدیث اس روئے ارض پر روح دین، حقیقت شریعت، حقیقت معرکہ خیر و شر، حقیقت فتنہ ابلیس، حقیقت لغزش آدم اور سرنجات سب کی گتھیوں کو کھولنے والی ہے۔ اس

عاجز کے نزدیک اس حدیث کا یہ مقام ہے کہ اگر امام بخاری اسے اپنی صحیح میں درج پہلی اور دوسری حدیث کے درمیان درج فرماتے تو صحیح کا مرتبہ اور بلند ہو جاتا۔ حدیث مبارک ہے:

عن سهل بن سعد عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال : من يضمن لي ما بين لحييه وما بين رجليه اضمن له الجنة (البخاری : حفظ اللسان : کتاب الرقاق)

ترجمہ : روایت کیا حضرت سهل بن سعد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے : (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) فرمایا : جو شخص ضمانت دے اس چیز کی جو اس کے دونوں جبروں کے بیچ میں ہے اور جو اس کے دونوں پاؤں کے بیچ میں ہے تو میں اس کے لئے الجنہ کی ضمانت دیتا ہوں۔

اقامت صلوة یا اقامت ملک اللہ

آدم کی حیثیت کی بحالی اور اس کی جسمانی و روحانی تقویت کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے روئے ارض پر اس عظیم مہم کا آغاز کیا جس کا مقصد 'منہج ابلیس' یعنی 'منہج فساد ملک' کا خاتمہ کرنا تھا۔ اس منہج کے تحت ابلیس روئے ارض پر جس بھی ملک معرکے کا آغاز کرنے والا تھا اس کے اندر پوری زمین میں انسانوں کے مابین ایک ایسی کشمکش کا آغاز ہوتا جس کی بنیاد 'ملک' ہوتا یعنی:

'جو زمین کا مالک ہے وہی ملک کا مالک ہے'

حضرت ابراہیم کو اللہ تعالیٰ نے جس 'بدی' سے نوازا تھا اس کے ذریعہ آپ بخوبی واقف ہو گئے تھے کہ اس عنوان سے ابلیس روئے ارض پر کیسی کیسی جنگیں اور کیسی کیسی تباہیاں لانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ آنے والے دنوں میں روئے ارض پر:

(۱) ملک یعنی اتھارٹی کے استحقاق کی جنگ Conflict of the

Prerogative of Authority

(۲) ملک یعنی اتھارٹی کے استعمال کے استحقاق کی جنگ Conflict of the

Prerogative of the Use of Authority

(۳) ملک یعنی اتھارٹی کے سبب احتساب کے استحقاق کی جنگ Conflict

of the Prerogative of the Accountability on account of Authority

کی ایسی گرم بازاری ہوگی جس کے سبب انسانی حیات اور اس کی حرمت پامال ہو کر رہ جائے گی۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے 'منہج فساد ملک' کے خلاف اللہ تعالیٰ اور ان کے مابین ہوئے میثاق کی تکمیل کا باضابطہ آغاز فرمادیا۔ اس عنوان کے تحت آپ نے اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے تحت چار عظیم الشان عزیمتوں کا ثبوت دیا جسے ہم ذیل میں اقامت صلوٰۃ، اقامت دین اللہ، اقامت بیت اللہ اور اقامت حج کے تحت زیر بحث لائیں گے۔

صلوٰۃ کیا ہے؟ اس کا کیا مفہوم ہے؟

عہد خلافت راشدہ کے بعد علوم اسلامی میں جو بڑے بڑے فساد برپائے گئے ان میں سے ایک فساد عظیم صلوٰۃ کے موجودہ مشہور و معروف مفہوم کی اشاعت ہے۔ (اس بحث اور تقریر کا موقع یہاں نہیں اس لئے اس سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔) چنانچہ اس فساد انگیزی کے تحت صلوٰۃ کا مفہوم مطلقاً دعا کرنا اور نماز پڑھنا مشہور کیا گیا ہے۔ اس عاجز کو نہیں معلوم کہ یہ مفہوم کہاں سے آیا؟ کہاں سے لیا گیا؟ کس نے لیا اور ان کے دلائل کیا ہیں؟

چودھویں صدی ہجری کے ایک مشہور لغت نویس نے 'صلوٰۃ' کا مفہوم درج کرتے ہوئے لکھا:

- (۱) صلی، صلاۃ: دعا و اقام الصلاۃ (دعا کرنا، نماز پڑھنا)
- (۲) صلی اللہ علیہ: باریک علیہ واحسن علیہ الشاء. برکت دینا۔ اچھی تعریف کرنا)
- (۳) الصلاۃ او الصلوۃ بالواو: ارتقاء العقل الى الله لكي نسجد له ونشكره ونطلب من الله الدعاء، التسبیح (دعاء، نماز، منہج)
- (۴) الصلاۃ من الله: الرحمة والثناء على عباده ج صلوات (رحمت)

((۱) لوئس معلوف: المنجد فی اللغة (۲) مولانا عبد الحفیظ بلیاوی: مصباح اللغات)

حیرت ہے کہ ایک ہزار سال قبل عربی کے سب سے پہلے باضابطہ معجم نویس ابن درید کو یہ معانی معلوم نہ تھے چنانچہ دیگر معانی کے علاوہ جو قریب ترین اور متعلق مفہوم اس نے درج کیا

ہے وہ درج ذیل ہے:

(۱) والصلاة من الواو وتجمع صلوات قال بعض اهل اللغة اشتقاقها من رفع الصلافي السجود (الصلوة واو سے جس کی جمع صلوات ہے۔ بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ وہ سجدہ کرتے ہوئے پیٹھ کے اٹھانے سے مشتق ہے)

(ابو بکر محمد بن الحسن بن درید الازدی البصری: کتاب جمهرة اللغة: متوفی ۳۲۱ ہجری: جلد ۳) جو حضرات مفسرین و محدثین اور بالخصوص ثقہ اور محقق حضرات کے طرز اظہار کو گہرائی سے جانتے ہیں وہ خوب سمجھتے ہوں گے کہ ابن درید کا کہنا: قال بعض اهل اللغة: سے کیا مراد ہے؟ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کا یہ ایک المناک باب ہے کہ ایک گہری سازش کے تحت صلوٰۃ کے اس معنی سے جو عربی مبین کے مطابق اس کے معنی ہیں پوری امت کو محروم اور صلوٰۃ کی حقیقت کو مجھ ب کر کے رکھ دیا گیا۔ یہ محض ہماری کوتاہیوں اور کمزوریوں کے سبب نہیں ہوا بلکہ ابلیس کی ایک بڑی سازش کے تحت ہوا جس کے ہم کم ذمہ دار نہیں۔ صلوٰۃ معروف عربی لغت ہے ہی نہیں یہ تو عربی مبین میں ایک اہم اور معنویت کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کا حامل لفظ ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھکر یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ یہ لفظ صرف عربی مبین کا ہی حصہ نہیں بلکہ بیان کا بھی حصہ ہے۔ چنانچہ عربی مبین میں اس کے معنی ہیں:

(۱) طاقت، قوت، قوت نافذہ، قوت حاکمہ، قوت مبہمنہ

(۲) طاقت حاصل کرنا، ظاہر کرنا، ثابت کرنا، قوت نافذہ اور قوت حاکمہ کا اظہار کرنا، قوت مبہمنہ کا مظاہرہ کرنا

(۳) قوت نافذہ، قوت حاکمہ اور قوت مبہمنہ کے اظہار کے لئے مرئی و محسوس مظہر متعین و قائم کرنا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو حکم فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے 'ملک' (Authority) کو قائم فرمائیں اور اس کے لئے مرئی و محسوس مظہر کی اقامت کریں۔

اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم پر ایک اور فضل فرمایا اور وہ یہ کہ ان کی اقامت مقام کو تو وسیع دیکر اسے ایک طرف تو عام کر دیا اور دوسری طرف اسے ہی 'مظہر ملک' کی حیثیت سے قبول فرمایا۔

چنانچہ حضرت ابراہیم نے روئے ارض پر ابلیس کے 'فساد ملک' کے خلاف پہلا باضابطہ حملہ اس طرح فرمایا کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے 'ملک' کی اقامت کا اعلان فرمادیا اور اس اعلان کے لئے صلوٰۃ قائم فرمائی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بندے کے ذریعہ عبادت و عبادیت کا اظہار 'قیام' ہے۔

یہی گہرا راز اور فرق 'یا یہا المزمل قم الیل الاقلیل' (المزمل) اور 'یا یہا المدثر قم فانذر' (المدثر) میں پوشیدہ ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتداء صرف 'حکم قیام' ہوا تھا چنانچہ آپ نے 'اقامت مقام' فرمائی۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آپ اب باضابطہ اس کام کا آغاز کر دیں جس کے لئے آپ 'بعوث' فرمائے گئے تھے تو آپ کو حکم ہوا کہ 'قم فانذر'۔ قم فانذر وراصل 'اقامت صلوٰۃ' کا حکم ہے۔ اور ظاہر ہے اس حکم کے بعد اس حکم کی تعمیل کے لئے جتنی چیزیں ضروری ہو گئی ہیں ان کا کرنا لازم آئے گا۔ چنانچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام لوازم کو پورا کرنے کا آغاز فرمایا۔ اسی جگہ اس آیت کا راز بھی چھپا ہوا ہے جس کا ذکر حضرت ابراہیم کے تذکرے میں 'اقامت مقام' کے ذیل میں آچکا ہے:

واتخذوا من مقام ابراہیم مصلیٰ (البقرہ ۱۲۵)

ترجمہ: اور بنا لو ابراہیم کے (مقاموں میں) سے (اس) مقام کو (روئے ارض پر مرکز و منظر) 'ملک اللہ'۔

'مصلیٰ' وراصل وہ مقام ہے جہاں کھڑے ہو کر مامور من اللہ ذریعہ ذیل امور کا اظہار کرتا ہے:

(۱) وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے اور اس کا قلب اور اسکی زبان اور اس کے جوارح اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ روئے ارض کو صرف اللہ کی ملک سمجھتا ہے اور اس پر صرف اس کے 'ملک' کو تسلیم کرتا ہے اس کے علاوہ کسی اور کے 'ملک' کے ہر دعوے کو رد کرتا ہے۔

(۲) وہ اس بات کا اقرار ہی نہیں بلکہ اعلان بھی کرتا ہے اور اس کا قلب، اسکی زبان اور اس کے جوارح اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ روئے ارض صرف اور صرف اللہ کی ملک ہے اور وہ کسی دوسرے کے ملک ہونے کو علانیہ رد کرتا ہے۔

(۳) وہ اس مقام پر کھڑے ہو کر ساری دنیا کو اس بات کے اقرار اور اعلان کے لئے بلاتا

ہے کہ پوری روئے ارض صرف اللہ کا 'ملک' ہے۔

(۴) وہ اس مقام کو ساری روئے زمین پر اللہ کے ملک کا اعلان کرنے، گواہی دینے، اس کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کے لئے 'مرکز' بناتا ہے (پوری روئے زمین پر پھیلے مصلے اسی مقام ابراہیم پر قائم مصلی کے تابع اور توارد یا ردف ہیں)

(۵) وہ اس مقام کو پوری روئے زمین پر قائم 'ملک اللہ' (The Authority of Allah) کا 'مظہر' (Symbolic Seat of Allah's Power on Earth) قرار دیتا ہے۔

ابھی اس عاجز نے 'صلوٰۃ' کے مفہوم کی وضاحت میں یہ سوال کیا تھا: "صلوٰۃ کا مفہوم دعا کرنا اور نماز پڑھنا مشہور کیا گیا تھا۔ اس عاجز کو نہیں معلوم یہ مفہوم کہاں سے آیا؟ کہاں سے لیا گیا؟ کس نے لیا؟ اور ان کی دلیل کیا ہے؟" تو اس کا یہ سوال بے جا نہیں۔

بھلا سوچنا چاہئے کہ روئے ارض پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے زیادہ واضح طور پر 'صلوٰۃ' کا مطلب کون سمجھتا ہوگا۔ تو جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلا عظیم فیصلہ فرمایا اور اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک کی بات رد کر دی اور فرمایا:

والله لا قاتلن من فرق بين الصلوة والزكوة۔

ترجمہ: خدا کی قسم! جو الصلوٰۃ اور الزکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں ان سے لڑ کر رہوں گا۔ تو آخر اس کا مفہوم کیا تھا؟ واضح رہے کہ یہاں محققین ان سے لڑ کر رہوں گا کا مطلب صرف یہ لیتے ہیں کہ یا تو ان کے خلاف جنگ کر کے اور انہیں شکست دیکر مجبور کروں گا کہ وہ حضرت ابوبکر خلیفہ رسول اللہ کو زکوٰۃ ادا کریں یا پھر اس لڑائی میں اپنی جان دے دوں گا۔ پھر آپ نے فرمایا:

والله لو منعوني عناقاً كانوا يؤدوا لي رسول الله صلى الله عليه

وسلم لقاتلتهم على منعها۔

ترجمہ: خدا کی قسم! اگر یہ لوگ ایک بکری کا بچہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے مجھ کو نہ دیں گے تو میں ان کے نہ دینے پر ان سے ضرور لڑوں گا یعنی قتال کروں گا۔

سوچنا چاہئے کہ آخر زکوٰۃ نہ دینا یا زکوٰۃ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نہ دینا ایسی کیا

بات تھی کہ حضرت ابوبکر نے یہاں تک کہہ دیا کہ یا تو لے کر رہوں گا یا زکوٰۃ کی وصولی کی لڑائی میں اپنی جان دے دوں گا۔ اور پھر یہ بھی سوچنا چاہئے کہ روئے ارض پر حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ الصلوٰۃ کا مطلب سمجھنے والا کون ہوگا جنہوں نے پہلے تو حضرت ابوبکر پر یہ اعتراض فرمایا:

’کیف تقاتل الناس وقد قال رسول الله صلى الله عليه وسلم امرت ان اقاتل الناس حتى يقولوا لا اله الا الله فمن قالها فقد عصم مني ماله ونفسه الا بحقه وحسابه على الله‘ (بخاری کتاب الزکوٰۃ)

ترجمہ: آپ ان لوگوں سے کیسے لڑیں گے جب کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: مجھے لوگوں سے لڑنے کا اسی وقت تک حکم ہے کہ لا الہ الا اللہ کہیں جب یہ کہنے لگیں تو انہوں نے اپنے مال اور جان کو مجھ سے بچا لیا البتہ کسی حق کے بدل پر یہ اور بات ہے۔ اب ان کا حساب اللہ پر ہے۔

لیکن جب حضرت ابوبکر نے وہ جواب دیا جو اوپر نقل کیا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ’قوالله ما هو الا ان قد شرح الله صدر ابي بكر فحرفت انه الحق‘ ترجمہ: پھر خدا کی قسم! اللہ نے ابوبکر کا سینہ کھول دیا تھا میں سمجھ گیا کہ وہ الحق تھا۔ آخر یہ معنی ہے کیا؟

حقیقت اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

(۱) کہ ہم ان لوگوں سے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر کو زکوٰۃ دینے سے انکار کر رہے ہیں کیسے لڑ سکتے ہیں اس لئے کہ وہ ایمان لا چکے ہیں اور ہمیں صرف ان کے خلاف لڑنے کا حکم یعنی جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو ایمان نہ لارہے ہوں اور اللہ کی بغاوت پر کمر بستہ ہوں۔ جہاں تک ان لوگوں کا معاملہ ہے جنہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو یہ ایمان پر قائم ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں۔

تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

(۱) زکوٰۃ کا نہ دینا یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان کے جانشین خلیفہ رسول اللہ ابوبکر کو زکوٰۃ نہ دینا دراصل الزکوٰۃ اور الصلوٰۃ میں فرق کرنا ہے یعنی اس ملک اللہ سے

بغاوت ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا تھا اور جس کی زمام کار اس وقت ان کے خلیفہ ابوبکر کے پاس ہے۔ الصلوٰۃ روئے ارض پر اللہ کا 'ملک' یعنی Authority ہے اور اس اتھارٹی کے نمائندہ ابوبکر ہیں لہذا ابوبکر کو زکوٰۃ نہ دینا دراصل اللہ کی اتھارٹی کا انکار اور اس کے خلاف بغاوت ہے۔

(۲) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایام میں ہی زکوٰۃ دینے سے انکار کرنا دراصل آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ قائم کردہ 'الحکم' یعنی 'ملک اللہ' کو ڈھا دینا تھا۔ جس کے قائم کرنے کے لئے ہی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے یعنی زکوٰۃ کا انکار دراصل آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت کے حاصل کو ڈھا دینا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ اس کی حفاظت کے لئے ابوبکر ضرور لڑائی کرے گا۔ اور اگر کوئی اس کا ساتھ نہیں دیتا جب بھی وہ تنہا جنگ کرے گا اور یا تو 'ملک اللہ' کے باغیوں کو شکست دے گا یا اس راہ میں اپنی جان دے دے گا اس لئے کہ روئے ارض پر انبیاء اور رسل کی بعثت کا جو مقصد اولین و آخرین ہے اور جس کے قائم رکھنے کا میثاق امت محمدیہ نے کیا ہے اور آج جس فیصلہ کن منصب پر ابوبکر فائز ہے اس 'ملک' Authority کو بچانا اور اسے قائم رکھنا اس کا مقصد حیات ہے۔ اس کے لئے تنہا نکل پڑنا اور اس کا زکے لئے ساری دنیا کے خلاف یک تنہا کھڑا ہو جانا حتیٰ کہ جان دے دینا کوئی بات ہی نہیں بلکہ حاصل حیات ہے۔

یہ ہے وہ بات جس کے سمجھ لینے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: انہ الحق وہ الحق تھا۔ یہ وہ برہان تھا جس کا فیضان اللہ ایسے نازک موقعوں پر انبیاء پر کیا کرتا تھا اور آج اس کا فیضان اس نے ابوبکر پر کیا ہے۔

حضرت عمر اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی بات تو بہر حال بعد میں آئے گی خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم الصلوٰۃ کی حقیقت پر کیا فرماتے ہیں وہ اس حدیث میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

عن عبد اللہ بن عمر وعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم : انہ ذکر الصلوٰۃ یوما فقال : من حافظ علیہا کانت لہ نوراً وبرہاناً ونجاة یوم القیامة . ومن لم یحافظ علیہا لم یکن لہ نور وبرہان ولا نجاة وکان یوم القیامة مع فرعون

وہامان وابی بن خلف۔

(اخرجه احمد وابن حبان والطبرانی کذا فی الدر المنثور للسيوطی وقال
الہیثمی رواہ احمد والطبرانی فی الکبیر والاوسط رجال احمد ثقات وقال
ابن حجر فی الزواجر اخرجه احمد بسند جید وزاد فیہ قارون ایضا مع
فرعون وغیرہ وکذا زادہ فی منتخب الكنز بروایۃ ابن نصر والمشکوۃ ایضا
بروایۃ احمد والدارمی والبیہقی فی الشعب وابن القیم فی کتاب الصلوۃ)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: آپ صلی اللہ
علیہ وسلم ایک دن الصلوۃ کا ذکر کرنے لگے۔ آپ نے فرمایا: جس نے اس کی حفاظت کی اس کے
لئے نور اور برہان ہوگا اور قیامت کے روز نجات۔ اور جس نے اس کی حفاظت نہیں کی اس کے
لئے نہ نور ہوگا نہ برہان اور نہ نجات اور وہ قیامت کے دن فرعون اور ہامان اور ابی بن خلف کے
ساتھ ہوگا۔

اس حدیث کی تشریح میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ فرعون و ہامان اور
ابی بن خلف روئے ارض پر ان لوگوں کے رہنما ہیں جنہوں نے اللہ کی اتھارٹی یعنی 'ملک اللہ' کو چیلنج
دیا تھا اور اس کے مقابلے میں اس 'ملک' کا انتساب اپنی طرف کیا تھا یا پھر ان لوگوں کا جو اس عمل
میں ان کے شریک و ہمراہ تھے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے روئے ارض پر اپنے 'قیام' کو وسعت دیکر 'صلوۃ'
قائم فرمائی۔ آپ نے اسی وقت جب کہ آپ کو یہ حکم دیا جا رہا تھا کہ اسمعیل کو اس لقمہ دوق صحر میں
اللہ کے حوالے کر دیا جائے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ عنقریب انہیں یا ان کی اولاد کو اقامت
صلوۃ کا حکم فرمائے گا۔ ایک اولوالعزم رسول کے لئے اس سے بڑے انعام اور خوشی کی بات کیا
ہوگی؟ لہذا آپ نے اس وقت اس احساس اور انداز سے کو دعا کی شکل دیدی اور اللہ تعالیٰ سے اس
فیضان کو مانگا۔ آپ نے فرمایا:

ربنا لیقیموا الصلوۃ (ابراہیم ۳۷)

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! یہ میں نے اس لئے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں الصلوۃ قائم کریں۔
اور اب جب کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کا باضابطہ حکم فرمادیا تو حضرت ابراہیم نے بلا تاخیر الصلوۃ

کوروئے ارض پر قائم فرمادیا اور دعا کی:

رب اجعلنی مقيم الصلوة ومن ذریتی ربنا وتقبل دعاء (ابراہیم ۴۸)
ترجمہ: اے میرے پروردگار مجھے الصلوٰۃ قائم رکھنے والا بنا اور میری ذریت سے بھی (ایسے لوگ اٹھا جو یہ کام کریں) پروردگار میری پکار سن لے۔

اقامت دین اللہ فی الارض، اقامت ملت ابراہیمی
اقامت ملک کے تعلق سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اگلی غیر معمولی عزیمت اور میثاق کی تکمیل کی صورت اقامت دین اللہ فی الارض ہے۔ چنانچہ آپ علیہ السلام نے اقامت صلوٰۃ کے بعد اقامت دین اللہ فی الارض فرمائی۔

اقامت دین اللہ فی الارض کا مفہوم سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ دین کا مفہوم واضح ہو۔ لفظ دین بنیادی طور پر دو حرفوں اور ایک صوتیہ پر مشتمل ہے۔ یہ دو حروف ہیں: دال اور نون۔ یہ لفظ بھی عربی معروف نہیں اور عربی مبین، اور بیان میں اس کے معانی درج ذیل ہیں:

(۱) وعدہ یا عہد کے پورا کرنے کی صورت، وجہ میثاق، صورت میثاق۔

(۲) نباہ۔

(۳) حکم، نظم، انتظام، فیصلہ، وہ اصلی اور کیفیاتی صورت یا ادارہ، حلقہ جس میں حکم و نظم کا نفاذ ہو۔ قانون کی اصل۔

(۴) ساتھ چلنے والی چیز، لازم آنے والی چیز۔

(۵) اتباع، حکومت، نافذہ۔

چنانچہ اسی لئے وہ علاقہ زمین جہاں یہ نظم قائم کر دیا جائے اسے مدینہ کہتے ہیں۔ یہی اصلی سبب ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت اور میثاق مدینہ کے بعد یثرب کے نام کے مدینہ کر دیئے جانے کا۔ جہاں تک مدینہ بمعنی شہر کے ہے تو اس معنی کا عربی مبین سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب لوگ اس کو تفسیر میں استعمال کر کے قرآن سمجھنا یا سمجھانا چاہتے ہیں (مثلاً سورہ الکہف آیت ۱۹ یا سورہ النجم ۲۸، القصص ۱۵، ۱۸، ۲۰ وغیرہ) تو قرآن ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ بیشتر عربی مبین اور لغت نویس حتیٰ کہ معجم لالفاظ القرآن کے مصنف نے بھی لفظ مدینہ کو دن، دان، دین کے ذیل میں نہ لکھ کرم کے تحت درج کیا ہے۔ علوم اسلامی میں

تحقیق کی کیا روایت، تاریخ اور عادت رہی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو جاتا ہے۔ تفویض تو اسے
چرخ گردوں تفویض۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علی نبینا الصلوٰۃ والسلام نے اقامت ملک کے لئے تفویض
الی اللہ، اقامت ذبح عظیم، اقامت ختنہ، یعنی اقامت ازالہ غزل، اقامت صلوٰۃ یعنی اقامت
ملک اللہ کے بعد اقامت دین اللہ فی الارض فرمائی۔ پوری روئے ارض پر اللہ تعالیٰ کے 'ملک'
(Authority) کو اس میثاق کی روشنی میں قائم کرنا دراصل اقامت دین اللہ فی الارض ہے۔
یعنی روئے ارض پر وہ انتظامیہ اور اس انتظامیہ میں وہ نافذ العمل قانون جو ملک اللہ کی ترجمانی
کرتے ہوں اور اس پر قائم، اس کو اپنے اوپر نافذ العمل رکھنے والے اور اس کا اتباع کرنے والے
افراد کے وجود کو حقیقی صورت دینا۔ اس لئے اقامت دین اللہ فی الارض کا دوسرا نام اقامت ملت
ابراہیمی بھی ہے۔ اسی ملت ابراہیمی کا دوسرا نام امت مسلمہ ہے۔ اس لئے کہ اس ملت ابراہیمی کا
شعار اسلام تھا۔ قرآن کا ارشاد ہے:

اذ قال له ربه اسلم قال اسلمت لرب العلمین (البقرہ ۱۳۱)

ترجمہ: یاد کرو جب اس کو کہا اس کے رب نے کہ حکم برداری کرتو بولا کہ میں حکم بردار ہوں تمام عالم
کے رب کا۔

حضرت ابراہیم نے اس اقامت دین اللہ فی الارض کئے جانے اور اسی کے لئے اپنی
ذریعت کے جن لئے جانے کی دعا کی تھی۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے اس کی اقامت ان کے ہاتھوں
فرمادی تو آپ نے اپنی ذریعت کو اس کی وصیت کی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کے لئے
پابند ہیں کہ روئے ارض پر اس اقامت دین اللہ کو قائم رکھیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

ووصی بها ابراہیم بنیہ و یعقوب بنیہ ان اللہ اصطفیٰ لکم الدین فلا
تموتن الا وانتم مسلمون (البقرہ ۱۳۲)

ترجمہ: اور یہی وصیت کر گیا ابراہیم اپنے بیٹوں کو اور یعقوب بھی کہ اے بیٹو بے شک اللہ نے چن
کر دیا ہے تم کو دین سو تم ہرگز نہ مرنے مگر مسلمان۔

حضرت ابراہیم نے ان تمام لوگوں کو جو اس ملت ابراہیمی کا حصہ ہو گئے تھے اللہ تعالیٰ
کی تلقین یا دلالی کہ اس روئے زمین پر کامیابی کی واحد صورت 'ملک اللہ اور اس پر قائم انتظامیہ'
کو تھامے رکھنا ہے۔ جو اسے چھوڑ دے گا یا اس میں ناکام ہو جائے گا وہ خسران کا سودا کرے گا۔

قرآن کا ارشاد ہے:

وَمَنْ يَرْغَبْ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ الْأَمْنِ سَفِهَ نَفْسَهُ وَلَقَدْ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا
وَأَنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ (البقرہ ۱۳۰)

ترجمہ: اور کون ہے جو پھرے ابراہیم کی ملت سے مگر وہی کہ جس نے احمق بنایا اپنے آپ کو اور
بے شک ہم نے ان کو منتخب کیا دنیا میں اور وہ آخرت میں نیکوں میں ہیں۔

اقامت بیت اللہ علی الارض

حضرت ابراہیم نے 'ملک اللہ' کی اقامت کی عظیم مہم کو آگے بڑھاتے ہوئے روئے
ارض پر اسی مقام کو جو بیت محرم تھا اللہ تعالیٰ کے حکم سے منتخب کر لیا تا کہ ابلیس کے منہج فساد ملک کے
مرحلے میں اسے 'ملک اللہ فی الارض'، دین اللہ فی الارض اور ملت ابراہیمی کا مرکز، نشان اور
علامت قرار دے کر اس کی تعمیر کریں تا کہ وہ مرکزی طور پر بھی مرکز قرار پائے۔ جس طرح کسی
مملکت میں ایک شہر ہوتا ہے جو ملک کی راجدھانی اور دارالسلطنت قرار پاتا ہے اور اس
دارالسلطنت میں ایک محل ہوتا ہے جو بادشاہ کا محل کہلاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح پوری روئے ارض
میں اللہ کا جو ملک قائم کیا گیا ہے اس کی راجدھانی مکہ ہے اور پھر اس راجدھانی میں بادشاہ کا محل
'بیت اللہ' قرار دیا گیا اور اس کی تعمیر کا حکم حضرت ابراہیم کو ہوا۔

چنانچہ حضرت ابراہیم نے حضرت اسمعیل علیہما السلام کو ساتھ لیا اور اس بیت اللہ کی
تعمیر فرمائی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے گئے اس حکم کی غرض و غایت کو
خوب سمجھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس 'بیت' کی تعمیر کیوں کرانا چاہتا ہے۔ اور اس کے بعد معرکہ
خیر و شر روئے ارض پر کیا صورت اختیار کرے گا اور اس صورت میں انہیں کیا کرنا ہے حتیٰ کہ وہ اس
عظیم ذمہ داری کو بھی خوب سمجھ رہے تھے جو ان کے توسط سے پورے بنی نوع انسان کے کاندھوں
پر آنے والی تھی۔

حضرت ابراہیم خوب جانتے تھے کہ پیش نظر مرحلے میں خیر و شر کی لڑائی 'فساد ملک' کے
تناظر میں روئے ارض پر 'ملک' (Authority) کے لئے لڑائی ہو جائیگی اور اس کا مرکز صرف
یہی نہیں کہ بیت اللہ قرار پائے گا بلکہ اب یہ لڑائی دراصل 'معرکہ بیت اللہ' کی صورت اختیار

کر لے گی۔ چنانچہ آپ نے دعا فرمائی:

واذیرفع ابراہیم القواعد من البيت واسمعيل ربنا تقبل منا انک انت
السمیع العلیم۔ ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریستنا امة مسلمة لک وارنا
مناسکنا وتب علینا انک انت التواب الرحیم۔ ربنا وابعث فہیم رسولا منهم
یتلو علیہم ایتک ویعلمہم اللکتاب والحکمة ویزکیہم انک انت العزیز
الحکیم (البقرہ ۹-۱۲۷)

ترجمہ: اور یاد کرو جب اٹھاتے تھے ابراہیم بنیادیں 'البيت' کی اور اسمعیل اور دعا کرتے تھے اے
پروردگار ہمارے! قبول کر ہم سے بے شک تو ہی ہے سننے والا جاننے والا۔ اے پروردگار
ہمارے! اور کر ہم کو حکم بردار اپنا اور ہماری اولاد میں بھی کر ایک امت فرمانبردار اپنی۔ اور بتلا ہم کو
ہمارے مناسک اور معاف کر ہم کو بے شک تو ہی ہے تو بے قبول کرنے والا مہربان۔ اے پروردگار
ہمارے! اور بھیج ان میں ایک رسول انہی میں کا کہ تلاوة کرے ان پر تیری آیتیں اور سکھلا دے
ان کو کتاب اور حکمت اور پاک کرے ان کو بے شک تو ہی ہے بہت زبردست بڑی حکمت والا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا بھی قبول فرمائی۔ حالات
واقعات کی ترتیب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کو جب بھی کوئی حکم دیا گیا
انہوں نے اسے پورا فرمایا اور پورا فرما کر ایک دعا کی اور وہ دعا قبول کر لی گئی اس لئے کہ وہ دعا خود
اللہ تعالیٰ کی رضا ہوتی تھی۔ یا اسے یوں کہا جاسکتا ہے کہ جب بھی حضرت ابراہیم کو کوئی حکم دیا گیا
انہوں نے اس کی غایت اور اللہ کی رضا کا اندازہ لگالیا اور اسی کو اپنی طلب بنا کر پیش کیا۔ چونکہ وہ
طلب ہی اللہ کی رضا تھی لہذا اسے اللہ تعالیٰ نے خوب خوب درجہ میں قبول فرمالیا۔ اللہ کی رضا اور
بندے کی رضا کا یہ انداز اور ایسا توافق حضرت ابراہیم کی ذات کے علاوہ شاید ہی کہیں اور نظر آتا
ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے جسم و جان کا ایک ایک بال اور ایک ایک عضو اللہ تعالیٰ کے لئے سراپا
نیاز تھا اور سپردگی کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیم واقعی اللہ رب العزت
کے لئے یکسو (حنیف) تھے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم نے اللہ تعالیٰ کی مرضیات کو سمجھتے ہوئے جہاں بیت اللہ کی تعمیر کی
وہیں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوئے:

واذ قال ابراهيم رب اجعل هذا بلدا آمنا وارزق اهله من الثمرات من آمن منهم بالله واليوم الآخر (البقرہ ۱۲۶)

ترجمہ: اور جب کہا ابراہیم نے اے میرے رب! بنا اس کو بلدا امن کا اور روزی دے اس کے رہنے والوں کو میوے جو کوئی ان میں سے ایمان لا دے اللہ پر اور قیامت کے دن پر۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی دعا قبول فرمائی جبکہ دراصل یہ خود اللہ رب العزت کی ہی مرضی تھی جو دعا کی صورت میں حضرت ابراہیم کی زبان مبارک پر جاری ہوئی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو آگاہ فرمایا کہ اس نے اس بیت اللہ کو درج ذیل مقام عطا فرمایا ہے:

(۱) مثابة للناس: اللہ تعالیٰ نے 'بیت اللہ' کو ساری روئے ارض کے تمام لوگوں کے لئے مثابة بنادیا ہے۔

(۲) امنا: اللہ تعالیٰ نے 'بیت اللہ' کو تمام مطیع مخلوقات کے لئے جائے امن قرار دے دیا ہے۔

لہذا اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اب اسی بیت اللہ کو مثابة للناس اور امنا بنادیا ہے اس لئے وہ اس جگہ کو 'مصلیٰ' بنالیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس طرح بیت اللہ کو روئے ارض پر آباد پوری انسانی آبادی کے لئے مصلیٰ قرار دے دیا۔

اقامت حج، اقامت مناسک یا اقامت تکمیل صلاۃ

'اقامت ملک' کی آخری کڑی اور ایک بڑی عزیمت کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ روئے ارض پر 'ملک اللہ' کو پوری طرح نافذ کر دیں۔ اور اس 'ملک اللہ' کا اعلان کر دیں اور دنیا کے تمام انسانوں کو اس 'ملک اللہ' کے مان لینے اور اس کا عملی اظہار کرنے یعنی 'صلوۃ' قائم کرنے اور 'صلوۃ الصلوات' یعنی 'الحج' ادا کرنے کی طرف بلائیں۔

روئے ارض پر ابلیس کے اس نئے منہج 'فساد ملک' کے خلاف یہ تھی حضرت ابراہیم کی وہ ارض گیر کوشش جو آپ نے اللہ تعالیٰ کے ہدیٰ کی روشنی میں روئے ارض پر سرانجام دی۔ اس آخری تکمیل عزیمت کا ذکر کرتے ہوئے اور اس کی باریکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے

یوں بیان فرمایا:

واذبوانا لابرہیم مکان البیت ان لا تشرک بی شیا و طہر بیتی
للطائفین والقائمین والركع السجود واذن فی الناس بالحج یا توک رجالا
وعلى كل ضامر یاتین من كل فج عمیق لیشهدوا منافع لکم و یذکروا اسم اللہ
فی ایام معلومات علی ما رزقہم من بہیمۃ الانعام. فکلوا منها اطعموا البائس
الفقیر. ثم لیقضوا تفشہم ولیو فوا نذورہم ولیطوفوا بالبت العتیق. ذلک
ومن یعظم حرمت اللہ فهو خیر لہ عند ربہ (الحج ۳۰-۲۶)

ترجمہ: اور جب ٹھیک کر دی ہم نے ابراہیم کو جگہ اس گھر کی کہ شریک نہ کرنا میرے ساتھ کسی کو اور
پاک رکھ میرا گھر طواف کرنے والوں کے لئے اور کھڑے رہنے والوں کے اور رکوع و سجدہ کرنے
والوں کے اور پکار دے لوگوں میں حج کے واسطے کہ آئیں تیری طرف پیروں چل کر اور سوار ہو کر
دبلے دبلے اونٹوں پر چلے آئیں راہوں دور سے تاکہ پہنچیں اپنے فائدے کی جگہوں پر اور پڑھیں
اللہ کا نام کئی دن جو معلوم ہیں ذبح پر چوپایوں مویشی کے جو اللہ نے دیئے ہیں ان کو سوکھاؤ اس میں
سے اور کھلاؤ برے حال کے محتاج کو۔ پھر چاہئے کہ ختم کر دیں اپنا میل کچیل اور پوری کریں اپنی
منتیں اور طواف کریں۔ اس قدیم گھر کا۔ یہ سن چکے اور جو کوئی بڑائی رکھے اللہ کی حرمتوں کی سودہ
بہتر ہے اس کے لئے اپنے رب کے پاس۔

یہ اقامت حج عالمی اور انسانی تھی اور پوری روئے زمین میں باضابطہ اور کامل طور پر
'ملک اللہ' کی خالص بنیادوں پر قائم 'حکومت الہیہ' 'حکومتہ اللہ' 'مملکتہ اللہ' یا 'الحکم' کی حتمی صورت
تھی۔ اور اس اقامت کے بعد 'الحکم' اور 'ملک اللہ' کے لئے تمام انسانوں سے کامل سپردگی کا مطالبہ
ہوا۔ کامل سپردگی کیا ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی جس کے چار
اجزاء تھے:

- (۱) ابعلنا مسلمین لک یعنی اللہ اور اس کے 'ملک' کے سامنے کامل قلبی سپردگی۔
- (۲) ارنا مناسکنا یعنی اس کامل قلبی سپردگی کا کامل عملی اظہار۔
- (۳) تب علینا اس کامل سپردگی میں قلبی، قولی اور عملی اظہار میں اگر کوتاہی ہو جائے تو اس سے مغفرت۔

(۴) البعث فیہم رسولا صفات مذکورہ سے متصف اس رسول کی اسی ملت میں بعثت۔
یہاں ہم سردست چوتھی دعا سے صرف نظر کرتے ہیں اور بالخصوص دوسری دعا کو زیر بحث لاتے ہیں:

’نسک‘ کیا ہے؟

علوم اسلامی اس مقام پر بھی اسی المناک حادثے سے دوچار ہے جس کا تذکرہ اس عاجز نے ’صلوٰۃ‘ کے تناظر میں کیا تھا۔

’نسک‘ کے معانی عربی مبین میں درج ذیل ہیں:

- (۱) انڈیلنا، پیش کرنا، نذر کرنا، حوالے کرنا
- (۲) خون انڈیلنا، خون پیش کرنا، خون نہچا اور کرنا
- (۳) قربانی،

چنانچہ نسک سے مراد بندے کی جانب سے اللہ تعالیٰ کو اپنی زندگی کی ہر چیز حتیٰ کہ اپنی جان اور اپنا خون انڈیل کر پیش کر دینا ہے۔ جب حج کے تناظر میں نسک کا ذکر ہو تو اس کا مفہوم اور بھی مخصوص اور وسیع ہو جاتا ہے۔ حج دراصل پوری روئے زمین پر ملک اللہ کو تسلیم کرنے اور اس ملک اللہ کے عین اپنی کامل سپردگی کا اظہار کرنے کا نام ہے۔ حج پوری روئے ارض میں ملک اللہ کا اعلان اور اس کے بالقابل ملک کے دعویدار یا دعویداروں کے خلاف اعلان براءت اور اعلان جنگ کا اظہار ہے۔ اور اس موقع پر ’نسک‘ گویا اس بات کا عملی اظہار ہے کہ اس ملک اللہ کے لئے بندہ اور ملت ابراہیمی جو اس کی باضابطہ ذمہ دار ہے اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے کو تیار ہے بلکہ اس کے سوا اس کا روئے ارض پر کوئی دوسرا فرض منصبی ہے ہی نہیں۔ سچ جانئے تو ایک مومن بلکہ پوری امت مسلمہ کو زیست کے لئے کمانے کی ضرورت ہے نہ دوڑ دھوپ کرنے کی بلکہ وہ اس فوجی اور فوج کی طرح کی ہے جو اپنے گھر سے دور فوجی کمپ میں یا لڑائی کے میدان میں ہو جس کا کھانا پلانا حکومت کے ذمہ ہے۔ اور اس فوج کا کام تو صرف اس حکومت کے لئے جنگ کرنا ہے اور اس کے احکام بجالانا ہے اور اس حکومت کے ’ملک‘ (Authority) کو ہر طرح کے چیلنج سے محفوظ رکھنا ہے۔

بحیثیت فرد حضرت ابراہیم علیہ السلام ایسے لوگوں کے لئے نمونہ ہیں جو اپنے اوپر اس کا

عملاً نفاذ کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی لله رب العلمین (الانعام ۱۶۲)
ترجمہ: کہہ دو بے شک میری صلاۃ اور میرا نسک اور میری زندگی اور میری موت اللہ رب العزت کے لئے ہے۔

یہ حضرت ابراہیم ہی تھے جنہوں نے اقامت ایمان سے اقامت مقام تک پھر اقامت مقام سے اقامت صلوٰۃ تک، پھر اقامت صلوٰۃ سے اقامت ذبح عظیم تک اور اقامت ذبح عظیم سے اقامت ملک اللہ تک اور پھر اقامت ملک اللہ سے اقامت حج تک اس کا مل سپردگی کا نمونہ پیش کیا جو روئے ارض پر بندے کا معیار مطلوب ہے۔

یہاں واضح رہے کہ اقامت مقام کا اقامت صلوٰۃ تک اور وہاں سے اقامت حج تک پہنچنا اور دوسری طرف اقامت ذبح عظیم کا اقامت نسک تک اور وہاں سے اقامت حج تک پہنچنا غور طلب ہے۔ یہ وہ تسلسل ہے جو روئے ارض پر مومن کی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔

مومن
صلاتی
محیای
لله رب العالمین

نسکی
مماتی

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ حضرت ابراہیم نے اپنی اس انفرادی حیثیت سے آگے جا کر اس درجے کا کارنامہ انجام دیا جو ایک فرقہ نہیں بلکہ ایک امت انجام دیتی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس مہم کو کتنی قومیں انجام دینے سے قاصر رہیں اسے حضرت ابراہیم نے تنہا انجام دے دیا۔ چنانچہ قرآن نے ارشاد فرمایا کہ ابراہیم اپنے آپ میں ایک امت ہیں۔

ان ابراہیم امتاً قانتا لله

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اقامت حج کی اس عزیمت عظمیٰ پر حضرت ابراہیم پر انعامات کی بارش کر دی۔ اور انہیں سب سے بڑا انعام یہ عطا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے معرکہ خیر و شر میں ابلیس کے بالمقابل حق کی علمبرداری اور قیادت کے لئے آپ اور آپ کی ذریت کو مجتبیٰ بنالیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کا عہد لیا:

وعہد نالی ابراہیم واسمعیل ان طہرا بیتى للطائفین والعکفین

والرکع السجود (البقرہ ۱۲۵)

ترجمہ: اور حکم کیا ہم نے ابراہیم اور اسمعیل کو کہ پاک کر رکھو میرے گھر کو واسطے طواف کرنے والوں کے اور اعتکاف کرنے والوں کے اور رکوع اور سجود کرنے والوں کے۔

یہ وہی وعدہ ہے جس کی تفصیل سورۃ الانعام میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

قل اننی ہدانی ربی الی صراط مستقیم دینا قیما ملۃ ابراہیم حنیفا
وما کان من المشرکین۔ قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب
العلمین لا شریک لہ وبذلک امرت وانا اول المسلمین۔ قل اغیر اللہ ابغی
ربا وہو رب کل شیء ولا تکسب کل نفس الا علیہا ولا تنزر وازرۃ وذر اخری ثم
الی ربکم مرجعکم فینبئکم بما کنتم فیہ تختلفون۔ وهو الذی جعلکم خلائف
الارض ورفع لبعضکم فوق بعض درجات لیبلوکم فی ما اتکم ان ربکم سریع
العقاب وانه لفغور رحیم (الانعام ۵-۱۶۱)

ترجمہ: اے محمد، کہو میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے۔ بالکل ٹھیک دین جس
میں کوئی ٹیڑھ نہیں۔ ابراہیم کا طریقہ جسے یکسو ہو کر اس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ
تھا۔ کہو میری 'صلۃ' اور میرا 'نسک' میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے
جس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سراطاعت جھکانے والا میں
ہوں۔ کہو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے؟ ہر شخص جو کچھ
کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا پھر تم سب کو
اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔ اس وقت وہ تمہارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔ وہی
ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا۔ اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے
دئے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بے شک تمہارا رب سزا دینے میں
بھی بہت تیز ہے۔ اور بہت درگزر کرنے والا بھی ہے۔

ابلیسی جوابی حملہ

ابلیس کا جوابی حملہ اور تدابیر ابراہیم

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جب اللہ تعالیٰ نے اقامت نختہ یا اقامت ازالہ غزل کا فیضان فرمایا تو حضرت ابراہیم نے منشاء ربانی کو سمجھ لیا۔ اس وقت آپ کی عمر شریف نناوے سال کی تھی۔ آپ نے سمجھ لیا کہ اللہ رب العزت روئے ارض پر اب جلد از جلد اقامت ملک اللہ دیکھنا پسند کرتا ہے۔ لہذا آپ نے کمال سرعت کے ساتھ سارے کام انجام دیے۔ چنانچہ آپ نے طوفان کی سی تیزی کے ساتھ اقدامات کئے اور صرف ایک سال کی مدت میں درج ذیل امور کی اقامت فرمائی:

(۱) اقامت صلوٰۃ یا اقامت ملک اللہ

(۲) اقامت دین اللہ فی الارض یا اقامت ملت ابراہیمی

(۳) اقامت بیت اللہ علی الارض

(۴) اقامت حج، اقامت مناسک یا اقامت کمال صلوٰۃ

جس وقت آپ اقامت حج سے فارغ ہوئے اس وقت آپ کی عمر شریف کے سو سال ہونے میں کچھ مہینے باقی تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ حضرت ابراہیم کی تفویض الی اللہ کے عمل سے اور پھر اس کے بعد تعین بیت، حضرت اسمعیل کے وہاں بسائے جانے اور اللہ تعالیٰ کے ملائکہ کے ذریعہ تلقین حراسے ابلیس نے اندازہ لگالیا کہ یا تو اللہ تعالیٰ کو اور اس کے ذریعہ حضرت ابراہیم کو اس تبدیلی منہج اور نئے منہج ابلیس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے یا پھر اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ ابلیس کے خلاف کوئی بڑا اقدام کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ بعد کے حالات میں جب اقامت ذبح عظیم کے بعد حالات نے سرعت کے ساتھ موڑ لینا شروع کر دیا تو ابلیس کلہا حواس باختہ ہو گیا۔ اور اس نے بدحواسی میں مخالفانہ اور انہدامی اقدامات کا آغاز کر دیا۔ اس نے اس بات کی کوشش کی کہ حضرت ابراہیم کی صفوں میں برہمی پیدا ہو جائے۔

فتنہ ارتداد

ابلیس کا سب سے پہلا حملہ سدوم اور گمورہ میں فتنہ ارتداد کے برپا کرنے کی صورت میں سامنے آیا ۱۔ یہ بات عرض کی جا چکی ہے سلطنت سدوم اور سلطنت گمورہ حضرت ابراہیم کی ملت میں یا ان کے حلفاء میں سے تھیں۔ اور یہاں کے اعتقادی اور اخلاقی سربراہی اور رہنمائی کی لئے حضرت لوط علیہ السلام بھیجے گئے تھے جو رسالت کے اعتبار سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہدی اور ان کی سنت کے پابند تھے۔ ابلیس نے اس خطے میں ارتداد کا آغاز کیا۔ وہ ارتداد اخلاقی خرابی کی صورت میں پیدا ہوا اور اس نے دیکھتے دیکھتے بھیا نک روپ اختیار کر لیا۔ چنانچہ باوجود اس بات کے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط اس خرابی کے از اسے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے فاسقین نے سارے حدود پامال کر دیئے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کے تباہ کر دیئے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اس کی اطلاع لیکر فرشتے حضرت ابراہیم کے پاس پہنچے۔ کسی رسول کے لئے اس کی امت یا امت دعوت کی تباہی کی خبر اور وہ بھی حضرت ابراہیم جیسے اولوالعزم رسول کی امت دعوت کی تباہی کی خبر کتنی گھبرادینے والی ہو سکتی ہے اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے اولوالعزم رسول نے ان ملائکہ سے اور پھر اللہ تعالیٰ سے طرح طرح سے درخواست کی تاکہ اس فیصلہ پر عمل درآمد نہ کیا جائے اور اسے موخر کر دیا جائے۔ مگر ملائکہ نے صاف صاف بتا دیا کہ قوم لوط کے تباہ کر دیئے جانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ اب اسے بدلنے والا نہیں۔ واقعات کی ترتیب (مثلاً سورہ ہود آیات ۸۴-۶۹ اور الحجر ۷۷-۵۱) ایک حیرتناک بات کا انکشاف کرتی ہے:

(۱) ملائکہ نے پہلے حضرت اسحاق کی پیدائش کی بشارت دی پھر قوم لوط کی تباہی کی خبر۔

آخر ایسا کیوں ہوا؟ اس ترتیب میں کون سی مصلحت پوشیدہ ہے؟

(۲) ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ حضرت ابراہیم جیسے علم، اداہ اور فیض رسول کو جب یہ

خبر پہنچے گی تو وہ بے حد بے قرار ہو جائیں گے چنانچہ اس خبر سے قبل انہیں تعجب، خوشی اور حیرت کی

حالت میں لا دیا جائے۔ یا پھر اس کی غرض یہ ہو سکتی ہے کہ انہیں پچھلے کاموں کے تعلق سے ظاہری

ناکامی کی طرف متوجہ رہنے کے بجائے اگلے میدان کار کی طرف متوجہ کر دیا جائے۔

(۳) ممکن ہے اس بشارت میں ایک طرف تو ایک تسکین کا اظہار ہو کہ قوم لوط کی تباہی حضرت ابراہیم کی کوششوں کی ناکامی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ان سے بے حد خوش ہے یہ تو خود اہل سدوم و گمورہ کی بد بختی ہے جو انہیں اس انجام تک لے جا رہی ہے۔ جہاں تک حضرت ابراہیم کی بات ہے تو اللہ ان سے خوش ہے اور اگر وہ ایسا سمجھتے ہیں کہ ان کی ملت کا ایک حصہ ضائع کیا جا رہا ہے تو اللہ انہیں اس کے بدلے اپنے فضل خاص سے ایک اور امت دینے کا وعدہ کرتا ہے جو اسحاق سے آگے بڑھے گی۔

(۴) ممکن ہے اس بشارت میں حضرت ابراہیم کو اقامت ملک اللہ کی ایک اور راہ بتائی گئی ہو کہ اگر ابلیس نے حملہ کر کے ان کی ایک صف کو برہم کر دیا ہے تو اس کے خلاف اللہ ابراہیم کو ایک اور باز و عنایت کر رہا ہے۔

حالات تنزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ دوسرے ہی دن سدوم و گمورہ تل پٹ کر دیئے گئے لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ ابھی ایک سال بھی نہیں گزرتے تھے کہ حضرت اسحق کی ولادت ہوئی۔ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر شریف سو سال کے قریب تھی۔

جب حضرت سارہ کا انتقال ہوا تو حضرت ابراہیم کی عمر شریف ایک سو تیس (۱۳۰) سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ آپ نے حضرت اسحق کی شادی اپنے بھائی نحر کی دختر رفقہ سے کر دی۔ آخری عمر میں حضرت ابراہیم نے ایک اور خاتون حضرت قطورہ سے شادی کی۔ یہ امر نہایت غور طلب ہے کہ حضرت ابراہیم نے حضرت قطورہ سے کیوں شادی کی؟ اللہ کے اس اولوالعزم رسول نے کوئی بھی کام عظیم مصلحت دینی کے بغیر نہیں کیا۔ لہذا یقیناً انہوں نے یہ امر بھی کسی عظیم دینی مصلحت کے بغیر نہیں کیا ہوگا۔

حضرت یعقوب و حضرت یوسف علیہما السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بے مثال عزیمتوں نے ابلیس کو بے حد پریشان کر دیا۔ اس کی اسی پریشانی کا دل برداشتہ رد عمل تھا جو ارتداد قوم لوط کی شکل میں سامنے آیا لیکن ابلیس کی کوششوں کو اس وقت سخت ترین دھچکا لگا جب اس نے دیکھا کہ اس کی کوششیں اخلاقی فساد کی صورت میں ظاہر ہوئیں جو دراصل خلق اور فطرت کے خلاف عمل قرار دی گئیں اور اس طرح ان کو تباہ کرنے کا حکم صادر ہو گیا اور دیکھتے دیکھتے قوم لوط صفحہ ہستی سے مٹا دی گئی۔

’منہج فساد ملک‘ کے اس مرحلے میں ابلیس کے لئے سب سے مشکل مرحلہ اس کی تعمیل کا تھا۔ چنانچہ اس نے اس کی منصوبہ بندی کی کہ اس مشن کو رو بہ عمل لانے کے لئے اگر خارجی قوت کے بجائے داخلی قوت استعمال کی جائے تو یہ بات زیادہ آسان اور مفید مطلب ثابت ہوگی۔ ابلیس کی مجبوری بھی تھی اور ایک اعتبار سے تدبیر کی خوبی بھی۔ خارج میں اب اس کے مددگار کم ہی بچ رہے تھے جو اس کی مدد کرتے۔ دوسری جانب اس صورت سے اسے دو فائدے ہوتے۔ اولاً یہ کہ اسے اپنے کام کے لئے آگے کار اندر سے ملتے۔ دوم یہ کہ اس میں اسے جتنی کامیابی ملتی حق کی قوت اتنی ہی کم ہوتی جاتی۔ یعنی یہ منصوبہ بندی کہ حق کے علمبرداروں کو ہی ابلیس کے کاموں کے کرنے کے لئے داخل دفتر کیا جائے۔ چنانچہ ابلیس نے اس کوشش کا آغاز کر دیا۔ اس کوشش اور ترکیب کا نام قرآن میں نزع اور احادیث میں نزع ۲۲ ہے۔ جو عربی مبین کے مطابق ایک ہی لفظ ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بعثت سے غالباً قبل یا بعثت کے وقت اللہ تعالیٰ نے روایاء کے ذریعہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو بشارت دی کہ حضرت ابراہیم نے جس ملک اللہ کا قیام فرمایا تھا اور جس کے مطابق حضرت اسحق علیہ السلام نے کوششیں جاری رکھی تھیں تاکہ روئے ارض کے اس خطے میں جہاں وہ آباد ہیں۔ انہیں خطوط پر باضابطہ ایک ایسی مملکت قائم ہو جائے جو حکومت اللہ یا حکومت الہیہ ہو اس کی تکمیل اللہ تعالیٰ حضرت یعقوب کے ہاتھوں کروائے گا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے دیکھا کہ زمین اور آسمان کے مابین ایک زینہ لگایا گیا ہے اور اس

کے ذریعہ ملائکہ چڑھ اور اتر رہے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ ابلیس نے حضرت یعقوب کی کوششوں کے طریقہ کار کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس نے اسی نئی ترکیب کا تجربہ کیا جس کا ذکر ابھی کیا گیا یعنی نزع۔ اس عنوان سے اس کی کوشش یہ تھی کہ کیوں نہ حضرت یعقوب کے ان قریبی افراد کو جو اس کام میں ان کے شریک کار ہیں فتنہ میں ڈال دیا جائے۔ اور فتنہ یہ کہ ان کے دلوں کو متاثر کر کے انہیں آپس میں ہی دست و گریباں کر دیا جائے تاکہ ایک طرف تو وہ آپس ہی میں لڑنے لگیں اور حق کی طاقت، جو اقامت ملک اللہ کے لئے استعمال ہوتی وہ آپس میں ہی ٹکرا کر ضائع ہو جائے اور دوسری یہ کہ خود حق کے علمبرداروں کو اپنے مقاصد یعنی ملک اللہ کو قائم ہونے سے روکنے کے لئے استعمال کر لیا جائے۔

ابلیس کی یہ ترکیب کامیاب رہی اور جب حضرت یعقوب علیہ السلام فیصلہ کن اقدامات کر رہے تھے انہیں اندازہ ہو گیا کہ ان کی بیویوں اور لونڈیوں یعنی حضرت لیلہ (Leah)، حضرت راحیل (Raheel)، زلفہ (Zilphah) اور بیلہ (Bilhah) کی اولادیں حضرت راحیل کی اولادوں کو چھوڑ کر جو چھوٹی تھیں طرح طرح کی اخلاقی برائیوں میں مبتلا ہو چکی ہیں اور وہ ان کا ساتھ دینا تو دور کی بات اقامت حکومت الہیہ کی ان کوششوں اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے اثر و رسوخ اور مرتبے اور اس تحریک کے وقار کو اپنی اخلاقی برائیوں اور دنیاوی مفادات کی تکمیل میں استعمال کرنے لگی ہیں۔ عمر کے اس حصے میں انہیں محسوس ہوا کہ ان کی تحریک گھر ہی میں دم توڑنے لگی ہیں۔ انہیں اس پر بھی تشویش ہوئی کہ آخر اس خواب کا کیا مفہوم ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس تعلق سے دکھایا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و عنایات سے محروم ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے ان حالات میں ایک اولوالعزم نبی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہی حالات تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو جو عمر میں چھوٹے اور حضرت راحیل کی اولاد تھے وہ رویا دکھایا جس کا ذکر سورہ یوسف میں آیا ہے۔ چنانچہ حضرت یعقوب نے سمجھ لیا کہ ان کے خواب کی تعبیر دراصل حضرت یوسف کے ہاتھوں پوری ہوگی۔ حضرت یعقوب اپنے ارد گرد خود گھر کے ماحول میں ابلیس کی چلت پھرت سے واقف ہو چکے تھے چنانچہ آپ نے اس خواب کا ذکر کسی سے بھی کرنے سے حضرت یوسف کو منع فرما دیا۔ لیکن ایسا لگتا

ہے کہ جب حضرت یوسف یہ خواب حضرت یعقوب کو سنا رہے تھے ابلیس نے اسے Intercept کر لیا۔ چنانچہ اس نے اندازہ کر لیا کہ 'حکومت الہیہ' کے قیام کو روکنے کی واحد صورت یوسف کا خاتمہ ہے۔ اسی وقت سے اس عظیم نزع کا آغاز ہوتا ہے جس پر پوری سورہ یوسف گواہ ہے (آیت ۱۰۰)

حق کے قافلے کا کیسا المیہ تھا کہ آل ابراہیم میں یعقوب کا گھر جو روئے ارض پر علم اللہ کو تھامنے کا مجاز تھا آج خود اس علم کی اقامت کو سبوتاژ کرنے والا بن گیا۔ آل ابراہیم میں آل اسحاق اور آل اسحاق میں آل یعقوب اور آل یعقوب میں حضرت یوسف اور بن یحییٰ کو چھوڑ کر سارے لوگ ابلیس کے نزع میں گرفتار ہو کر اس میثاق کو پورا کرنے میں کوتاہ ثابت ہوئے گئے جس کا ان سے عہد لیا گیا تھا۔

ادھر اللہ تعالیٰ نے مصر میں حضرت یوسف کے ذریعہ ایک طویل آزمائش کے بعد اس حکومت الہیہ کا قیام کروا دیا جس کی بشارت حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کو دی گئی تھی۔ ہر چند کہ حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کی غیر معمولی عزیمتوں کے سبب روئے ارض کے ایک حصے میں 'حکومت الہیہ' کا قیام ہو گیا لیکن آل ابراہیم کی شاخ آل اسحاق کی میثاق کے تعلق سے یہ پہلی کوتاہی اور ناکامی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ جب حکومت الہیہ کا قیام ہو گیا تو یہ تمام لوگ تائب ہوئے اور انہیں معاف کر دیا گیا لیکن جہاں تک ایفاء عہد و میثاق کی بات ہے تو بحیثیت مجموعی آل یعقوب اس میں ناکام ہو گئے۔ یہ کوتاہی ناراضگی رب کا باعث ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے دو طرح سے اس پر اپنا تبصرہ فرمایا ہے:

(۱) پہلا تبصرہ اس عہد کی شکل میں ہے جو حضرت یعقوب نے بستر مرگ پر اپنی ان اولادوں سے لیا۔ یہ گویا اس بات کا اظہار تھا کہ وہ ان کے طرز عمل سے خوش ہیں نہ ان کو مستقبل کے تعلق سے ان پر اعتماد ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

ام كنتم شهداء اذ حضر يعقوب الموت اذ قال لبنيه ما تعبدون من بعدى قالوا نعبد الهك واله آبائك ابراهيم واسماعيل واسحق الها واحدا ونحن له مسلمون (البقرہ ۱۳۲)

ترجمہ: کیا تم اس وقت موجود دیکھ رہے تھے جب یعقوب پر موت طاری ہو رہی تھی اور وہ اپنے

بیٹوں سے کہہ رہا تھا کہ تم میرے بعد کس کی بندگی کرو گے؟ بیٹوں نے کہا ہم لوگ بندگی کریں گے آپ کے اور آپ کے آبا ابراہیم اور اسمعیل اور اسحاق کے رب کی۔ اکیلا الہ اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔ مگر ہر چند کہ انہوں نے حضرت یعقوب سے تجدید وعدہ کر لیا تھا لیکن ظاہر ہے کہ وہ اس کے پورا کرنے میں ناکام ہوئے جس پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن کا ارشاد ہے:

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ (البقرہ ۱۳۳)

ترجمہ: وہ ایک امت تھی جو گزر چکی ان کے واسطے ہے جو انہوں نے کیا۔

(۲) دوسرا تبصرہ اس سخت طرز بیان کی صورت میں سامنے آیا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے بعد تسلسل میں فصل ڈال دیا۔ اور پھر اسباط کا ذکر کر کے پھر فصل ڈال دیا۔ قرآن کی گہرائیوں سے واقف حضرات خوب جانتے ہیں کہ قرآن کا ایسا اظہار کن نزاکتوں کو بتاتا ہے۔ قرآن یہ بات یہودیوں کے کرتوتوں کو بیان کرتے ہوئے ظاہر کر رہا ہے اور اہل ایمان سے کہا جا رہا ہے کہ آپ یہ بات کہہ دیں:

قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اَنْزَلَ اِلَيْنَا وَمَا اَنْزَلَ اِلَىٰ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَاِلِسٰبٰطَ وَمَا اَوْتٰى مُوسٰى وَعِيسٰى وَمَا اَوْتٰى النَّبِيّوْنَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نَفَرَقَ بَيْنَ اَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُوْنَ (البقرہ ۱۲۶)

ترجمہ: تم لوگ کہہ دو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو کچھ نازل ہوا ہماری طرف اور جو کچھ نازل ہوا ابراہیم اور اسمعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کے اسباط کی طرف اور جو کچھ بھیجا گیا موسیٰ اور عیسیٰ کی طرف اور جو کچھ بھیجا گیا نبیوں کی طرف ان کے رب کی جانب سے۔ ہم ان میں کسی کے مابین فرق نہیں کرتے اور ہم لوگ فرماں بردار ہیں اس کے۔

یہاں حضرت یعقوب و حضرت یوسف علیہما السلام کی اقامت حکومت الہیہ کی کوشش، ابلیس کی ان کوروکے کی کوشش اور بیشتر آل یعقوب کا اس تعلق سے عدم ایفاء عہد بلکہ ابلیس کے نزع کے تحت اس کوشش کو سبوتاژ کرنے کی کارروائی کے تناظر میں چند باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس کی ضرورت دراصل اس لئے پیش آئی ہے کہ دین اللہ اور معرکہ خیر و شر اور تاریخ رسالت و نبوت سے لاعلمی نے ہمارے علماء کرام اور بالخصوص مفسرین کو کن کن صحراؤں میں بھٹکا دیا ہے کہ الامان والحفیظ۔ مثلاً مقصد و تعبیر خواب کی بحث، سجدہ تعظیسی کی بحث، دین الملک کی

بحث، حکومت الہیہ اور حکومت باطلہ کا کیا فرق ہے اور یہ کہ نظام باطل سے تعاون ہو سکتا ہے یا نہیں وغیرہ وغیرہ کی لایعنی بحثیں۔

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

(۱) قرآن کا ارشاد ہے :

اذ قال يوسف لایہ انی رایت احد عشر کواکبا والشمس والقمر رایتہم لی سجدین (یوسف ۴)

ترجمہ: جب کہا یوسف نے اپنے باپ سے اے باپ! میں نے دیکھا خواب میں گیارہ ستاروں اور سورج کو اور چاند کو میں نے ان کو دیکھا اپنے واسطے سجدہ کرتے ہوئے۔
ہمارے مفسرین نے اس آیت کو پہلے آیت ۱۰۰ میں بیان کردہ 'هذا تاویل رءبای من قبل' (یہ بیان ہے میرے اس پہلے خواب کا) سے جوڑا اور پھر اس کا جوڑ لگا دیا اسی آیت میں بیان کردہ 'وخر والہ سجدا' سے اور اس کے مفہوم کو اس طرح لیا:

(۱) (وخر والہ) یعنی الا خوة الا حد عشر والابوین (سجدا) (الزخری: الکشاف)

ترجمہ: یعنی گیارہ بھائیوں اور والدین نے سجدہ کیا (یوسف کو)

(۱) 'یوسف نے اپنی طرف سے والدین کی تعظیم کی، تخت پر بٹھلایا لیکن خدا کو یوسف کی جو تعظیم کرائی تھی اسے یوسف کب تک سکتے تھے۔ اس وقت کے دستور کے موافق ماں باپ اور سب بھائی یوسف علیہ السلام کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔ یہ سجدہ تعظیمی تھا جو بقول حافظ عماد الدین ابن کثیر آدم کے زمانے سے مسیح علیہ السلام کے عہد تک جائز رہا۔۔۔ بعض کہتے ہیں یہ سجدہ یوسف کو نہ تھا بلکہ یوسف کی عزت و عظمت دیکھ کر سب نے خدا کے سامنے سجدہ شکر ادا کیا۔ اس تقدیر پر و خروالہ میں لام سببیہ ہوگا یعنی یوسف کے عروج و اقتدار کے سبب سے خدا کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔۔۔'

(ترجمہ شیخ الہند و تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی)

اس کی اصل تاویل پوری تفصیل سے بیان کرنا یہاں مشکل ہے اس لئے مختصر صرف یوں عرض کیا جاسکتا ہے کہ:

(۱) آیت ۴ کا کوئی تعلق ستاروں اور چاند اور سورج کے سجدہ کرنے سے نہیں بلکہ یہ بشارت ہے حضرت یوسف کے ذریعہ حکومت ملک اللہ کے قائم ہونے کی۔

خواب میں ستاروں اور سورج اور چاند کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھنا حقیقت میں سجدہ کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی کوئی تعبیر ہوتی ہے جو حقیقت بن کر آتی ہے۔ مثلاً حدیث شریف میں آیا ہے:

عن ابی بکرہ ان رجلا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رایت کان میزا نازل من السماء فوزنت انت و ابو بکر فرجحت انت و وزن ابو بکر و عمر فرجح ابو بکر و وزن عمر و عثمان فرجح عمر ثم رفع المیزان فاستاء لها رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی فساء ہ ذلک فقال خلافة نبوة ثم یوتی اللہ الملک من بشاء (رواہ الترمذی و ابو داؤد)

ترجمہ: حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض گزار ہوا: میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا ایک میزان آسمان سے اتری۔ پس آپ اور حضرت ابو بکر کو تولایا گیا تو آپ وزنی رہے۔ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کو تولایا گیا تو حضرت ابو بکر وزنی رہے حضرت عمر اور حضرت عثمان کو تولایا گیا تو حضرت عمر وزنی رہے پھر میزان اٹھالی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا صدمہ ہوا اور فرمایا کہ یہ خلافت نبوت ہے پھر اللہ تعالیٰ اپنا ملک جس کو چاہے دے۔

ظاہر ہے اس میں میزان کا اترنا اور تولانا فی الواقع میزان کا اترنا اور تولانا نہیں تھا۔ بلکہ خود آنحضور ﷺ کی تشریح کے مطابق خلافت نبوت کا دیا جانا اور اٹھایا جانا تھا۔

(۲) و خروالہ سجدہ کا مطلب حقیقی طور پر سجدہ کرنا نہیں اور اگر ہے تو بھائیوں اور والدین کا حضرت یوسف کو قطعاً نہیں بلکہ تمام لوگوں بشمول عمائد مصر و کنعان کا اللہ کے حضور سجدہ مراد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دراصل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بادشاہ اور عمائد مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کی بات مان لی اور ان کی سربراہی میں حکومت الہیہ قائم کرنے کو راضی ہو گئے چونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی موجودگی میں حضرت یوسف علیہ السلام کی حیثیت تابع نبی کی تھی لہذا یہ اقامت دراصل حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھوں حضرت یعقوب علیہ السلام کی

کوششوں کی اقامت تھی۔ چنانچہ جب حضرت یعقوب وہاں پہنچے تو انہیں باضابطہ سربراہ مملکت اور اس مملکت کے روحانی قائد اور موجد کی طرح تخت مصر پیش کیا گیا۔ یہی مفہوم ہے 'ورفع ابوہ علی العرش کا اور اس بات پر انقیاد و اتباع کے اعتبار سے سبھوں نے سجدہ کیا۔ اور اللہ کے اس 'ملک' کی اقامت پر اطمینان کا اظہار کیا۔ سجدہ نہیں بلکہ اقامت ملک اللہ دراصل وہ بات ہے جس کی طرف حضرت یوسف علیہ السلام نے اشارہ کیا ہے کہ اے والد محترم یہی اقامت حکومت تھی جس کی بشارت اس خواب میں دی گئی تھی اور آج وہ حکومت بفضلہ تعالیٰ قائم ہو گئی ہے۔ جسے آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ لہذا انہوں نے 'اقامت ملک اللہ' کی طرف حضرت یعقوب کی کوششوں، ابلیس کی جانب سے ایسا ہونے سے روکنے کی چالوں، حضرت یوسف علیہ السلام کے کنوئیں میں ڈالے جانے، مصر میں بیچ دیے جانے، جیل کی مصیبتوں سے گزرنے یہاں تک کہ اپنے ملک سے دور مصر میں حکومت الہیہ کے قائم ہونے کے پورے واقعات کو قصص (Trace back) کیا کہ کس طرح یہ سب کچھ ہوا۔ لہذا قرآن کا ارشاد ہے:

قد جعلها ربی حقاً وقد احسن بی اذا خرجنی من السجن وجاء بکم من البدو من بعد ان نزع الشیطان بینی و بین اخوتی، ان ربی لطیف لما یشاء انه یمر العلیم الحکیم (یوسف ۱۰۰)

ترجمہ: اس کو میرے رب نے سچا کر دیا۔ اور اس نے انعام کیا مجھ پر جب مجھ کو نکالا قید خانہ سے اور تم کو لے آیا دور سے بعد اس کے نزع ڈال چکا تھا شیطان مجھ میں اور میرے بھائیوں میں میرا رب تدبیر سے کرتا ہے جو چاہتا ہے بے شک وہی ہے خبردار حکمت والا اور پھر صاف اظہار کیا:

رب قد آتیننی من الملک (یوسف ۱۰۱)

ترجمہ: اے پروردگار! تو نے مجھے ملک دیا۔

(۲) ہمارے اکثر مفسرین نے اور ان کی تفسیروں کی بنیاد پر اکثر علماء کرام نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام یا تو سلطنت مصر میں کسی اونچے عہدے پر ہی سہی نوکر بحال ہو گئے یا شریک سلطنت بن گئے تھے۔ قرآن کے الفاظ و طرز بیان کو اور دین اللہ اور ہدئی کے مقصد و جود کو منسوخ کرنے اور منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین کی ذات اقدس کی تحقیر

کرنے کی اس سے بڑی مثال شاید ہی مل سکتی ہے۔ یہاں چند سوال قائم ہوتے ہیں:

(۱) قرآن میں غور و فکر کرنے والے جانتے ہیں کہ قرآن کے اظہار بیان کی ایک ترکیب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آفاق و انفس میں کسی ایسی بڑی تبدیلی یا واقعہ یا فیصلہ کو ظاہر کرنا چاہتا ہے اور اس کی نسبت اپنی طرف کرنا چاہے تو وہ 'کذلک' کا استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ آیت ۵۶ میں 'کذلک مکنّا' سے کیا مراد ہے؟ نو کر بحال ہو جانا یا شریک سلطنت ہو جانا۔ کیا یہی آفاق و انفس کی وہ محیر العقول تبدیلی یا واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی نسبت اپنی طرف کر رہا ہے؟

(۲) جب ملک نے 'استخلصہ لنفسی' (میں خالص کر رکھوں اس کو اپنے کام میں) کہہ کر مقام و منصب خاص الخاص کی پیش کش کر ہی دی تھی مثلاً یہ کہ یوسف کو لے آؤ میں اسے اپنا پرائیوٹ سیکریٹری، مشیر خاص، چیف ایڈوائزر، چیف ایگزیکٹو Chief Executive یا وزیر اعظم بنالوں گا تو پھر فلما کلمہ (پھر جب بات چیت کی) سے کیا مراد ہے؟

(۳) فلما کلمہ (پھر جب بات چیت کی) کے جواب میں ملک نے پھر کہا: انک الیوم لدینا مکین امین (چلئے آپ کی ہی بات رہی لیجئے میرے نزدیک آج سے آپ ہی سب چیزوں کے امانت دار ہیں)۔ اس سے کیا مراد ہے؟ اگر اس سے مراد جیسا کہ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ نوکری پکی ہونے کی تصدیق یعنی استخلصہ لنفسی کی توثیق ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بعد حضرت یوسف کے قول اجعلنی علی خزائن الارض کا کیا مفہوم ہوگا؟ اور اگر یہ استخلصہ لنفسی کی توثیق نہیں تو پھر:

(۴) قال اجعلنی علی خزائن الارض (زمین اور اس کے سارے خزانے یعنی ملک اور اس کی تمام دولت اور اس کے سارے وسائل میرے حوالے کر دیں) کا کیا مفہوم ہے؟

بہت واضح ہے کہ ملک ایک بحرانی صورتحال سے گزر رہا تھا۔ بادشاہ کے خواب نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا۔ جب حضرت یوسف نے جن کی دعوت ملک کے طول و عرض میں برسوں پہلے پہنچ چکی تھی اور جو ملا کی سازش کے سبب جیل میں بند تھے بادشاہ سے ملاقات کی تو اس نے ملتے ہی اعلیٰ منصب کی پیش کش کر دی۔ جسے فی الفور آپ نے ٹھکرا دیا اور اپنا مقصد حیات بتایا اور یہ بات یاد رکھائی کہ خود بادشاہ اور پورے ملک کی خیر اسی میں ہے کہ وہ خدا بیزاری کی روش چھوڑ کر اللہ کی بندگی میں آجائے تاکہ اس خطہ ارض پر ملک اللہ کی اقامت ہو۔ ساری صورتحال

سمجھنے کے باوجود بادشاہ اور عمائد ملک نے کچھ اور آگے بڑھ کر پیش کش کی تا کہ حضرت یوسف ان کی شرائط پر کوئی منصب قبول کر لیں۔ انہوں نے کہا چلئے سب کچھ آپ کے اختیار میں ہے آپ جو چاہیں کریں۔ لیکن سلطنت ہماری رہے گی۔ آپ نے صاف طور پر ایسی تمام پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ حکومت کے خزانے کی کنجیاں میرے حوالے کر دو۔ قرآن کی بلاغت پر غور کیا جائے۔ آپ نے فرمایا: 'خزائن الارض'۔ 'خزائن الارض' میں تمام منقولی و غیر منقولی دولت و وسائل ہی نہیں انسانی وسائل (Human Resources) حتی کہ عمائد ملک اور بادشاہ سب آ جاتے ہیں۔ اجعلنی علی خزائن الارض کا مفہوم بہت واضح ہے یعنی:

”غیر مشروط طور پر پوری سلطنت حتی کہ بادشاہ اپنی ذات بھی اللہ کے خلیفہ حضرت یوسف کے حوالے کرے تا کہ اس خطہ ارض میں حکومت اللہ قائم ہو۔“

چنانچہ یہ ہے وہ 'يوم الله' جس کا ذکر اللہ تعالیٰ 'كذلك مكنّا' سے کرتا ہے۔

اب ذرا اس تشریح و تفسیر اور اس بحث کی حقیقت پر غور کریں جو 'دين الملك' کے تعلق سے کی جاتی ہے کہ وہ نظام باطل تھا یا حق؟ نظام باطل سے تعاون جائز ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ بھلا حضرت یوسف ملک کے باطلانہ قانون کے تحت کیسے اپنے بھائی بن یمن کو روک سکتے تھے؟ وغیرہ وغیرہ۔

اس ذیل کی آخری وضاحت کہ 'ما كان لياخذ اخاه في دين الملك الا ان يشاء الله' : نرفع درجات من نشاء و فوق كل ذي علم عليم (یوسف ۷۶) کا کیا مفہوم ہے؟

ہمارے مفسرین کرام نے اس تعلق سے کیا کیا گل افشائیاں کی ہیں جن کا ذکر لا حاصل اور بدخط کرنے والا ہوگا۔ جتنی تفسیریں ہیں ان میں متعدد اختلافات و تضادات کے باوجود دو باتیں مشترک ہیں:

(۱) بن یمن کو حضرت یوسف نے ملکی قانون کے تحت نہ سہی دین ابراہیمی کے تحت چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ یعنی بہت احتیاط کو ملاحظہ رکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ پیمانہ کے ان پاس پائے جانے کے سبب ان کو گرفتار کر لیا۔

(۲) بن یمن کی گرفتاری میں ان دس بھائیوں کا کئی قصور نہیں تھا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب پہلی بار حضرت یوسف گم ہو گئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان دس بھائیوں کی اس بات کا اعتبار نہیں کیا کہ انہیں بھڑیا کھا گیا ہے بلکہ آپ نے ان بھائیوں کی نیت پر شک اور ان کی سازش کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

وجاء و علی قمیصہ بدم کذب قال بل سولت لکم انفسکم امرا

فصبر جمیل واللہ المستعان علی ماتصفون (یوسف ۱۸)

ترجمہ: اور لائے اس کے کرتے پر لہو لگا کر جھوٹ بولا یہ ہرگز نہیں بلکہ بنادی ہے تم کو تمہارے جیوں نے ایک بات اب صبر ہی بہتر ہے اور اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں اس بات پر جو تم ظاہر کرتے ہو۔

جہاں تک اس بار کا معاملہ ہے تو مفسرین کے نزدیک ان دس بھائیوں کا کوئی قصور بن یمن کی گرفتاری میں نہیں تھا۔ اگر اس رد کے جانے میں کسی کو دخل تھا تو یا تو وہ حضرت یوسف یا خود اللہ کی تدبیر کو تھا کہ حضرت یوسف کے بھائیوں نے ایسی جوری کی سزا بتادی جو ان کے بقول ان کے یہاں دی جاتی تھی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نبی کے لئے اپنے ان دس بیٹوں پر بدگمانی کرنا جائز تھا؟ چنانچہ آپ نے فرمایا:

قال بل سولت لکم انفسکم امرا فصبر جمیل (یوسف ۸۳)

ترجمہ: بولا کوئی نہیں! بنالی ہے تمہارے جی نے ایک بات اب صبر ہی بہتر ہے۔
ستم بالائے ستم یہ کہ پہلی بار تو وہ دس بھائی حضرت یوسف کی قمیص پر خون کے جھوٹے داغ لگا کر ہی سہی بھڑیئے کے کھالینے کا ثبوت دے رہے تھے۔ اس بار تو وہ ایسی کسی غلط بیانی میں مبتلا تھے اور جو کچھ کہہ رہے تھے صاف صاف کہہ رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کہا:

وسئل القرية التي كنا فيها والعير التي اقبلنا فيها وانا لصادقون (یوسف ۸۴)

ترجمہ: اور پوچھ لے اس بستی سے جس پر ہم تھے اور اس قافلہ سے جس میں ہم آئے ہیں اور ہم بے شک سچ کہتے ہیں۔

کیا حضرت یعقوب علیہ السلام جیسے نبی کو اس واقعے پر اپنے ان دس بیٹوں پر بدگمانی کرنا درست تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب مشکلات خود ہمارے مفسرین کی اپنی پیدا کی ہوئی ہیں۔

قرآن بہت صاف صاف اور حقیقت بیان کر رہا ہے۔

بات یہ تھی کہ:

(۱) بن یمین کو حضرت یوسف نے گرفتار کرنا چاہا تھا نہ ان کی کوششوں اور تدبیروں سے وہ گرفتار ہوئے یا روکے گئے۔

اور دوسری بات یہ:

(۲) بن یمین کی گرفتاری اور روکے جانے میں کسی کا نہیں بلکہ سر تا سران دس بھائیوں کا ہاتھ تھا اس لئے کہ انہوں نے ایک گہری سازش کر کے بن یمین کو حضرت یوسف کی طرح ٹھکانے لگانے کا نظم کیا تھا۔

اس کی مختصر وضاحت اس طرح ہو سکتی ہے کہ:

(۱) جب وہ کنعان میں قحط سالی اور مہر میں ('ملک اللہ' قائم ہونے کے سبب جس کے کہنے کا انہیں علم نہ تھا) آئی خوشحالی کے سبب بڑی مقدار میں اناج خریدنے یا درآمد (Import) کرنے (واضح ہو کہ یہ لوگ کنعان میں صاحب قوت و اقتدار یا کم از کم صاحب حیثیت تھے) کے لئے مصر آئے تو حضرت یوسف نے ان کو پہچان لیا لیکن وہ بھائی انہیں پہچان نہیں سکے۔ اسی حالت میں جب ان سے حضرت یوسف نے پوچھنا چھ کی اور جب انہوں نے بتایا کہ ہاں گھر پر ہمارے بوجھے والد اور ایک چھوٹا بھائی بھی موجود ہیں۔ تب حضرت یوسف نے ان سے کہا کہ اگلی بار جب وہ آئیں تو اپنے اس بھائی کو بھی ساتھ لائیں۔ بس اسی بات نے ان بھائیوں کو موقع دے دیا کہ وہ بن یمین کو بھی ٹھکانے لگانے کی سازش کریں چنانچہ انہوں نے باہم پوری سازش تیار کر لی اور حضرت یوسف کی بات کو اپنی سازش کے لئے یہاں کے بطور استعمال کیا۔ ادھر سامان میں قیمت بھی واپس مل جاتا مزید سبب ہوا سازش کو کامیاب کرنے کا۔ ہر چند کہ حضرت یعقوب بالکل ابتداء سے اسے سازش سمجھ رہے تھے لیکن ان کے عہد کرنے کے بعد انہوں نے بن یمین کو مصر لیجانے کی اجازت دے دی۔ اب یہاں سے سازش کا پہلا مرحلہ ختم اور دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔

ان بھائیوں نے ایسی تدبیر کی کہ بن یمین گرفتار کر لئے جائیں اور اس گرفتاری کا کوئی الزام ان پر نہ آئے۔ ادھر جب بن یمین آئے تو حضرت یوسف نے ان سے الگ ملاقات کی اور

کہا کہ میں تمہارا بھائی یوسف ہوں اور تحقیق احوال کی اور جب معلوم ہوا کہ ان بھائیوں کا حضرت یعقوب اور بن یمن کے ساتھ کیا سلوک ہے اور یہ کہ حضرت یوسف کی گمشدگی کے بعد وہ لوگ ان کے بارے میں کیا کیا کہتے رہے تھے تو انہوں نے کہا کہ وہ پریشان نہ ہوں ان باتوں پر جو وہ لوگ کر رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہو سکتا ہے کہ حضرت یوسف بن یمن کے لئے خیر خواہی کا جو جذبہ رکھتے تھے اور اس کے تحت ممکن ہے انہیں بلانے یا ان کے لئے بہتری کی کوششیں کرنے کو سوچ رہے ہوں لیکن انہوں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی کہ بن یمن کو روک لیں۔ بن یمن کے تھیلے میں شاہی پیانہ چرا کر رکھنے کی سازش ان بھائیوں نے کی تھی۔ چنانچہ ادھر قافلہ روانہ ہوا ادھر پیانہ کے گم ہونے کا علم ہوا۔ ٹھیک توقع کے مطابق قافلے کو آواز دی گئی اور ان بھائیوں پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے شاہی پیانہ چرایا ہے۔ انہوں نے بڑی معصومیت سے جواب دیا کہ وہ اس ملک میں فساد کی نیت سے نہیں آئے اور یہ کہ انہوں نے ایسا کوئی پیانہ نہیں چرایا ہے۔ تفتیش کرنے والوں نے پوچھا کہ اگر تم لوگ جھوٹے نکلے تو پھر کیا سزا ہے؟ بن یمن وہ مقام ہے جہاں سازش کی بنیاد کی کڑی پوشیدہ ہے۔ وہ جانتے تھے کہ پیانہ کہاں رکھا ہوا ہے۔ اس لئے کہ خود انہوں نے ہی اسے بن یمن کے تھیلے میں رکھایا رکھوایا تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جب تلاشی لی جائے گی تو پیانہ بن یمن کے تھیلے سے برآمد ہوگا۔ اور یہی وہ چاہتے تھے لہذا انہوں نے بڑی صفائی سے اصل سوال کو گم کر دیا اور کہا:

جزاء من وجد فی رحلہ فہو جزاؤہ کذلک نجزی الظلمین (یوسف)

(۷۵)

ترجمہ: اس کی سزا یہ کہ جس کے اسباب میں سے ہاتھ آئے وہی اس کے بدلے میں جائے ہم یہی سزا دیتے ہیں ظالموں کو۔

اگر انہیں معلوم نہ ہوتا کہ فی الواقع پیانہ کہاں ہے تو ممکن ہے وہ اس بات کا بھی اندیشہ کرتے کہ کہیں کسی کی غلطی سے پیانہ ہمارے ہی کسی سامان میں نہ بندھ گیا ہو چنانچہ ایسی صورت میں وہ ازالہ اندیشہ کے لئے مثلاً یہ کہتے: دیکھئے ہم لوگوں نے تو چوری نہیں کی ہے۔ پھر بھی دیکھتا ہوں کہ غلطی سے پیانہ کہیں انہیں تھیلوں میں تو نہیں رہ گیا۔ دیکھئے ہم لوگ چوری کی جسارت کیسے کر سکتے ہیں۔ اس طرح وہ کم از کم ازالہ اندیشہ کرتے۔ لیکن چونکہ سازش یہی تھی کہ شاہی پیانہ

بن یمین کے تھیلے سے نکلے تاکہ وہ پکڑا جائے اور ایسا گرفتار ہو کہ کبھی چھوٹ نہ پائے اس لئے انہوں نے آگے بڑھ کر اور پورے جزم کے ساتھ کہا کہ جس کے اسباب میں وہ نکلے وہی اس کے بدلے رکھ لیا جائے۔ چنانچہ ٹھیک ان کے اندازے بلکہ تدبیر کے عین مطابق تلاشی لی گئی۔ اس سے بحث نہیں کہ تلاشی کس نے لی اور کس ترتیب سے ہوئی۔ تلاشی ہوئی اور شاہی پیمانہ ٹھیک بن یمین کے تھیلے سے برآمد ہوا۔ اور وہ گرفتار کر لیئے گئے۔ جب ان بھائیوں کو پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ بن یمین کو بھی ٹھکانے لگانے کی سازش پوری طرح کامیاب ہو گئی ہے اور اب بن یمین اس چنگل سے کبھی نہیں چھوٹ سکتا تب بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔ یعنی ان کے دل میں کیا تھا ظاہر ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے کہا:

قالوا ان يسرق فقد سرق اخ له من قبل (یوسف ۷۷)

ترجمہ: کہنے لگے اگر اس نے چرایا تو چوری کی تھی اس کے بھائی نے بھی پہلے۔

ایسا کہتے وقت اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ وہ یہ سب کچھ کسی اور کے روبرو نہیں بلکہ یوسف کے سامنے کہہ رہے ہیں جو خوب جانتا ہے کہ کیا یوسف نے چوری کی تھی۔ اسی طرح انہوں نے دین ابراہیمی کی سزا جو بیان کی اس تعلق سے وہ اس سے مطلقاً بے خبر تھے کہ یوسف کو خوب معلوم ہے کہ دین ابراہیمی میں چوری کرنے والے کی یہ سزا ہے یا نہیں؟ چوری کرنے والے کی یہ سزا کسی دین میں نہیں؟ یہ تو دراصل ان کی سازش تھی ان کا مقصد تھا کہ بن یمین ہمیشہ کے لئے غلام بنائے جائیں۔

اللہ کی سنت ہے کہ اللہ باطل کی چالوں کو اسی پر پلٹ دیتا ہے:

ومكروا ومكر الله والله خير مما يكرين۔ باطل سمجھتا ہے کہ وہ اپنی بھلائی اور کامیابی کی تدبیر کر رہا ہے جب کہ وہی تدبیر اس کی تباہی اور شکست کا سبب بنادی جاتی ہے۔ دراصل اسی بات کی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ فرماتے ہیں:

كذلك كدنا ليوسف (یوسف ۷۸)

ترجمہ: اس طرح ہم نے یوسف کے لئے تدبیر کی

حضرت یوسف چاہتے تھے کہ حضرت بن یمین ان کے پاس رک جائیں اور حضرت یعقوب اب مصر چلے آئیں لیکن اس خواہش کے باوجود ان کے پاس بظاہر کوئی حتمی صورت نہیں

تھی کہ اپنی شناخت (Identity) ظاہر کئے بغیر ایسا کر سکیں۔ اور قانونی راستہ سے وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے یہ تدبیر کی۔ تدبیر تو حضرت یوسف اور بن یمن کے دشمن بھائیوں نے اپنے مفاد کے لئے کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس تدبیر کو حضرت یوسف کے لئے مطلب برآری کا ذریعہ بنا دیا۔ ظاہر ہے حضرت یعقوب بدگمانی نہیں کر رہے تھے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے باخبر کر دیا تھا کہ ان کے دوسرے بیٹے کے تعلق سے بھی سازش کی جا رہی ہے۔ اسی بات کی طرف قرآن اس طرح اشارہ کرتا ہے:

وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةٌ فِي نَفْسٍ يَعْذُوبُ قَضَاهَا وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لَمَّا عَلِمْنَاهُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (یوسف ۶۸)

ترجمہ: اور جب داخل ہوئے جہاں سے کہا تھا ان کے باپ نے۔ کچھ نہ بچا سکتا تھا ان کو اللہ کی کسی بات سے مگر ایک خواہش تھی یعقوب کے جی میں سوچ رہی کہ چکا اور وہ تو خبردار تھا جو کچھ ہم نے اس کو سکھایا۔ لیکن بہت لوگوں کو خبر نہیں۔

اس طرح آیت 'ماکان لیاخذ' کا مفہوم ہے:

'سرکاری فیصلے یا حکم کے ذریعہ وہ اپنے بھائی کو نہیں لینے والا تھا لایہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔ ہم جس کے درجے چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں اور ایک علم رکھنے والا ایسا ہے جو ہر صاحب علم سے بالاتر ہے۔'

دراصل قرآن کا فقرہ: 'وفوق کل ذی علم علیم' ایک خاص تناظر میں ہے۔ اس کا سمجھنا ضروری ہے، جب اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب کو پہلا رویا دکھایا تو ابلیس کی بے چینی بڑھ گئی اور اس نے حضرت یعقوب کی کوششوں کو ناکام کرنے کے لئے ان کی بیشتر اولادوں کو بتلا، معاصی کر دیا۔ جب دوسرا رویا حضرت یوسف نے دیکھا تو انہیں بھائیوں کے ذریعہ ان کا خاتمہ کرنے کی تدبیر کی گئی۔ بن یمن کو بھی ٹھکانے لگانے کی تدبیر اسی کی ایک کڑی تھی۔ اسی چالیں تو ابلیس چل رہا تھا۔ افسوسناک بات یہ تھی کہ حق کے خلاف اور روئے ارض پر ملک اللہ کی اقامت کی کوشش کو ناکام کرنے کی چالوں میں خود آل یعقوب کی بڑی تعداد ملوث تھی۔

ابلیس گویا ہر اعتبار سے خوش تھا کہ اس کی ساری تدبیریں بار آور ہوتی جا رہی ہیں۔

ایسی صورت میں مصر کے مقتدر اعلیٰ کی جانب سے بن یمن کی طلب گویا بلی کے بھاگوں چھینکا نونا کے مصداق ہوئی۔ اور انہوں نے ایک گہری سازش تیار کی۔ ان کی سازش اتنی فطری اور معقولی تھی کہ کسی کو بھی اس پر شک نہیں ہو سکتا تھا۔ اصل تدبیروں کے ساتھ ساتھ ان بھائیوں نے رابطہ عامہ (Public Relations) کے سارے تقاضے پورے کئے تاکہ کسی مرحلے میں کسی کو شک نہ ہو کہ یہ کوئی سوچی سمجھی چال ہے۔ ہر مرحلے کی خبر ارد گرد والوں کو دینا، ایسی معقولی تدبیریں کرنا جس سے معلوم ہو کہ یہ لوگ اس بھائی کے تعلق سے کس قدر مخلص اور پریشان ہیں اور یہ کہ اس کی گرفتاری میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں۔ لیکن قرآن کی بلاغت ان تمام گہرے امور پر حاوی ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

فَلَمَّا اسْتِئْذِنُوا مِنْهُ خُلِصُوا نَجِيًّا (یوسف ۸۰)

’فَلَمَّا اسْتِئْذِنُوا مِنْهُ‘ سے مراد یہ نہیں کہ جب وہ ماموس ہوئے اس سے یعنی بن یمن کی رہائی سے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ انہوں نے بظاہر اس کی کوشش کی کہ بن یمن رہا ہو جائیں (حالانکہ درپردہ وہ ایسا نہیں چاہتے تھے) اور جب انہیں اپنی ان نام نہاد کوششوں میں کامیابی نہیں ملی تو انہوں نے ایسا ظاہر کیا یعنی بہ تکلف ظاہر کیا کہ گویا ساری کوششوں کے باوجود ایسا لگتا ہے کہ رہائی نہیں ہو پائے گی۔

خلصوا نجیاً سے مراد دو اہم باتیں ہیں:

(۱) جب وہ بھائی آپس میں مشورہ کرنے کے لئے بیٹھے تو وہ کن لوگوں سے جدا ہو کر بیٹھے۔ ظاہر ہے کہ ان قافلہ والوں سے جن کے وہ ساتھ تھے اور جو ان کے ساتھ کنعان واپس جاتے اور جن کے مابین اس دوران وہ رابطہ عامہ کے تقاضے خوب خوب پورا کر رہے تھے تاکہ وہ وہی گواہی دیں جو انہیں نظر نہ رہے۔

(۲) دوسری بات یہ کہ وہ دیگر لوگوں سے جدا ہو کر کیوں بیٹھے؟ تو قرآن نے واضح کیا ہے کہ جب انہیں پوری طرح یقین ہو گیا کہ اب بن یمن ان کی سازش کے عین مطابق روک لئے گئے ہیں اور اب ان کے چھوڑے جانے کا کوئی امکان نہیں تو گویا ان کی زندگی کی ساری منصوبہ بندی پوری ہو گئی تھی۔ سالوں قبل وہ یوسف کو ٹھکانا لگا چکے تھے اور اب بحسن و خوبی بن یمن کو بھی ٹھکانا لگانے میں کامیاب ہو چکے تھے اور اب اس تعلق سے صرف ایک ہی کام باقی رہ گیا تھا یعنی حضرت

یعقوب کو باور کرانا کہ بن یمین کیونکر گرفتار ہوئے۔ لہذا اس مشورت میں انہوں نے پوری منصوبہ بندی کی کہ کس طرح پورے معاملے کو حضرت یعقوب کے سامنے رکھا جائے اور آگے اب کیا کیا جائے۔ ادھر وہ یہ چالیں چل رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ وہ اپنی ہر چال میں کامیاب ہیں اور کوئی ان کی چال کو سمجھ تک نہیں سکتا، جب کہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ یہ ان کی بھول تھی۔ ان کی چالوں سے گہری اللہ کی تدبیریں ہیں۔ اور وہ خواہ کتنے ہی خفیہ طریقے سے چالیں چلیں اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہونے دیں لیکن اللہ سب چیزوں سے باخبر ہے۔

اس طرح ابلیس کی لامتناہی کوششوں اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے گھر میں نزع ڈالنے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھوں حضرت یعقوب علیہ السلام کی کوششوں کو بار آور فرمادیا۔ لیکن یہ کامیابی ابراہیمی میثاق کے عین مطابق پوری کامیابی نہیں تھی۔ اس میں چند خامیاں تھیں:

(۱) بحیثیت مجموعی آل یعقوب کی اکثریت اس میثاق کے پورا کرنے سے دست کش ہی نہیں بلکہ مانع رہی جو عہد کی کھلم کھلا خلاف ورزی تھی۔

(۲) حضرت یعقوب علیہ السلام کی ارض بعثت میں اقامت ملک اللہ نہیں ہو سکی اور ابلیس کے نزع کے سبب حضرت یعقوب کنعان میں اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم نہیں کر سکے۔ اور ایسا بنیادی طور پر وہ اپنی بڑی اولادوں کے سبب نہیں کر سکے۔ یہ اقامت ہوئی بھی تو دور مصر میں جو، گویا حضرت یوسف کا یا تو قید خانہ تھا جہاں انہوں نے غلامی کے دن گزارے تھے یا پناہ گاہ تھی جہاں وہ بے گھر ہونے کے بعد پناہ گزین ہوئے تھے یا پھر دارالہجرت تھی جہاں وہ مہاجر کی طرح تھے۔

(۳) ہر چند کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا اور بعد میں ان میں سے بیشتر طلقاء ہونے کے بعد تائب بھی ہوئے اور مصر میں سکونت پذیر ہو گئے اس لئے کہ اللہ کا ملک کنعان میں نہیں بلکہ مصر میں قائم ہو چکا تھا اور اب ان کے لئے جائز نہیں تھا کہ ایک ایسا ملک قائم ہونے کے بعد بھی وہ کنعان میں رہیں۔ لیکن اس تعلق سے بھی تمام آل اسحاق وہاں منتقل نہیں ہوئے اور ایک بڑی تعداد کنعان اور اس کے اطراف میں علی حالہ باقی رہی۔ اس اعتبار سے میثاق کے پورا کرنے میں ان سے سخت کوتاہیاں ہوئیں۔

حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہما السلام کی کامیابی نے آل اسحاق کو بالعموم اور آل یعقوب کو بالخصوص عذاب سے تو بچالیا لیکن ان کی روش نے اس بات کا پتہ دے دیا کہ وہ بہت دیر تک اس میثاق سے بندھے رہنے والے نہیں۔

www.bookstube.net

www.urdutube.net

prepared by M. Aamir Mehmood

www.urdumovies.net

www.asraralam.net

کنعان و مصر

اپنے بڑے بیٹوں کے مابین رہتے ہوئے حضرت یعقوب علیہ السلام کا ایک جانب 'ارض موعود' کنعان میں 'اقامت ملک اللہ' کی ان تھک کوششوں کو جاری رکھنا تا کہ حضرت اسحاق اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے توسط سے کئے گئے میثاق کی تکمیل ہو اور دوسری جانب اپنی ان اولادوں کے عدم تعاون اور خلل اندازی کرنے اور اس کوشش کی راہ کھوٹی کرنے کے سبب اس سعی میں ناکام ہو جانا اور اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کا مصر چلا آنا دراصل ہجرت کے مثل تھا۔

جیسا کہ اس بات کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ دین اللہ میں 'ہجرت' محض ترک مقام کو نہیں کہتے۔ ہجرت ایک ایسا مشروط عمل ہے جس کی بنیادی شرط 'مہجور مقام' میں 'اقامت ملک اللہ' کرنا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب کنعان کے بجائے مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کو وہ صورت حال نصیب ہوئی یعنی وہاں تمکین ملا اور اس ملک میں ان کے ہاتھوں 'حکومت الہیہ' کا قیام ہوا تو انہوں نے یہ کبھی نہیں سمجھا کہ یہ وہی 'اقامت ملک اللہ' ہے جس کا ان کے آبا کو حکم دیا گیا تھا اور جس کا میثاق میں ذکر ہے۔ یہاں روئے ارض پر معرکہ 'خیر و شر' کے دقیق نکات نہایت کھل کر سامنے آ جاتے ہیں جن کا دین اللہ کے تعلق سے بہت سی غلط فہمیاں دور کر سکتا ہے۔

ان امور کی وضاحت سے قبل ضروری ہے کہ بعض مخصوص امور پیش نظر رکھ لئے جائیں:

(۱) 'اقامت ملک اللہ' کا جو کچھ ذکر کیا جا رہا ہے وہ اس معرکہ 'خیر و شر' سے متعلق

ہے جو کائناتی منصوبہ ربانی کا حصہ ہے اور اس سے بنی نوع انسان کا براہ راست تعلق ہے۔

(۲) دجال جلد اول (صفحہ ۱۱۷) میں اس عاجز نے لکھا تھا:

”ظاہر ہے یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی جو یہ نہیں جانتا کہ قرآن نے ارض کا کیا

مفہوم لیا ہے۔ اور یہ کہ دین اللہ اور اسکی حکمت عملی کو ارض سے کیا نسبت ہے اور ارض کیا ہے؟ اور

اسکے حدود اور مراتب کیا ہیں اور اس کی ترقیز اور توسیع کسے کہتے ہیں۔“

چنانچہ اس تعلق سے چند امور کی توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے:

(الف) معرکہ 'خیر و شر': روئے ارض پر معرکہ 'خیر و شر' کا صرف ایک ہی سلسلہ ہے جس کی

قیادت حضرات انبیاء کرام کرتے رہے ہیں اور وہ سب ایک ہی مقصد اور ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ رسالت، انبیاء کے سنن اور ہدئی سب اسی ایک سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ان میں کہیں تضاد ہے اور نہ باہم محاذی یا متوازی صورتحال۔ اور یہی مفہوم ہے درج ذیل آیات کا:

(۱) ان هذه امتکم امة واحدة (الانبیاء ۹۲)

ترجمہ: یہ لوگ ہیں تمہارے دین کے سب ایک دین پر۔

(۲) وان هذه امتکم امة واحدة (المومنون ۵۲)

ترجمہ: اور یہ لوگ ہیں تمہارے دین کے سب ایک دین پر۔

چنانچہ روئے ارض پر پوری انسانی تاریخ دراصل معرکہ خیر و شر کے سلسلے کا نام ہے جس کی قیادت انبیاء اور مرسلین کرتے رہے ہیں اور دین اللہ معرکہ خیر و شر میں خیر و شر کی شناخت اور اس کا وظیفہ ہے۔

(ب) ارض (اصلی): یہ روئے ارض جو مہبط آدم و حوا ہے یہی ارض (اصلی) ہے۔ اسی ارض پر بنی نوع آدم کے لئے 'مستقر' اور 'مناخ' کا ربانی نظم کیا گیا ہے۔ اسی ارض پر بنی آدم کو ایک مدت معین یعنی 'الی حین' تک رہنا ہے۔ بنی آدم کی زندگی یہاں ابتلاء و آزمائش سے بھری ہے اس دوران اس کے ساتھ ایسے کے ذریعہ برپا معرکہ خیر و شر کا معاملہ جاری رہے گا۔ یہ پوری زمین راصل وہ جگہ ہے جس پر اسے اقامت ملک اللہ کرنا ہے اور یہ وہ کام ہے جس پر اللہ نے خیر و شر کے اس مرحلے میں پورے بنی آدم پر فرض منصبی ہے۔ بنی آدم کی فی زمانہ صحیح اور واقعی وارث کے بطور 'امت مسلمہ' اس کی ذمہ دار ہے۔ اس لئے یہ اس کی واحد ذمہ داری ہے کہ مقصد وجود (raison d'être) ہے کہ وہ پوری روئے ارض پر اقامت ملک اللہ کرے۔ یہی وہ ارض ہے جس کا ہتمام و کمال ذکر سورہ توبہ آیت ۲ میں کیا گیا ہے:

واعلموا انکم غیر معجری اللہ وان اللہ مخزی الکفرین (التوبہ ۳)

ترجمہ: براءت ہے اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی مشرکوں سے متعلق جن سے ہمارا عہد ہوا تھا۔ سو پھر لو اس 'ارض' میں چار مہینے اور جان لو کہ تم نہ تھکا سکو گے اللہ کو اور یہ کہ اللہ سوا کرنے والا ہے کافروں کو۔

(ج) مرکز ارض: یہ ارض جس پر اقامت ملک اللہ کرنے کی ذمہ داری امت مسلمہ کا

مقصد وجود (raison d'etre) ہے اس کا مرکز اور پایہ تخت 'بیت اللہ' ہے جو روئے ارض پر حضرت آدم کے بسائے جانے کے وقت سے ہی پایہ تخت اور روئے ارض پر 'ملک اللہ' کی نشانی اور علامت رہا ہے۔ مکہ المکرمہ میں واقع بیت اللہ یعنی کعبۃ اللہ ہی دراصل وہ جگہ ہے جو ملک اللہ کی علامت اور مرکز ارض ہے۔

(د) ارض (حکمی): ارض (حکمی) دراصل ارض (اصلی) کی وہ کم سے کم حد یا اس کا علاقہ ہے جس پر کسی رسول کیلئے اقامت 'ملک اللہ' کرنا لازمی اور ضروری ہے۔ چنانچہ کنعان بنی اسحاق اور بنی اسرائیل کے لئے اور جزیرۃ العرب آنحضور ﷺ کے لئے 'ارض (حکمی)' کے حکم میں ہیں۔ یہی وہ بات ہے جس کا ذکر متعدد مقامات پر قرآن نے کیا ہے۔

اسی مقام پر یہ بات واضح ہو جانی چاہئے کہ ارض (حکمی) پر اقامت کے تناظر میں 'امت محمدیہ' اپنے اپنے زمانے کی تمام 'امت مسلمہ' کی طرح یکساں طور پر ذمہ دار ہے۔ لیکن 'امت محمدیہ' امت خاتم النبیین ہونے کی وجہ سے اور اپنی کارکردگی کے اعتبار سے آنحضور ﷺ کی قیادت اور ان کی حیات طیبہ میں ہی اعلیٰ ترین مقام یعنی 'امت وسط' کے مقام پر فائز کر دی گئی ہے اس لئے اب اس اعزاز کے بعد اس کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئی ہیں۔ چنانچہ امت محمدیہ اب چونکہ 'امت مسلمہ' کے ساتھ ساتھ 'امت وسط' کے منصب پر بھی فائز ہے اس لئے اس کے لئے 'ارض (حکمی)' پر اقامت 'ملک اللہ' کرنا یا اسے قائم رکھنا کافی نہیں اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے لئے ارض (اصلی) ہی ارض (حکمی) کے درجے میں ہے۔

(ه) ارض (حکمی قائم مقامی): ابھی ابھی جس ارض (حکمی) کا ذکر کیا گیا وہ دراصل دو طرح کی ارض (حکمی) پر مشتمل ہے جس کا جان لینا ضروری ہے۔ لیکن اس امر کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معاملے میں ایک خصوصی فضل کے تناظر میں ہے۔ جسے دراصل اللہ تعالیٰ کی 'مصلحت خاصہ' کا نام دیا جاسکتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے میثاق کا تعلق تو فی الواقع ارض (اصلی) اور اس کے ذیل میں ارض (حکمی) ہی سے تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی ذریت اولیٰ یعنی حضرت اسمعیل علیہ السلام کے علاوہ ذریات کے لئے بھی ایک خاص فضل فرمایا۔ یہ ایک حقیقی اور تفصیل طلب نکتہ ہے لیکن ان مباحث سے صرف نظر کرتے ہوئے اتنا ذکر کر دینا کفایت کرے گا کہ اللہ تعالیٰ کی 'مصلحت خاصہ'

کا یہ ایک باب ہے جسے اس نے حضرت اسحق علیہ السلام کی اولادوں کے لئے وافر مادیاتھا۔ چنانچہ وہ ارض جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے لئے 'دارالہجرت' قرار دیا تھا اسے اللہ تعالیٰ نے بنی اسحق کے لئے ارض (حکمی) قرار دے دیا۔ اور اس ارض پر واقع 'مقامات ابراہیم' میں سے ایک مقام کو مرکز۔

(و) ترکیز ارض: معرکہ خیروشر میں 'اقامت ملک اللہ' کا آغاز جس مقام سے ہوتا ہے وہ دراصل 'مرکز ارض' ہے۔ آنحضور ﷺ کے باب میں مکہ المکرمہ یعنی وہ آبادی جس میں 'بیت اللہ' واقع ہے 'اقامت ملک اللہ' کے لئے پہلا مقام قرار دیا گیا۔ چنانچہ آپ نے سب سے پہلے اہل آبادی پر 'اقامت ملک اللہ' کا آغاز فرمایا۔ اگر اہل مکہ آنحضور ﷺ کے ساتھ وہ سلوک نہ کرتے جو انہوں نے کیا اور ان کا ساتھ دیتے تو اس صورت میں ہجرت واقع نہ ہوتی اور نسب سے پہلے مکہ المکرمہ ہی میں 'اقامت ملک اللہ' ہوتی۔ چنانچہ پوری روئے ارض میں جب کسی مخصوص مقام کو _____ اور پورے روئے ارض کے تناظر میں ایسا مقام بیت اللہ ہی ہے _____

اقامت ملک اللہ کے لئے منتخب کیا جائے اور وہاں اقامت کی جائے تو اسے 'ترکیز ارض' کہا جاتا ہے۔ چونکہ اہل مکہ نے عداوت کا معاملہ کیا اور آنحضور ﷺ کو مجبوراً ہجرت کر کے یثرب جانا پڑا اور اہل یثرب نے 'ترکیز ارض' کے لوازم اور تقاضے پورے فرمائے لہذا 'ترکیز ارض' کا عمل مکہ المکرمہ کے بجائے یثرب میں واقع ہوا۔ جسے 'یثاق مدینہ' کہا جاتا ہے۔ وہ 'یثاق مدینہ' کوئی تحالفی معاہدہ نہیں تھا بلکہ 'ترکیز ارض' تھا اور یہ وہی 'ترکیز ارض' ہے جسے دراصل مکہ المکرمہ میں ہونا تھا۔ نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کے باب میں اہل مکہ کی بالعموم اور سرداران مکہ کی بالخصوص بدبختی تھی کہ انہوں نے آپ ﷺ کی مخالفت کی اور آپ کو ہجرت پر مجبور کیا اور خود انصار نہ بن سکے۔ ان کی یہ بدبختی ان کے سامنے بالآخر آن موجود ہوئی اور وہ 'طلاق' قرار پائے اور اہل یثرب انصار۔ مکہ المکرمہ کے تعلق سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ آنحضور ﷺ کے اصلی مشن کے تحت مکہ المکرمہ میں 'ترکیز کا عمل' پورے جزیرۃ العرب یعنی ارض (حکمی) میں 'اقامت ملک اللہ' کے ساتھ ساتھ ہوا۔ 'اقامت ملک اللہ' اور 'ترکیز ارض' کے تعلق سے اہل مکہ کی کوتاہی، ہٹ دھرمی اور عناد کا ہی نتیجہ تھا جو ان کی کم نصیبی پر منتج ہوا اور وہ انصار نہیں بلکہ 'طلاق' قرار دیئے گئے جب کہ سب سے پہلے 'نصرت' ان پر پیش کی گئی تھی۔

(ز) توسیع ارض: چونکہ ہر امت مجتبیٰ اپنے عہد میں اپنے رسول کی قیادت میں ارض (حکمی) پر اقامت ملک اللہ کرنے کی پابند ہوتی ہے اس لئے وہ ترکیز ارض پر بس نہیں کر سکتی اور توسیع ارض یعنی اس اقامت ملک اللہ کے حدود کو روئے ارض پر وسیع تر کرتی ہے۔ آنحضور ﷺ سے قبل سارے انبیاء اور ان کی امتیں اقامت ملک اللہ کوئی الواقع ارض (حکمی) تک توسیع دینے کی پابند رہی ہیں۔ یہ جداگانہ بات ہے کہ اس وقت پائی جانے والی انسانی آبادی اور ارض (حکمی) اپنے علاقے اور وسعت کے اعتبار سے اتفاقاً برابر ہوں۔ لیکن جہاں تک امت مسلمہ محمدیہ کا معاملہ ہے تو یہ امت دراصل جس توسیع ارض کی پابند اور مکلف ہے وہ روئے ارض کی کامل ترین توسیع ارض ہے یعنی پوری روئے ارض۔ آنحضور ﷺ کی بعثت میں یہ کامل ترین توسیع ارض داخل تھی۔ جس کی آپ نے اقامت فرمائی اور اس طرح 'الحکم قائم فرمایا جس کے دو شعبے تھے:

- (۱) باب الحکومة: باب الحکومتہ وہ صیغہ ہے جس کے تحت اقامت صلوٰۃ، اقامت زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظم کیا گیا اور جس کے لئے باب المقالم، باب الحدود اور باب القضاء قائم کئے گئے۔
- (۲) باب الجہاد: باب الجہاد وہ صیغہ جس کے تحت توسیع ارض کا عمل جاری رہا۔

چونکہ آنحضور ﷺ نے خود اپنی حیات طیبہ میں اپنے ہاتھوں ترکیز ارض (اصلی) اور ارض (حکمی اصلی) میں اقامت ملک اللہ کا فریضہ ادا کر دیا تھا اور آپ صرف اس کی توسیع کا عمل ہونا تھا اس لئے آپ نے فرمایا کہ اب ہجرت کے بعد کوئی ہجرت نہیں۔ (ان شاء اللہ ان تمام امور کی تفصیل اپنے اپنے مقام پر آئے گی)

چنانچہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر میں اقامت ملک اللہ فرمادی تو اس اقامت کی حیثیت دار ہجرت میں ترکیز ارض کے مصداق تھی۔ یہی سبب ہے کہ اب روئے ارض کے مومنین اور بالخصوص حضرت یعقوب علیہ السلام پر ہجرت لازم ہو گئی۔ اور اس طرح آپ اپنے تمام خاندان کے ساتھ کنعان سے مصر ہجرت کر گئے۔

لیکن اس مقام پر یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ ہجرت اس بات سے مشروط ہے کہ مجبور

مقام یعنی اصلی مقام ترکیز ارض اور ارض (حکمی) کی طرف ضروری تیاری کے بعد واپس لوٹا جائے اور وہاں اقامت کی جائے یعنی 'اقامت ملک اللہ' کی جائے۔

یہی وہ بات ہے جو حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہما السلام کے ذہن و فکر میں راسخ تھی جسے توراۃ میں مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ یہاں وہ صورتحال بھی نگاہ میں رہنی چاہئے کہ اگرچہ حضرت یعقوب، حضرت یوسف اور حضرت بن یمن اس حالت میں مصر میں یکجا ہوئے تھے کہ وہاں 'حکومت الہیہ' قائم ہو چکی تھی لیکن ان سب کے باوجود دیگر بھائیوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اگرچہ حضرت یوسف کی رحمدلی نے انہیں معاف کر دیا،... 'طلقتا' قرار پائے تھے لیکن ان کی روش ان تینوں حضرات کو بار بار یاد دلاتی تھی کہ ان سے کسی خیر کی توقع نہیں۔ ہر چند کہ وہ سب مومن ہیں لیکن ان پر شیطان کا غلبہ ہے اور اس کا زیادہ اندیشہ ہے کہ وہ 'اقامت ملک اللہ' کے مشن کو پورا کرنے کے بجائے ابلیس کے اکہ کار بن جائیں۔ یہی وہ بات ہے جس کا ذکر براشیت باب ۴۹ میں حضرت یعقوب کے نصائح کے ذیل میں آیا ہے۔

اس پوری مدت میں حضرت یعقوب علیہ السلام تمام لوگوں کو باہر لے جاتے رہے اور باور کراتے رہے کہ 'مصر' محض 'دارالہجرت' ہے اور 'دارالہجرت' رہنے کی جگہ نہیں بلکہ ارض حکمی میں اقامت ملک اللہ کرنے کی ضروری تیاری کرنے کی جگہ ہے۔ لہذا جب اسی دوران انہیں محسوس ہوا کہ ان کی موت کا وقت قریب آ رہا ہے تو آپ نے وصیت کی اور انہیں یاد دلایا کہ وہ مصر میں صرف اس لئے رہ رہے ہیں کہ کنعان میں جو ارض (حکمی) ہے 'اقامت ملک اللہ' کی ضروری تیاری کریں۔ یہی وہ بات ہے جس کا ذکر قرآن نے البقرہ ۱۳۳ میں کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ آپ نے یہ بات بھی کہی کہ اگر اس دوران ان کی موت ہو جائے تو انہیں مصر کے بجائے کنعان میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ براشیت ۴۹ سطر میں ۲۹ ہے:

”مجھے میرے انہوں کے ساتھ جمع کر دیا جائے۔ میری تدفین میرے آبا کے ساتھ حتیوں کے میدان عفرون کے غار میں ہو۔ اس غار میں جو مصلح میں ہے مرء کے محاذی، کنعان میں۔“

اور پھر یہی نصیحت حضرت یوسف علیہ السلام نے کی۔ آپ نے فرمایا:

”اور یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا: میں مر رہا ہوں۔ لیکن خدا ضرور تمہاری طرف

متوجہ ہوگا۔ اور تم لوگوں کو اس ملک سے نکال کر اس سرزمین پر آباد کرے گا جس کا اس نے ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب سے وعدہ کیا ہے:

اس کے بعد یوسف نے تمام آل اسرائیل سے میثاق لیا اور کہا: خدا ضرور تمہاری طرف متوجہ ہوگا اور (تب) تم میری بڑیاں یہاں سے لے جانا۔“
(برائشیت ۵۰ سطر ۲۵، ۲۶)

بنی اسرائیل حسب اندیشہ سب کچھ بھلا بیٹھے۔ وہ دارالہجرت میں رہ کر ارض (حکمی) میں اقامت ملک اللہ کی ضروری تیاری کرنے کے بجائے متوطن ہو کر وہاں کی آسائشوں سے لطف اندوز ہونے لگے اور اپنے اصلی مقصد حیات کو بھلا بیٹھے۔ انہوں نے بھلا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کیوں منتخب کیا ہے؟ وہ کیوں مصر میں صاحب تمکین بنائے گئے ہیں؟ دنیا کے دیگر لوگوں کی طرح انہوں نے بھی زندگی کی آسائشوں سے لطف اندوز ہونے کو وظیفہ حیات بنا لیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا اور مصر کی سرزمین جو کل تک ان کے لئے دارالہجرت اور پناہ گاہ تھی ان پر تنگ ہو گئی۔ اور اس طرح اقامت ملک اللہ کے میثاق سے پھر جانے اور بد عہدی کے صلے میں مصر کی سرزمین ان کے لئے اذیت گاہ بنا دی گئی۔

حواشی و جال جلد دوم

- ۱۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: دجال جلد اول: حقیقت سوم: معرکہ خیر و شر: صفحات ۳۹-۲۳۳
- ۲۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: دجال جلد اول: مرحلہ اول: آدم قدیم: صفحہ: ۲۶۱
- ۳۔ ملاحظہ فرمائیں: (الف) سورہ کہف آیات ۷، ۲۷، ۲۶ (ب) سورہ صافات آیت ۶ اور (ج) سورہ حدید آیات ۲۰
- ۴۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: دجال جلد اول: مرحلہ دوم: آدم و حوا صفحات ۷۹-۲۶۲
- ۵۔ ملاحظہ فرمائیں: سورہ بقرہ آیت ۱۰
- ۶۔ ملاحظہ فرمائیں: سورہ البقرہ آیات ”اسکن انت و زوجک الجنة و کلا منها رغداً حیث شئتما“ (آیت ۳۵)
- ۷۔ ملاحظہ فرمائیں: سورہ البقرہ آیت ”ولا تقربا هذه الشجرة“ (آیت ۳۵)
- ۸۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: ما کان وما یكون: (الف) کامیابی ابلیس صفحات ۲۱-۲۰ اور (ب) مرحلہ الجنة صفحات ۹-۱۰۸
- ۹۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: ما کان وما یكون: مرحلہ الارض صفحات ۱۰-۱۰۹
- ۱۰۔ ملاحظہ فرمائیں: حدیث کے الفاظ ہیں: ”ولا یزال فی الجنة فضل حتی ینشی اللہ لہا خلقاً فیسکنہم فضل الجنة“ (متفق علیہ) ترجمہ: جنت میں ہمیشہ وسعت رہے گی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک مخلوق پیدا کر کے اسے جنت کے زائید حصے میں ٹہرائے گا۔ (بحوالہ مشکوٰۃ)

باب خلق الجنة والنار

- ۱۱۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: دجال جلد اول: صفحات ۹-۲۷۸
- ۱۲۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: دجال جلد اول: صفحات ۸۷-۲۸۱
- ۱۳۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: دجال جلد اول: صفحات ۳۲۵-۲۹۳ اور ۳۳۰-۳۲۶
- ۱۴۔ ملاحظہ فرمائیں: القرآن: سورۃ مریم آیت ۵۶
- ۱۵۔ ملاحظہ فرمائیں: (الف) شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی: تفسیر عزیزی
(ب) الزمخشری: تفسیر کشاف
- ۱۶۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: دجال جلد اول: صفحات ۸۹-۳۳۵
- ۱۷۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: دجال جلد اول: صفحات ۱۶-۳۰۸
- ۱۸۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: دجال جلد اول: صفحات ۸۹-۱۸۳
- ۱۹۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: دجال جلد اول: صفحات ۸۹-۱۸۳
- ۲۰۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: دجال جلد اول: صفحات ۷۹-۲۶۲
- ۲۱۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: دجال جلد اول: صفحات ۷۳-۳۶۳
- ۲۲۔ ملاحظہ فرمائیں: (الف) ۱۔ سورۃ الاعراف آیت ۲۰۰ ۲۔ یوسف ۱۰۰
- ۳۔ الاسراء ۵۳ (ب) حدیث: فان جاء آخر ینازعه فاضر بوار فیہ
الاخر (رواہ ابوداؤد و کتاب الفتن)